وحیِ محمدیؐ

از

السیّد الامام علامہ سیّد محمد رشید رضا منشئ "المنار" (مصر)

ناشر:- قاضی سیّد محمد عبد الغفور نقوی القبائی

وحی محمدیؐ

قرآن کی حقانیت اور متمدن قوموں کو اسلام کی دعوت

تصنیف

السید الامام حضرۃ علامہ سید محمد رشید رضا منشئ "المنار" مصر

ترجمہ

عبد الرزاق ملیح آبادی

ناشر

قاضی سید محمد عبد الغفور نقوی القبانی

قیمت دو روپیہ

فہرست مطالب

کتاب ہذا کے ملنے کا پتہ

نمبر ۱۱ بڑو بازار اسٹریٹ

کلکتہ

"وحی محمدی" پر شاہ عبدالعزیز ابن سعود کا تبصرہ

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ عبدالعزیز بن عبدالرحمان الفیصل کا خط۔ حضرت شیخ مکرم سید محمد رشید رضا حفظہ اللہ کے نام۔

"السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ ہم نے آپ کی کتاب "وحی محمدی" پڑھی اور نہایت خوش ہوئے کہ آپ نے ایسی کتاب لکھنے کی محنت اٹھائی، اور اللہ کی طرف حکمت و موعظۂ حسنہ کے ساتھ دعوت کا فرض پوری طرح ادا کر دیا، خصوصاً ایسے زمانہ میں جب کہ دلوں پر شیطان کے قبضہ سے شبہات کثرت سے پھیل گیے ہیں، لوگ اللہ کی راہ سے پھر گیے ہیں۔ خود بھی گمراہ ہوئے ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کر رہے ہیں۔

"آپ کی یہ کتاب بندوں پر اللہ کی قائم حجت کے اظہار میں سب سے زیادہ موثر چیز ہے۔ دین کی طرف زبردست دعوت ہے، منکروں اور ملحدوں کا کھلا ہوا ابطال ہے۔

"اللہ آپ کو اسلام اور مسلمانوں کی طرف سے جزاء خیر دے، اور اسلام کی دعوت کے پھیلانے اور سلف صالح کے عقائد کی اشاعت کرنے میں آپ کی پوری پوری مدد فرمائے۔ ہمیں اور آپ کو اپنے دین کی نصرت اور اس کا بول بالا کرنے کی توفیق عطا فرمائے، والسلام"

۴۔ ذیقعدہ سنہ ۱۳۵۲ھ

"وحی محمدی" پر امام یحییٰ حمید الدین شاہ یمن کا تبصرہ

"امیر المومنین، المتوکل علی اللہ رب العالمین، امام یحییٰ حمید الدین کا خط سید علامہ محمد رشید رضا ایڈیٹر "المنار" حفظہ اللہ کے نام۔

"آنکھیں اُس تحفہ سے شاد کام ہو گئیں جس کی آرزو مند تھیں۔ امیدیں اُس نعمت سے مالامال ہو گئیں جن کے لیے بے قرار تھیں، جب اُنہوں نے علم کے اس گلستان کی سیر کی، اور تحقیق کے اُن شیریں چشموں سے سیراب ہوئیں جو آپ نے اپنی بیش بہا کتاب "وحی محمدی" میں جمع کر دیے ہیں! حق یہ ہے کہ کتاب "وحی محمدی" اپنے موضوع کے لحاظ سے، استدلال و مبحث کے لحاظ سے بالکل بے نظیر کتاب ہے۔ دلوں سے گمراہی و تاریکی دور کر دیتی ہے، اور اُنہیں ٹھنڈک بخشتی ہے۔ اِس کے حقائق سے نور کی بارش اور ہدایت کی کرنیں پھوٹتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اِس دینی خدمت کا بہترین ثواب عطا فرمائے، جو ہماری دانست میں عمل صالح ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اپنے ملک میں بھی اِس بے نظیر کتاب سے فائدہ اٹھائیں، لہٰذا آپ اِس کے فی الحال ایک سو نسخے فوراً ہمارے نام بھیج دیں۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!"

۲۱۔ جمادی الاخرہ ۱۳۵۳ھ

دیباچہ

(از مترجم)

کتاب کے مصنف، علامہ سید رشید رضا، میرے استاد ہیں۔
اگر اُن کی تعریف کروں تو کہا جائے گا، شاگرد نے استاد کی تعریف کی ہے۔
لیکن حق یہ ہے کہ علامہ ممدوح اِس زمانہ کے امام اور حجۃ اسلام ہیں
موجودہ عہد کے بکثرت علماء اسلام سے میرا تعارف ہے، لیکن اس مرتبہ کا
کوئی شخص میری نظر سے نہیں گزرا۔ جامع منقول و معقول ہیں، اور ضروریات
زمانہ سے کماحقہ واقف۔

موصوف، دراصل چودھویں صدی کے مُجدّد ہیں۔ لگاتار چالیس
برس سے اسلام اور مسلمانوں کی بہترین خدمات انجام دے رہے ہیں۔
دنیائے اسلام میں کوئی اہل علم نہیں جو اِن کے مقام و مرتبہ سے واقف نہ ہو۔
"وحی محمدی" کتاب نہیں معجزہ ہے۔ آج تک کسی زبان میں کوئی
ایسی کتاب لکھی نہیں گئی۔ یہ کتاب، اسلام کی حقانیت پر حجت کبریٰ ہے۔
ایسی حجت کہ اُس کا انکار ممکن نہیں۔
میں نے استاد محترم کے حکم سے اِسے اردو میں منتقل کر دیا ہے۔

تبرکاً نام وہی رکھا ہے جو اصل کتاب کا ہے۔ ترجمہ میں پوری کوشش کی ہے کہ لفظی ہو، اسی لیے سخت محنت کرنا پڑی ہے۔ جن لوگوں کو ایماندارانہ ترجمہ کا تجربہ ہے، وہی میری محنت کا اندازہ کر سکتے ہیں، خصوصاً جبکہ ترجمہ کسی بلند انشاپردازی کا ہو۔

میں نے لفظی ترجمہ کا اس قدر التزام کیا ہے کہ کہیں کہیں اردو زبان کی فصاحت بھی قربان کر دی ہے، اور صرف اس لیے کہ قارئین تک صرف خیالات ہی نہیں بلکہ مصنف کی اسپرٹ بھی پہونچ جائے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ میری حقیر خدمت کو قبول فرمائے اور اسے اسلام اور مسلمانوں کے لیے مفید بنا دے۔ اس کے سوا نہ کسی تعریف کی طلب ہے نہ صلہ کی۔

ملیح آبادی

(نوٹ) جناب قاضی عبدالغفور صاحب نقوی اس کتاب کو شائع کر رہے ہیں۔ انہوں نے مجھ سے اس ترجمہ کے جملہ حقوق حاصل کر لیے ہیں اور اب یہ ترجمہ ہمیشہ کے لیے انہی کی ملکیت ہے۔

ملیح آبادی

وحی محمدیؐ کی پیش کش
دنیا بھر کی اسلامی انجمنوں کے نام

(الف) بیت المقدس میں عام مؤتمر اسلامی
(ب) جنیوا میں یورپین مسلمانوں کی موتمر اسلامی
(ج) لاہور کی سیرت کمیٹی
(د) مصر کی جماعت دفاع اسلام
(ہ) تمام ممالک میں اسلامی انجمنیں

حضرات خادمان اسلام،

میں نے اب تک کوئی ایسی کتاب نہیں دیکھی جو موجودہ تہذیب کی مالک قوموں کو اسلام کی طرف دعوت دینے کی صلاحیت رکھتی ہو، جس میں عقلی اور تاریخی دلائل سے ثابت کر دیا گیا ہو کہ قرآن، اللہ تعالیٰ ہی کی وحی ہے نہ کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی استعداد طبعی سے پھوٹنے والی وحی، جیسا کہ اس کے اعجاز سے مجبور ہو کر بعض تاویل کرنے والوں نے کہہ دیا ہے۔ اور جس میں قرآن کے دینی، اجتماعی، سیاسی، مالی، جنگی، امنی اصول و قواعد بیان کر دیے گیے ہوں، وہ اصول و قواعد جن کی پیروی ہی پر انسان کی سود بہبود موقوف

ہے۔ جن میں تمام مادی مفاسد کا علاج موجود ہے، اور جن سے الحاد و اباحیت
کی بے قیدی اور عالمگیر جنگ کا خطرہ دور ہو سکتا ہے۔ لہذا میں نے
مناسب سمجھا کہ اِس کتاب میں یہ سب کچھ آجائے اور وہ دوسرے مذاہب
کے مبلغوں اور اسلام پر نکتہ چینی کرنے والوں کی زبانیں تراش لینے میں تیز
چھُری کا کام دے۔ مجھے آپ کی مبارک جماعت سے جو اسلام کی مدافعت اور اُس
کی ہدایت کے احیاء کے لیے وجود میں آئی ہے، پوری امید ہے کہ مسلمانوں میں
اِس کتاب کی اشاعت اور دوسری قوموں کی زبانوں میں اِس کے ترجمہ کے
کام میں میری مدد کریگی۔ براہ مہربانی اِس بارے میں اپنی رائے سے مجھے
مطلع کیجئے۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

آپ کا بھائی

محمد رشید رضا

منشی المنار (مصر)

مقدمہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ
قَآئِمًا بِالْقِسْطِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ اِنَّ الدِّيْنَ
عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ، وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ
اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ، وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ
اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝ فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ
وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ، وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُ
مِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ؟ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا، وَاِنْ تَوَلَّوْا
فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ (آل عمران ۳: ۱۸-۲۰)

اللہ گواہ ہے اور فرشتے، اور اہل علم کہ اُس ذات حق کے سوا کوئی
بندگی کا سزاوار نہیں)، اور یہ کہ وہی قائم ہے انصاف کے ساتھ، اُس
زبردست اور حکمت والے معبود کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اللہ کے
ہاں اسلام کے سوا کوئی دین نہیں۔ اہل کتاب میں اختلاف اُسی وقت
پڑا جب سے اُن میں علم باہمی سرکشی بن کر آیا، اللہ کی نشانیوں سے

جو انکار کرتا ہے تو اللہ اُس سے جلد حساب لینے والا ہے۔ اے پیغمبر، اگر یہ لوگ آپ سے حجت و تکرار کریں تو کہہ دیجیئے کہ میں اور میری پیروی کرنیوالے تو اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر چکے ہیں۔ اہل کتاب اور اَن پڑھ دونوں سے کہہ دیجیے کیا تم بھی اپنے آپ کو سپرد کر دینے پر آمادہ ہو؟ اگر وہ بھی اپنے آپ کو خدا کے سپرد کر دیں، تو بے شک ہدایت پر استوار ہو جائیں، اور اگر روگردانی کریں تو آپ کا کام تو بس پیغام پہنچانا ہی ہے، اور اللہ بندوں کی حالت ہمیشہ نگاہ میں رکھتا ہے؛

انسان کی مادّی ترقی، اخلاقی تنزل، دین کی ضرورت

یقین سے معلوم اور حواس سے ثابت ہے کہ مادّی علوم کونیہ نے اس زمانہ میں حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ ان علوم نے نیچر کو انسان کے قبضہ میں کر کے دنیا کی صورت حال ایسی کر دی ہے گویا پورا جہان، ایک ہی شہر بن گیا ہے، اور گویا مختلف ممالک اس شہر کے مکان ہیں، اور گویا قومیں ایک ہی امت کے کنبے ہیں جو ان مکانوں (ملکوں) میں رہتے اور آپس میں تعاون، اخوت، مسرت، محبت کی زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ اگر دین کی ہدایت پر استوار ہو جائیں۔

نیز یہ بھی یقین سے معلوم ہے کہ مادّی علوم میں جتنی ترقی ہوتی جاتی

ہے اور اِس ترقی کے ثمروں سے تمتّع جتنا زیادہ بڑھتا جاتا ہے، اُتنی قدر اخلاق و فضائل میں انسان، رجعت قہقری بھی کرتا چلا جاتا ہے۔ بداخلاقیوں کی گرم بازاری ہوتی جاتی ہے جرائم پر جرأت بڑھتی چلی جاتی ہے، بہیمی خواہشوں میں غلو زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ زوجیت کے عہد و پیمان ٹوٹتے جاتے ہیں۔ رشتہ داریاں کٹتی چلی جاتی ہیں۔ دین کی ہدایت سے منھ مڑتے جاتے ہیں، یہاں تک کہ قریب ہے انسان، اُن تمام پابندیوں کو توڑ ڈالے جو دین و عقل، اخلاق اور رسم و رواج نے خواہشوں پر عائد کر رکھی ہیں اور اُن پر بے قید اباحت کو ترجیح دینے لگے۔ بلکہ یورپ کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ ممالک میں بعض لوگوں نے تو برہنگی اختیار کر لی ہے اور ویسی زندگی بسر کرنے لگے ہیں جیسی افریقا کے جنگلوں اور تہذیب سے دور جزیروں میں باقی ماندہ وحشی انسان بسر کرتے ہیں۔

نیز یہ بھی یقین سے معلوم ہے کہ مہذب قوموں کی بڑی بڑی سلطنتیں انسان اور انسانیت کے حق میں اُس سے کہیں زیادہ سنگین جرائم کی مرتکب ہو رہی ہیں جو عام انسان خود اپنے حق میں کر رہے ہیں، اور یہ اس طرح کہ یہ سلطنتیں، انسانوں میں پھوٹ ڈالتی ہیں اور علوم و فنون کے تمام نفع کو ایسی عالمگیر جنگ کی طیاریوں میں استعمال کر رہی ہیں جو قرنہا قرن کے بنائے ہوئے سر بفلک قصورِ تمدن و تہذیب کو مہینوں بلکہ گنتی کے چند دنوں میں برباد

کرکے رکھ دے گی۔ صرف لڑنے والوں ہی کو نہیں بلکہ کروڑوں عورتوں اور بچوں کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیگی۔ اسی قدر نہیں بلکہ یہ سلطنتیں قوموں کی دولت و ثروت کو اپنی تخریبی اغراض میں اور کمزور قوموں پر ظلم کرنے کی راہ میں بے دریغ خرچ کر رہی ہیں، وہ کمزور قومیں جو ان سلطنتوں کی غلامی میں گرفتار ہو گئی ہیں۔ یہ سلطنتیں پوری بے باکی سے اِن کمزور قوموں کی دولتیں اور دینی و دنیاوی آزادیاں سلب کر رہی ہیں۔ تمام انسانیت اِن سرکش اور خبیث النفس سلطنتوں کی پالیسی کے باعث سخت بدبختی میں مبتلا ہے۔ اِس خوفناک پالیسی اور جنگ کا خطرہ دور کرنے کے لیے اب تک جتنی کانفرنسیں منعقد ہوئی ہیں، انہوں نے اس آگ کو اور بھی زیادہ تیز کر دیا ہے حالانکہ اگر ان سلطنتوں کی نیت نیک ہوتی اور اپنی اور دوسری قوموں کی لوٹی ہوئی بے شمار دولت کو عام انسانی اصلاح میں صرف کرتیں تو ضرور آج انسان، خوشحالی و آرام کے بلند ترین درجہ پر پہنچ جاتے۔

یہ تمام باتیں یقین سے معلوم ہیں۔ یہ واقعات ہیں اور ان کی تردید ممکن نہیں۔ پھر اس مادی تہذیب کی تاریخ کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ یہ تمام شر و مفاسد اس تہذیب کے لوازمات ہیں، اور اس کے بڑھاؤ کے ساتھ بڑھتے رہے ہیں۔ یہ اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ محض انسانی علوم و فنون، آخرت کی زندگی سے قطع نظر، دنیا کی زندگی میں بھی انسان کو

خوش نصیب بنانے کے لیے کافی نہیں ہیں۔ اور یہ کہ دنیا و آخرت کی شادمانیاں صرف دین کی ہدایت ہی سے حاصل کی جا سکتی ہیں۔ بنا بریں کہنا چاہیے کہ انسان فطری طور پر متمدن اور فطری طور پر متدین واقع ہوا ہے یا اسلام کی بول چال کے بموجب انسان کی فطرت میں دینداری داخل ہے۔

اسی سبب سے یورپ وغیرہ کے بعض دانشمندوں نے سوچا ہے کہ دین کی ہدایت ہی میں پناہ حاصل کریں، کیونکہ انہیں یقین ہو گیا ہے کہ دین ہی اس مادّی تہذیب کی بیماریوں کا علاج اور اُس کے زہر کا تریاق ہے — یہ لوگ آرزو کر رہے ہیں کہ مغرب یا مشرق میں کوئی نیا پیغمبر ظاہر ہو اور اپنے ساتھ ایسا دین لائے جو اس تمام فساد کو دور کر دے۔ اِن لوگوں کے خیال میں موجودہ ادیان و مذاہب اِس زمانہ کے لیے مفید نہیں رہے، کیونکہ اِن سب کے پیرو بگڑ چکے ہیں۔ اِس نئے دین کا نام انہوں نے "دینِ محبت" رکھا ہے اور یہ تصدیق ہے اِس آیت کریمہ کی "فَاَغْرَیْنَا بَیْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَةِ" (ہم نے اُن کے آپس میں قیامت تک کے لیے بغض و عداوت پیدا کر رکھی ہے)

حقیقت اسلام اور اہل فرنگ

لیکن یہ لوگ دینِ قرآن کی حقیقت سے ناواقف ہیں، حالانکہ یہی عالمگیر دین الٰہی ہے۔

دین اسلام کی حقیقت سے وہ اِس لیے دور ہو گئے ہیں کہ اُن کی آنکھوں پر تین پردے پڑ گئے ہیں اور اِن پردوں کی مختصر تفصیل درج ذیل ہے:

پہلا پردہ کلیسا ہے، جس نے اسلام کی دعوت سننے کے بعد ہی سے اُس کی عداوت پر کمر باندھ لی۔ کلیسا نے اسلام کی نہایت ہی بھیانک تصویریں کھینچ کر پیش کی ہیں۔ اِس مقصد کے لیے نہایت وسیع پروپیگنڈا کیا ہے جس کی بنیاد ایسے گھنونے جھوٹ، افترا، بہتان پر ہے کہ اُس کی نظیر کسی اور دین کے پیرووں میں کبھی نہیں دیکھی گئی۔ اِس غرض کے لیے کتابیں تصنیف کی گئیں۔ رسائل لکھے گئے۔ نظمیں طیار کی گئیں۔ گانے بنائے گئے، اور اِن میں ایسی ایسی بیہودہ باتیں لکھی گئیں کہ ہر باخبر مؤرخ اُن کے جھوٹ سے واقف ہے۔ اِسی قدر نہیں بلکہ کلیسا نے اسلام کو بدنام کرنا اور اُس سے دشمنی کرنا اُن تمام تعلیم گاہوں کی تعلیم و تربیت کا ایک بنیادی اصول قرار دیدیا جو پادریوں کے زیر انتظام ہیں۔ چنانچہ اِن مدارس میں ہر تعلیم حاصل کرنے والے کا یقین یہی ہے کہ تمام مسلمان، المسیح کے اور جملہ عیسائیوں کے دشمن ہیں، لہٰذا اُن سے

زیادہ سے زیادہ عداوت رکھنی ضروری ہے، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اسلام، مسیحیت کا دوست اور اُس کی ہدایت کو مکمل کرنے والا ہے، اور یہ کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی وہ فارقلیط یعنی روحِ حق ہیں جس کی مسیح علیہ السلام نے بشارت دی تھی۔

دوسرا پردہ یورپین مدبر ہیں، جنہوں نے اسلام کی عداوت کلیسا سے ورثہ میں پائی ہے اور اسلام پر کلیسا کے الزاموں کو آنکھ بند کر کے قبول کر لیا ہے۔ اِن مدبّروں کو اسلام سے اِس سبب سے اور زیادہ دشمنی ہوگئی اور وہ اُس کی بیخ کنی پر تُل گئے کہ مسلم قوموں کو غلام بنانا اور اسلامی ملکوں کو لوٹنا چاہتے ہیں۔

اگر خود مسیحی دین کے پیشواؤں کا یہ حال ہے کہ اسلام کے خلاف کذب وافترا سے دنیا کو لبریز کر چکے ہیں ـــــ حالانکہ ہر دین کی بنیاد سچائی، حق محبت، رحم، انصاف، ایثار پر ہوتی ہے ـــــ تو سیاسی لوگوں سے کون چیز بعید سمجھی جاسکتی ہے، جبکہ سیاست کی بنیاد ہی جھوٹ پر ہے اور ظلم زیادتی، سنگ دلی، خود غرضی، دھوکہ، اُس کے سب سے بڑے ستون ہیں یہی وہ چیزیں ہیں جنہیں ہم یورپین مقبوضات میں اپنی آنکھوں سے روز دیکھتے اور کانوں سے سنتے ہیں۔ بلکہ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ اسلام پر پادریوں نے جس قدر بہتان باندھے ہیں، وہ بھی سیاست ہی نے پیدا کیے ہیں نہ کہ دین نے۔

اِن لوگوں کا مشہور اصول ہے "مقصد، وسیلہ کو جائز کر دیتا ہے" اور یہ اصول سیاسی ہے نہ کہ انجیلی، کیونکہ کسی دین کی بھی یہ شان نہیں ہو سکتی کہ اپنے پیروؤں کے فائدے کے لیے جرم اور بد اخلاقی کی اجازت دے۔

تیسرا پردہ اِس آخری زمانہ میں مسلمانوں کی زبوں حالی ہے۔ مسلمان حکومتیں اور قومیں بگڑ گئیں۔ دین کی حقیقت کے ساتھ دنیاوی مصلحتوں سے بھی جہل عام ہو گیا، یہاں تک کہ مسلمان اپنے دشمنوں کے لیے حجت بن گئے جو اِن کی حالت پیش کر کے کہتے ہیں کہ اسلام کی نہ دنیا ہی بھلی ہے نہ دین ہی بھلا ہے۔ اِسی واہی حجت کے ذریعہ دشمنوں نے اُن تمام لوگوں کو اپنا ہم خیال بنا لیا ہے جو اُن کے سیاسی اور تبلیغی مدرسوں میں تعلیم حاصل کر چکے ہیں، بلکہ خود بہت سے نوجوان مسلمانوں کو بھی یہی یقین دلا دیا ہے۔ اِسی نسل میں سے وہ لوگ منتخب کیے جاتے ہیں جو یورپین حکومتوں کے عمّال بنتے اور اُن کی درس گاہوں میں تعلیم دیتے ہیں۔ یہ درس گاہیں یورپین مقبوضات کے علاوہ اُن ملکوں میں بھی موجود ہیں جہاں دول یورپ کا سیاسی اثر ہے۔ چنانچہ اِنہی لوگوں کے ہاتھوں ہر اسلامی چیز کو، عام اس سے عقیدہ ہو یا اخلاق یا قانون، تباہ کرنے کا کام یہ سلطنتیں، ٹرکی اور ایران میں بھی لے چکی ہیں۔

اسلام کے حکیم اور مشرق کے بیدار کرنے والے سید جمال الدین افغانی

کا خیال تھا کہ یہ آخری پردہ سب سے زیادہ بھاری پردہ ہے جو اسلام کو یورپین قوموں سے چھُپائے ہوئے ہے۔ موصوف کا یہ قول مجھ سے ایک معتبر راوی نے نقل کیا ہے کہ "اگر ہم یورپ کو اپنے دین کی طرف دعوت دینا چاہتے ہیں تو ہمارا پہلا کام یہ ہونا چاہیے کہ یورپ کو یقین دلا دیں کہ خود ہم مسلمان نہیں ہیں۔ یورپ والے، قرآن کے اندر سے ہمیں یوں دیکھتے ہیں ——— یہ کہکر آپ نے اپنی ہتھیلیاں منھ کے سامنے کیں اور انگلیوں کے شگافوں سے دیکھکر فرمایا ——— وہ اِس طرح قرآن کے اندر سے ہمیں دیکھتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ قرآن کے پیچھے ایسی قومیں موجود ہیں جن میں جہل، نااتفاقی، سُستی پھیلی ہوئی ہے.... اور کہتے ہیں کہ اگر واقعی یہ کتاب، اصلاح کی کتاب ہوتی تو اُس کے ماننے والے اِس قدر ابتر اور پراگندہ ہرگز نہ ہوتے!"

ہم مانتے ہیں کہ بعض آزاد خیال یورپین لوگوں نے اسلامی تاریخ سے اتنی واقفیت بہم پہنچائی ہے جو اکثر مسلمانوں کو نصیب نہیں ہے اور انہوں نے جو تاریخیں یا علمی دینی کتابیں لکھی ہیں اُن میں اسلام سے انصاف بھی کیا ہے۔ اور یہ کہ اُن میں ایسے لوگ بھی ہیں جنہوں نے بصیرت و روشنی کے ساتھ ہدایت حاصل کی ہے۔ لیکن اِن تمام لوگوں نے جو کچھ لکھا ہے، اُس سے بھی پوری حقیقت ظاہر نہیں ہوئی ہے، اور اُن کی

قوم کے تھوڑے ہی افراد نے اُن کی تصانیف دیکھی ہیں۔ اِن کتابوں کا اُن کے دیکھنے والوں پر زیادہ سے زیادہ یہ اثر ہوا ہے کہ انہوں نے سمجھ لیا بعض لوگوں نے اسلامی تاریخ لکھنے میں غلطی کی ہے جن پر اِن کتابوں میں نکتہ چینی کر دی گئی ہے۔ اصلی غرض اِن کتابوں سے پوری نہیں ہوئی۔ اِن سے وہ تینوں پردے اٹھ نہیں سکے جو حقیقتِ اسلام کو یورپ سے چھپائے ہوئے ہیں۔

رہ گیا یہ سوال کہ یورپ والوں نے کما حقہ قرآن کیوں نہیں سمجھا؟ ایسا سمجھنا کہ اُس کے اعجاز کی اور اُس کے قانون کی حقیقت سے واقف ہو جاتے اور جان لیتے کہ یہی اللہ کا آخری کامل دین ہے جس کے بعد نہ کسی دوسری کتاب کی انسان کو ضرورت باقی رہتی ہے نہ کسی نئے نبی کی — تو اس کے بھی متعدد اسباب ہیں۔

قرآن نہ سمجھنے کے اسباب

ا۔ عربی زبان کی بلاغت سے جہل، قرآن کی اُس بلاغت سے جہل جس کا پیرایہ، ترتیب، مومنوں اور کافروں پر جس کی تاثیر حدِ اعجاز تک پہنچ گئی ہے۔ قرآن نے اپنی اسی معجزانہ بلاغت سے عرب میں ذہنی و فکری انقلاب طاری کر دیا تھا اور تمام انسانوں میں عام تبدیلی پیدا کر دی تھی، جیسا کہ اپنی اِس کتاب میں ہم نے بہ تفصیل بیان کیا ہے۔ قرآن کی یہ بلاغت اِتنی بلند ہے کہ علماء اسلام نے قرآن کے معجزوں میں سے اِسی معجزے کو لیکر تمام انسانوں کو چیلنج دیدیا ہے، اور چونکہ عرب اِس بلاغت کے مقابل سے عاجز آگیے تھے، نیز وہ لوگ بھی جو عرب نہ تھے، لیکن عربی زبان کے عملی مِلکہ اور اُس کی نحو و بیان کے بخوبی ماہر تھے۔ جب یہ سب لوگ قرآن کے سامنے بے بس ہو گیے تو علماء نے اِس چیز کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے بڑی حجّت قرار دیا۔

لیکن اب جبکہ بہت سی صدیوں سے چند متفرق افراد کے سوا خود عرب بھی اپنی زبان کے ملکہ سے محروم ہو گیے ہیں، تو غیر عرب کس شمار میں ہیں؟ اِس زمانہ میں بھی مسلمانوں کے علماء قرآن کے اعجاز سے حجت لاتے ہیں مگر یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ خود بھی اِس اعجاز کے راز سے واقف یا اُس

کے لطف سے آشنا ہیں۔ بلکہ اسی وجہ سے بعض قدیم علماء نے کہہ دیا ہے کہ
قرآن کا معجز ہونا کسی معقول سبب سے نہیں ہے، بلکہ اس کا سبب یہ ہے کہ
خدا نے اپنی قدرت سے لوگوں کو اُس کے مقابلہ سے روک دیا ہے ۔
حالانکہ صحیح یہ ہے کہ مخالفوں نے اُس کا مقابلہ کرنا چاہا، مگر ناکام رہے۔
وہ سمجھے کہ قرآن کا سارا اعجاز بس آیات کے آخری ٹکروں میں ہے جو مسجّع
معلوم ہوتے ہیں۔ چنانچہ اُنھوں نے اسی چیز کی تقلید کی اور بری طرح رسوا
ہوئے۔ اِن میں سے بعض متاخرین نے نبوت کا بھی دعویٰ کیا مثلاً ہندوستان
کا قادیانی دجّالِ مسیح۔ اور بعضوں نے الوہیت کا دعویٰ کیا مثلاً "بہاء"
جس کے پیروؤں نے اُس کی کتاب "الاقدس" چھپا دی ہے تاکہ رسوا نہ ہو جائیں

۲۔ قرآن کے جن ترجموں پر علماء فرنگ کے فہم قرآنی کا دارومدار
ہے، وہ تمام کے تمام اُن معانی کے ادا کرنے سے قاصر ہیں جو قرآن کی اعلیٰ
عبارت اور اُس کے معجز اسلوب سے ظاہر ہوتے ہیں۔ یہ ترجمے وہی معانی
پیش کرتے ہیں جو مترجموں کی سمجھ میں آتے ہیں، اور مترجموں کی سمجھ
بہت ہی کم درست اور کامل ہوتی ہے، خصوصاً ایسے مترجموں کی جو اُس پر ایمان
نہیں رکھتے۔ ہر مترجم دو کوتاہیوں کا ضرور شکار ہوتا ہے: اپنی سمجھ کی
کوتاہی کا اور اپنی زبان کی کوتاہی کا۔ اِس بات کا اعتراف مجھ سے مسٹر
(محمد) مارماڈیوک پکھتال نے کیا جو قرآن کا انگریزی میں ترجمہ کر چکے ہیں

اور تین سال ہوئے کہ مصر آئے تھے تاکہ انگریزی داں عرب علماء سے اُن آیتوں کے بارے میں مشورہ کریں جن کے ترجمے سے وہ اپنے آپ کو بے بس سمجھتے تھے۔ چنانچہ ان علماء کی مدد سے انہوں نے اپنے ترجمہ کی تصحیح کرلی۔

اسی چیز کا اقرار فرانسیسی مستشرق، ڈاکٹر مار دریس نے بھی کیا ہے جنہیں فرانس کی وزارت خارجیہ اور وزارت تعلیم نے اُن باسٹھ لمبی سورتوں کے ترجمہ پر مامور کیا تھا جن میں مطالب کی تکرار نہیں ہے موصوف نے اپنے ترجمہ (سنہ ۱۹۲۶ء) کے دیباچہ میں لکھا ہے:۔

"قرآن کا پیرایۂ بیان خود اللہ خالق جلّ وعلا کا پیرایہ بیان ہے۔ وہ پیرایہ جو اپنے پیدا کرنے والے کے وجود کی حقیقت کا حامل ہے، ضرور خدائی پیرایہ ہی ہوسکتا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ سب سے زیادہ شک رکھنے والے اہل قلم بھی اِس پیرایہ کی ساحرانہ قوت کے آگے جھک جانے پر مجبور ہوچکے ہیں۔ اِس قرآن کا اثر روئے زمین پر پھیلے ہوئے تیس کروڑ مسلمانوں پر اتنا زبردست ہے کہ اجنبی پادریوں کو مان لینا پڑا ہے کہ اب تک کوئی ایک یقینی واقعہ بھی ایسا پیش نہیں کیا جاسکتا جس میں کوئی مسلمان اپنے دین سے مرتد ہوگیا ہو

"شروع شروع بددیوں کے کانوں میں پڑنے والا یہ پیرایہ حد درجہ

عجیب ولطیف نثر تھا۔ نہایت عمدہ ترتیب وہم آہنگی کے ساتھ رعنائی رکھتا تھا۔ باہم یکسانیت کے ساتھ مسجّع تھا، اور ہر عربی داں پر اُس کی تاثیر بہت ہی گہری ہوتی تھی اور ہوتی ہے، لہٰذا بالکل بیکار کوشش ہے کہ آدمی اِس حد درجہ بلند نثر کی تاثیر کسی دوسری زبان میں منتقل کرنے کی کوشش کرے، خصوصًا تنگ وسخت، اور سنگ دل فرانسیسی زبان میں۔ مزید براں فرنچ اور اِس زمانہ کی دوسری زبانیں، دینی زبانیں نہیں ہیں اُن میں کبھی الوہیت کے مسائل بیان نہیں کیے گیے"

اِس کے بعد موصوف نے لکھا ہے کہ وہ لگاتار نو برس کوشش کرتے رہے کہ قرآن کا کچھ حصّہ بھی فرانسیسی میں اِس شرط کے ساتھ منتقل کرسکیں کہ اصل کی بلاغت ہاتھ سے جانے نہ پائے، لیکن ہمیشہ یہی سوال اُن کے سامنے آتا رہا کہ کیا وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہو گیے ہیں؟ یعنی موصوف کو ہمیشہ اپنی کامیابی میں شک رہا۔

۳۔ قرآن کا یہ عجیب اور تمام عربی اسلوبوں سے مخالف اسلوب اور عقائد، مواعظ، حکمت، احکام، آداب، اِن سب کو مختلف سورتوں میں بکھری ہوئی آیتوں کے اندر مزج کر دینے کا قرآنی طریقہ ۔ جس کا سبب اور جس کی مصلحت ہم نے اِس کتاب میں بیان کی ہے ۔ اِسی چیز نے بڑے بڑے عالموں اور مفسروں کو قرآنی علوم و مقاصد کی

ابواب کے ماتحت تدوین سے باز رکھا۔ اِن لوگوں نے عبادات ومعاملات سے متعلق عملی احکام کی تبویب تو کر دی، مگر قرآن کے اجتماعی، سیاسی، مالی اصول وقواعد مرتب نہ کیے جن کا نمونہ قارئین اس کتاب میں دیکھیں گے۔ اِس کی وجہ یہ بھی تھی کہ اُنہیں اِس چیز کی اتنی ضرورت محسوس نہ ہوتی تھی جتنی آج کل ہم لوگ محسوس کر رہے ہیں۔

بعض علماءِ فرنگ نے فرانسیسی زبان میں ایک کتاب لکھی ہے۔ اُس میں قرآنی آیات، معانی کے لحاظ سے جمع کی ہیں اور انہیں اپنی سمجھ کے مطابق ابواب کے ماتحت کر دیا ہے، لیکن اِس کتاب کے مصنف نے بھی بہت جگہ معانی کے سمجھنے میں غلطی کی ہے، یا کوتاہی کا شکار ہو گیا ہے۔ آیاتِ قرآنی سے عام اصول وقواعد کے استخراج کے لیے ضروری ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت، قرآن کے بیان میں آپ کی سنت، قرآن کی شریعت میں آپ کی تنفیذ، نیز آپ کے خلفاء اور علمائے صحابہ کے آثار کا علم حاصل ہو۔ اِس ضرورت کو وہی لوگ خوب سمجھ سکیں گے جو اُس فرانسیسی کتاب کے بعد ہماری یہ کتاب دیکھیں گے جس میں ہم نے قرآنی مقاصد اختصار سے بیان کر دیے ہیں اور جن کی تفصیل، تفسیر المنار میں موجود ہے۔

۴۔ اسلام کی کوئی ایسی سلطنت باقی نہ رہی جو قرآن کو

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو حکومت کے ذریعہ قائم کرے۔ اور علم کے ذریعہ اُس کی اشاعت کرے۔ ایسی دینی انجمنیں بھی موجود نہیں ہیں جو اُس کی دعوت دیں۔ مسلمانوں کا کوئی علمی دینی ادارہ بھی نہیں ہے جس سے قرآن کے مطالب و ہدایت سمجھنے میں رجوع کیا جا سکے، جو روزمرہ کے بدلنے والے واقعات اور علوم و فنون کی رنت نئی ایجادوں سے پیدا ہونیوالی انسانی مصلحتوں میں قرآنی سیاست بتا سکے، اور جس سے علماءِ فرنگ معلومات حاصل کر سکیں۔

اِس سے بھی زیادہ عجیب و غریب بات یہ ہے کہ خود مسلمانوں نے بھی خیر القرون کے بعد سے اپنا دین، قرآن سے اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے اخذ کرنا چھوڑ دیا ہے، حالانکہ خدا نے اُنہیں اِسی بات کا حکم دیا تھا:۔

وَ اَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ۔ (۱۶ : ۴۴)	اے پیغمبر، ہم نے آپ پر یہ یاد دلانے والی چیز (قرآن) اس لیے اتاری ہے کہ آپ لوگوں کو وہ سب کھول کر بتا دیں جو ان کی طرف خدا نے اُتارا ہے، تاکہ وہ غور کریں۔

مسلمان، قرآن و سنت سے برابر دور ہوتے چلے گیے یہاں تک

کہ ہدایت کے اِن سرچشموں سے بالکل مستغنی ہوگیے۔ اپنے عقاید، متکلمین کی کتابوں سے اور اپنی عبادات و معاملات کے احکام، غیر مجتہد علماء مذاہب سے لینے لگے۔ حالانکہ اِن کتابوں سے اللہ تعالیٰ کی انسانوں پر حجت قائم نہیں ہوتی، خصوصاً اِس زمانہ کے لوگوں پر جس میں تمام عقلی و قانونی علوم نے بڑی ترقی کرلی ہے، حتیٰ کہ خود ہم مسلمانوں نے بھی غیروں سے وہ چیزیں لینا شروع کر دی ہیں جو وہ پہلے ہم سے لیا کرتے تھے۔

اسی قدر نہیں بلکہ ہماری اِن کتابوں میں متکلمین و فقہاء کے ایسے خیالات، جھوٹے اور ضعیف راویوں کی ایسی ایسی روائتیں موجود ہیں کہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف حجت بن سکتی ہیں، ٹھیک اُسی طرح جس طرح مسلمانوں کی زبوں حالی، اُن میں جہل کی گرم بازاری، اور اُن کی حکومتوں کا فساد و بربادی، اُن کے دین کے خلاف حجت بنائی جاچکی ہے، اور اِس طرح مسلمان اُن لوگوں کے لیے فتنہ بن گیے ہیں جو اسلام کے منکر ہیں!

قرآن اور اُس کی ہدایت کے فہم میں جب خود مسلمانوں کا یہ حال ہے تو اُن قوموں کا کیا حال ہوگا جنہوں نے دوسرے مذہبوں میں پرورش پائی ہے، اور جن کے پیشوا اُنہیں اپنی ہی روش پر استوار رکھنا اور دوسری راہوں سے باز رکھنا چاہتے ہیں؟ اور جن کے پہلو بہ پہلو زبردست جنگی

سلطنتیں موجود ہیں جو صدیوں سے اسلام کی دشمنی میں سرگرم ہیں اور جنہوں نے اسلام کے خلاف ایسی کوششیں کی ہیں کہ اگر پہاڑوں کے خلاف کی جاتیں تو وہ بھی ریزہ ریزہ ہو کر نابید ہو جاتے، لیکن یہ اسلام اللہ حیّ و قیّوم کا دین ہے اور اُس وقت تک زندہ رہنے والا ہے جب تک زمین پر انسان زندہ ہیں۔ یہ دین کبھی نہیں مٹے گا اگرچہ خود زمین مٹ جائے۔

یہ ہیں وہ اسباب جن کی وجہ سے موجودہ زمانہ کی تہذیب کے عالموں بلکہ خود بہت مسلمانوں سے بھی اسلام کی حقیقت پوشیدہ ہو گئی ہے، اور یہ اِسی کا نتیجہ ہے کہ وہ آرزو کر رہے ہیں، کاش کوئی نیا نبی آئے اور اپنے ساتھ ایسی خدائی ہدایت لائے جو عالمگیر ہو اور سب کی اصلاح و درستگی کر دے۔

چونکہ اسلام ہی انسانیت کا عالمگیر اور دائمی دین ہے اور اپنے اندر وہ سب باتیں رکھتا ہے جن کی تمام قوموں کو اپنی دینی اور دنیاوی ہدایت کے لیے ضرورت ہے، اس لیے تمام آزاد خیال عقلمندوں، فکری استقلال رکھنے والوں، اور موجودہ مادّی مفاسد سے رنجیدہ ہونے والے عالموں کا فرض ہے کہ اُن پردوں کو اٹھا دینے کی کوشش کریں جو اُن سے اسلام کو چھپائے ہوئے ہیں، اور وہ تمام موانع دور

دور کر دیں جو انہیں اُس کی حقیقت سمجھنے سے روک رہے ہیں۔

اِس کتاب سے تمام دنیا پر حجت قائم ہو جاتی ہے

اس تمہید کے بعد میں یہ کتاب اِن سب لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ اس کتاب میں میں نے "وحی محمدی" کے ثبوت پیش کیے ہیں اور دکھا دیا ہے کہ قرآن، اللہ عز وجل ہی کا کلام ہے، اور اُس میں وہ تمام چیزیں جمع ہیں جن کی انسان کو اپنی دینی، اجتماعی، سیاسی، مالی جنگی اصلاحوں کے لیے ضرورت ہے۔

میں نے اِن بنیادی مقاصد کے بیان میں گفتگو کسی قدر دراز کر دی ہے، کیونکہ یہی چیزیں اُن تمام فتنوں اور فسادوں کے سرچشمے ہیں جن سے اِس زمانہ کے عقلمند نالاں ہیں۔ اس موضوع پر پوری بحث کے لیے بڑی بھاری کتاب کی ضرورت ہے جس میں قرآن کے تمام مقاصد جمع کر دیے جائیں اور دکھا دیا جائے کہ دنیا اور دین کے معاملات میں انسانوں کو اُن کی کتنی ضرورت ہے۔ یہ چیزیں "المنار" کی تفسیر میں آیات کی شرح کے ساتھ بہ تفصیل بیان کر رہا ہوں اور ہر سورۃ کے آخر میں اُس کے اصول و قواعد اجمال کے ساتھ درج کرتا جاتا ہوں۔

یہ بحث شروع میں نے اِس غرض سے نہیں لکھی تھی، بلکہ آیت "أَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا أَنْ أَوْحَيْنَا إِلَىٰ رَجُلٍ مِّنْهُمْ" کی تفسیر

میں یونہی اتفاقیہ چھڑ گئی تھی۔ اِس بحث میں قطعی دلائل کے ساتھ میں نے دکھایا تھا کہ قرآن، اللہ تعالیٰ کی وحی ہے اور یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی دوسرے انسانوں کی طرح اپنے علم اور زبان کی قوت سے ایسی چیز از خود پیش نہیں کر سکتے تھے، اور یہ کہ آپ کے نفس سے یہ وحی پھوٹ نہیں سکتی تھی جیسا کہ بہت سے علما، فرنگ وغیرہ کا خیال ہے، اور یہ کہ قرآنی وحی، تمام سابقہ وحیوں سے زیادہ عالمگیر، مکمل، اور زیادہ ثابت و روشن ہے، اور یہ کہ اُس کی حجت تمام لوگوں پر قائم ہے چاہے وہ وحی و الہام کے قائل ہوں یا نہ ہوں۔ اِس کے بعد مجھے دوران تحریر میں خیال ہوا کہ اِس بحث کو الگ کتاب کی صورت میں کر دوں اور اس کے ذریعہ مادّی تہذیب کی قوموں، مثلاً اہل یورپ اور جاپان کو اسلام کی طرف دعوت دوں۔ اِس بحث کو اِن قوموں کے آزاد خیال علماء کے سامنے پیش کروں، تاکہ جب اُنہیں اِس کے ذریعہ ہدایت حاصل ہو جائے تو وہ اپنی اپنی قوموں اور سلطنتوں کو بھی اپنی اپنی زبانوں میں یہی دعوت دیں۔ اسی لیے میں نے اِس کتاب میں اپنی تفسیر سے کچھ اضافہ کر دیا ہے اور آخر میں خاتمہ شامل کر دیا ہے جس میں اِس دعوت کی تصریح کی ہے اور وہی مقصود بالذات ہے۔

اگر شروع سے اِس بحث کو یہ صورت دینے کا ارادہ ہوتا تو

اس کی ترتیب ایسی رکھتا کہ بعض مقامات میں طوالت و تکرار کی ضرورت باقی نہ رہتی۔ لیکن بعض مقامات پر میں نے جان بوجھکر تکرار سے کام لیا ہے۔ یہ مباحث میں نے متفرق اوقات اور الجھنوں اور پریشانیوں میں لکھے ہیں۔ پچھلے مباحث کا مراجعہ بھی نہیں کر سکا، اور قرآن میں سے بھی صرف اپنی یادداشت ہی پر بھروسہ کیا ہے، حالانکہ قرآن کے معانی کا بروقت استحضار مشکل ہے۔ ہاں بعض احادیث کی تصحیح اور رُواۃ کی جانچ کے لیے کتابوں کا مراجعہ کیا ہے۔ قارئین سے میری خواہش ہے کہ اس کتاب کی جس بحث کی تفصیل مطلوب ہو، تفسیر "المنار" میں دیکھیں اور جہاں کہیں کوئی اشکال پیدا ہو، مجھ سے سوال کریں۔

یہ مقدمہ ۱۳۵۲ھ کے مولد محمدی کی رات میں لکھا گیا ہے۔

محمد رشید رضا

منشی رسالہ "المنار"

وحی کے قائلوں اور منکروں پر حجت

قائلین وحی سے گفتگو

وحی کے قائل، اہل کتاب ہیں۔ جس کسی نے اِن کی مقدس کتابیں، عہد قدیم اور عہد جدید دیکھی ہے۔ نیز قرآن، کتب سنت اور سیرت محمدی کا مطالعہ کیا ہے، اُس کی عقل اور ضمیر دونوں یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہونگے کہ اہلِ کتاب کی اِن کتابوں کو وحی الٰہی ماننے والا، اور اُن کے لانے والے پیغمبروں کو معصوم سمجھنے والا، لازمی طور یہ بھی ماننے اور سمجھنے پر مجبور ہے کہ قرآن بھی وحی الٰہی ہے اور محمدؐ، اللہ کا پیغام پہنچانے میں معصوم پیغمبر ہیں۔ یہ حقیقت اہل کتاب کو اُسی طرح تسلیم کرنا پڑیگی جس طرح کوئی فقیہ، ابوحنیفہ اور شافعی کے فقہ سے انکار نہیں کرسکتا۔ کسی نحوی کو سیبویہ اور ابن جنی کی نحو میں کلام نہیں ہوسکتا۔ کوئی شاعر رضی اور بحتری کو شاعروں کے زمرہ سے خارج نہیں کرسکتا، بلکہ اِس حقیقت کے آگے اُسی طرح جھک جانا پڑیگا جس طرح کوئی دیدۂ بینا ستارے اور چاند کی روشنی کو سورج پر ترجیح دے نہیں سکتا، یا چراغ کی روشنی کو دھوپ سے بہتر قرار دے نہیں سکتا۔ خدا بھلا کرے "بوصیری" کا، خوب کہہ گیا ہے:۔

اللہ اکبر ان دین محمد و کتابہ اقوی واقوم قیلا

(اللہ اکبر، محمد کے دین کا اور کتاب کا کیا کہنا۔ جو سب سے زبردست اور سب سے درست ہے)

لا تذکروا الکتب السوالف عندہ طلع الصباح فاطفئ القندیلا

(اس کے سامنے اگلی کتابوں کا نام نہ لو۔ سورج نکل آیا ہے لہذا چراغ بجھا ڈالو!)

اسی بات کی شہادت خود علماء فرنگ نے بھی دی ہے جو مسیحیت میں بڑھے پلے، اُس سے اچھی طرح واقف ہوئے، پھر اسلام کا بھی صحیح علم حاصل کیا اگرچہ نامکمل رہا۔ اُنہی میں سے ایک مستشرق کی تازہ شہادت ملاحظہ ہو۔

جنیوا یونیورسٹی میں مشرقی زبانوں کے پروفیسر، ادوار مونتیہ، فرانسیسی زبان میں اپنے ترجمۂ قرآن کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

"محمد ٹھیک اُسی طرح سچے نبی تھے جس طرح قدیم زمانہ میں انبیاء بنی اسرائیل سچے تھے۔ اِنہی پیغمبروں کی طرح محمد بھی خواب دیکھتے تھے اور وحی الٰہی اُن پر اُترتی تھی۔ دینی عقیدہ اور وجود الوہیت کا زبردست خیال اپنے اسلاف پیغمبروں کی طرح اِن پر بھی چھایا ہوا تھا، اور اُنہی کی طرح محمد میں بھی وہ نفسی الہام اور شخصیت میں وہ افزونی پیدا

ہوتی تھی کہ جن دونوں سے عقل انسانی میں تجلّیات، وحی، اور اسی قبیل کے روحی احوال کی گنجائش نکلتی ہے۔"

دیکھو، یہ آزاد خیال یورپین عالم مان رہا ہے کہ جس بنیاد پر بنی اسرائیل کے پیغمبر نبی تھے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں بھی وہی بنیاد موجود ہے۔ لیکن ہم کہتے ہیں کہ آپ میں نبوت کے خصائص زیادہ صاف، روشن، روایت کے لحاظ سے زیادہ صحیح، اور شبہات سے زیادہ دور تھے جیسا کہ ہم عنقریب بالکل واضح کر دیں گے۔ اِس یورپین عالم نے خصائص نبوت کی وہی تعلیل کی ہے جو مادی علماء، وحی مطلق کی کیا کرتے ہیں۔ اِس معاملہ پر ہم اِس فصل کے دوسرے حصہ میں گفتگو کریں گے۔

اِس عالم نے اسلامی کتابوں سے معلومات لیکر محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نزول وحی کا حال اِس طرح لکھا ہے کہ معلوم ہوتا ہے وہ وحی کا قائل ہے۔ اِس کے بعد فرانسیسی مستشرق، امیل درمنگم نے اپنی کتاب "حیات محمد" میں اِسی چیز کو بہ تفصیل لکھا ہے اور اُس کی صحت کا اقرار کرتے ہوئے بتایا ہے کہ آپ کی نبوت سے انسان کی کہاں تک اصلاح ہوئی۔ نیز عیسائیوں اور مسلمانوں میں نااتفاقی پر افسوس کرنے کے بعد اُن کے باہمی اتفاق کی آرزو ظاہر کی ہے۔

یہاں ہم ایک ایسے یورپین عالم کی زبان سے وحی، نبوت،

اور معجزات کی تشریح درج کرتے ہیں جو موجودہ علوم کے ساتھ دینی و تاریخی علوم کا بھی ماہر ہے۔ اس شخص کا نام، ڈاکٹر جارج پوسٹ ہے۔ یہ بہت مشہور ہے، اور اِس نے عربی زبان میں کتاب مقدس کی لغت لکھی ہے۔ یہ ہم اس لیے کر رہے ہیں کہ آزاد خیال لوگ، انبیاء بنی اسرائیل اور اُن کی وحی میں اور محمد رسول اللہ خاتم النبیین اور اُن کی وحی کے بارے میں فیصلہ کر سکیں۔

اُن کے ہاں وحی کی تعریف

"کتاب مقدس کی لغت" میں لفظ "وحی" کی تفسیریوں کی گئی ہے:

"اِس لفظ کا استعمال کسی شہر یا قوم میں کسی خاص نبوت کے اظہار کے لیے ہوتا ہے۔ (حزقیال ۲:۱) میں آیا ہے کہ "یہ وحی ہی سردار ہے"، یعنی قوم کے لیے نشانی ہے۔ عام طور پر وحی کے لفظ سے الہام مقصود ہوتا ہے، اور اِسی لیے کہا جاتا ہے کہ "پوری کتاب، اللہ کی طرف سے وحی ہے"۔ اِس صورت میں معنیٰ یہ ہوتے ہیں کہ اللہ کی روح، الہام والے لوگوں کی روحوں میں حلول کر جاتی ہے، اور یہ اس طرح ہوتا ہے کہ (۱) خدائی روح اُنہیں ایسے روحانی حقائق اور پیش آنیوالے واقعات بتا دیتی ہے جن تک اُن کی رسائی کسی اور ذریعہ سے ہو ہی نہیں سکتی تھی (۲) خدا کی

روح، مشہور واقعات یا مسلّم حقائق کی طرف اُن کی رہنمائی کر دیتی ہے اور وہ اُنہیں زبان سے یا تحریر سے اس طرح بیان کر دیتے ہیں کہ ذرا غلطی نہیں ہوتی۔ ایسی ہی صورت میں کہا جاتا ہے "اللہ والے مقدسوں نے روح القدس کے زیر اثر بات کہی ہے"۔ ایسی صورت میں بات کہنے والا یا لکھنے والا اپنی شخصیت برقرار رکھتا ہے۔ صرف یہ ہوتا ہے کہ روح الٰہی اُس پر اثر ڈالتی ہے اور وہ اُس کی رہنمائی کے بموجب اپنے قویٰ اور اپنی صفات استعمال کرنے لگتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہم اِن عزت داروں میں سے ہر ایک کی کتاب میں اُس کی قدرتی قابلیتیں اور اسلوب بیان وغیرہ امور نمایاں پاتے ہیں۔ اِس معاملہ کی شرح مشکل ہے، اور علماء کا اس میں اختلاف ہے، لیکن تمام مسیحی اس بات پر متفق ہیں کہ اللہ نے اِن برگزیدہ مؤلفوں پر وحی نازل کی تھی تاکہ اُس کے ارادہ کو مُدوّن کر دیں اور انسان کو بتا دیں کہ دائمی نجات حاصل کرنے کے لیے کس ایمان و عمل کی ضرورت ہے"

اُن کے ہاں نبوۃ و انبیاء کی تعریف

اِسی کتاب میں "نبی، انبیاء، نبوۃ" کے تحت لکھا ہے:

"نبوۃ کے معنی ہیں اللہ کی اور دینی معاملات کی خبر دینا خصوصًا اُن باتوں کی پیشین گوئی جو بعد میں ہونے والی ہیں۔ ہارون کو نبی اِسی لیے

کہا گیا کہ وہ اپنی فصاحت کے سبب، موسیٰ کی طرف سے خبر دیتے اور گفتگو کرتے تھے۔ قدیم زمانہ کے پیغمبر، موسوی شریعت ہی کا پیغام دیتے اور مسیح کے آنے کی پیشین گوئی کیا کرتے تھے۔ صموئیل کے زمانہ میں جب کاہنوں کو علم و تعلیم کا شوق باقی نہ رہا تو صموئیل نے مقام رامہ میں ایک مدرسہ کھولا اور اُس میں پڑھنے والوں کو "فرزندان انبیاء" کے نام سے موسوم کیا۔ اِس مدرسہ کے بعد مشہور ہوگیا کہ صموئیل نے شریعت زندہ کردی ہے اور کتاب مقدس میں بہت جگہ موسیٰ و ہارون کے ساتھ اُن کا نام بھی ذکر کیا گیا۔ نیز دوسرے مقامات مثلاً بیت ایل، اریحا، جلجال وغیرہ میں انبیاء کے اور مدرسے بھی قائم ہوگئے۔ انبیاء کے مدرسہ کا افسر باپ یا آقا کہلاتا تھا۔ اِن مدرسوں میں توراۃ، موسیقی، اور شعر کی تعلیم دیجاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء شاعر ہوتے تھے اور اُن میں سے اکثر گانا بجانا جانتے تھے۔ اِن مدرسوں سے غرض یہ تھی کہ قوم کے لیے رہنما طیار کیے جائیں۔ نبیوں اور نبیوں کے فرزندوں کی زندگی بہت ہی سادہ ہوا کرتی تھی۔ اِن میں سے بہتیرے تارک الدنیا تھے یا جہاں نوردی کرتے تھے اور پرہیزگار اُن کی مہمانی کیا کرتے تھے۔

"معلوم ہوتا ہے کہ اِن مدرسوں میں تمام پڑھنے والوں کو پیشین گوئی کی قوت نہ مل سکی۔ یہ خصوصیت اُن میں سے صرف اُنہی لوگوں کو حاصل ہوتی تھی جنہیں خدا اپنی مشیئت سے وقتاً فوقتاً اِس کام کے لیے کھڑا کیا

کرتا تھا اور اِن اہم فرائض کی ادائگی کے لیے اُن کی غیر معمولی تربیت کا سامان فراہم کر دیا کرتا تھا۔ لیکن بعض الہام والے نبی ایسے بھی ہوئے ہیں جن پر وحی نازل ہوتی تھی، حالانکہ انہوں نے نہ تعلیم حاصل کی تھی نہ ان مدرسوں میں داخل ہوئے تھے جیسے عاموس نبی جو چرواہا تھا اور گولر چننے والا۔ نبوت کئی طرح کی ہوا کرتی تھی مثلاً خواب اور تبلیغ۔ اکثر ایسا بھی ہوتا تھا کہ انبیاء مستقبل کی باتیں زمانہ کی تمیز کے بغیر جان لیا کرتے تھے اور اس لیے اُن کے مکاشفوں میں قریب کے واقعات دور کے واقعات سے گڈمڈ ہو جاتے تھے۔ مثلاً اشوریوں کی غلامی سے یہودیوں کی رہائی کا واقعہ، مسیح کے ذریعہ دنیا کی نجات کے واقعہ سے مل گیا ہے۔ یا سکندر ذوالقرنین کی فتح اور مسیح کی آمد کا ذکر ایک ساتھ ہو گیا ہے۔ یا پنجشنبہ کے دن روح القدس کے بہنے کا معاملہ روز حشر کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح یروشلم کی بربادی کو قیامت کے ساتھ وابستہ کر دینے کا بھی معاملہ ہے۔

"خدا نے اپنے انبیاء اس لیے بھیجے کہ اُس کی مشیئت کا اعلان کریں دینی زندگی کی اصلاح کریں، خصوصاً دنیا کی نجات کے لیے آمد مسیح کی بشارت دیں، یہ لوگ تعلیم، بیداری اور حق کی طرف قوم کی رہنمائی میں زبردست تاثیر رکھنے والی قوت تھے اور سیاسی معاملات میں بھی اُن کا اثر بہت زیادہ تھا"

اُن کی تعریفِ نبوت پر اعتراض

الہام کی یہ تفسیر کہ پیغمبر کی روح میں اللہ کی روح حلول کر جاتی ہے تو یہ عیسائیوں کی زبردستی ہے جس کا اعتراف نہ انبیاء بنی اسرائیل نے کیا ہے نہ اُن کے علماء نے۔ عیسائیوں کا یہ ایک ایسا دعویٰ ہے جسے وہ ہرگز ثابت نہیں کر سکتے اور نہ اسرائیلی پیغمبروں کی تحریروں میں جو تناقض و تعارض موجود ہے، اُسے اپنے اِس دعوے کے ساتھ مطابقت دے سکتے ہیں چنانچہ اِس جانب خود اِسی مولف نے بھی یہ کہکر اشارہ کیا ہے "اِس تعلیم کی شرح دقّت طلب ہے اور علماء نے اس میں اختلاف کیا ہے" الخ ظاہر ہے جس وجود میں بھی اللہ کی روح حلول کر جائے گی، خدا ہو جائے گا، اِسی بناپر عیسائیوں کے نزدیک حضرت مسیح خدا قرار پائے کہ اُن میں بقول اِن کے خدا کی روح حلول کر گئی تھی۔ اگر یہ دعویٰ تسلیم کر لیا جائے تو کیونکر ممکن ہے کہ خدا ہوتے ہوئے یا خدا کی روح اندر رکھتے ہوئے وحی میں غلطی پڑ جائے یا وہ واقعہ کے خلاف نکلے؟

نبوۃ اور انبیاء کے بارے میں مؤلف کی گفتگو سے حسب ذیل باتیں اخذ ہوتی ہیں:

ا۔ اکثر انبیاء بنی اسرائیل اپنے خاص مدرسوں میں تعلیم حاصل کرتے تھے جہاں اپنی شریعت یعنی توراۃ کی تفسیر پڑھتے اور موسیقی و شعر

سیکھتے تھے۔ اور یہ کہ وہ شاعر، مغنّی، بجانیوالے تھے اور ہر اُس چیز میں ماہر تھے جو طبیعت پر موثر ہوتی اور جذبات کو ابھارتی ہے۔ لہٰذا عجیب نہیں اگر اُن کے عظیم ترین پیغمبر، عزرا اور نحمیا، شاہ بابل ارتخششتا کے ساقی اور مغنّی تھے، اپنے نغموں کے ذریعہ انہوں نے پادشاہ کے دل پر قابو حاصل کیا تھا اور اپنی قوم کے ساتھ اصلی وطن میں واپس جانے اور ازسر نو اپنا دین قائم کرنے کی اجازت حاصل کر لینے میں کامیاب ہو گیے تھے۔

اِس قول کی بنا پر نبوت بھی ایک ہنر یا پیشہ تھا، جسے مدارس میں سکھایا پڑھایا جاتا تھا اور اس کا یقین دلانے کے لیے شاعرانہ خیالات زبانی الہامات، موسیقی موثرات، اور کسبی معلومات سے کام لیا جاتا تھا کہاں یہ نبوت اور کہاں محمد اُمّیؐ کی نبوت جنہوں نے نہ کوئی تعلیم حاصل کی نہ کبھی کوئی شعر کہا، لیکن اِس کے باوجود ایسی چیز لائے جیسی کبھی کوئی پیغمبر لا نہ سکا!

۲۔ اِن نبیوں اور اُن کی اولاد میں اکثر تارک الدّنیا تھے، یا اِدھر اُدھر لوگوں کے ہاں گشت کرتے اور دینداروں سے محبت کرنیوالے پرہیزگاروں کی مہمان نوازی پر زندگی بسر کرتے تھے، جیسا کہ اِس زمانہ میں بھی مسلمان درویشوں اور صوفی فقیروں کا حال ہے۔ معلوم ہے یہ پرہیزگار لوگ اِس قسم کے فقیروں کی ہر بات، ہر دعویٰ قبول کر لیتے،

اور اُس کی اشاعت کیا کرتے ہیں۔ چنانچہ اِن نبیوں کی نسبت بعض سخت گناہ بھی اُن کی مقدس کتابوں میں روایت کر دئے گیے ہیں۔ برخلاف اِن کے مسلمانوں کے ہاں صوفیوں، عابدوں، سیّاحوں کے ایسے حالات ملتے ہیں جو اُنہیں اِن انبیاء سے بھی افضل ثابت کرتے ہیں، اگر ان کی مقدس کتابوں کی گناہ والی روائتیں مان لی جائیں۔ ایسی حالت میں کیونکر خیال کیا جا سکتا ہے کہ یہ پیغمبر، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے درجہ تک پہنچ سکتے ہیں حالانکہ آپ کی نشوونما فطرت پر ہوئی تھی۔ اپنی زندگی اپنی ہی قوت بازو سے بسر کرتے تھے۔ نہ نبوت سے پہلے نہ نبوت کے بعد کبھی کسی چیز میں بھی لوگوں پر بوجھ نہیں بنے تھے۔

۳۔ اُن پیغمبروں کی نبوتیں زیادہ تر خواب اور مُبہم تخیُّلات ہوا کرتے تھے اور یہ ایسی چیزیں ہیں جو دوسرے لوگوں کو بھی پیش آجاتی ہیں۔ رویائے صادقہ ہی سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت بھی شروع ہوئی تھی۔ یہ واقعہ تشریعی وحی کے نزول سے پہلے کا ہے۔ لیکن آپ کے خواب بھی اُن پیغمبروں کے خوابوں سے اعلیٰ ہوا کرتے تھے جیسا کہ ہم آگے چل کر بیان کریں گے۔ خوابوں کی حقیقت یہ ہے کہ خیال میں محسوس صورتیں آجاتی ہیں جن کی تعبیر میں بہت اختلاف بیان ہوتا ہے۔ سچی تعبیر پیغمبروں کے سوا بہت کم لوگ جانتے ہیں، جیسے شاہ مصر کا خواب جس کی تعبیر

حضرت یوسف نے دی تھی، یا خود آپ کا اپنے بچپن کا خواب۔

۴۔ آنیوالے واقعات کی پیشین گوئیاں جن سے وہ پیغمبر اپنا نبی ہونا ثابت کرتے تھے، تو یہ پیشین گوئیاں اکثر اوقات اِس طرح ہوا کرتی تھیں کہ اُن کے زمانوں اور واقعات کی تمیز نہ ہوسکتی تھی اور اس لیے وہ آپس میں خلط ملط ہوجایا کرتی تھیں اور اُن کا مطلب اُسی وقت جانا جاتا تھا جب کسی پیش آنیوالے واقعہ پر اُنہیں چسپاں کر دیا جاتا تھا، جیسا کہ ہر زمانہ کے روحانی مکاشفات رکھنے والوں بلکہ معمولی نجومیوں اور رمّالوں کی پیشین گوئیوں کا بھی حال ہے۔ اِن پیغمبروں کی بعض پیشین گوئیاں غلط بھی ثابت ہوچکی ہیں جیسا کہ خود مصنف نے اشارہ کیا ہے گو اس کی تفصیل نہیں کی لیکن تاریخ نے اِسے واضح کر دیا ہے۔ اِن اسرائیلی پیغمبروں کی سب سے بڑی پیشین گوئی مسیح (مسیا) کی آمد اور اسرائیل کی بادشاہی کے متعلق تھی جس کے انتظار میں اب تک یہودی پریشان ہیں۔ پھر خود مسیح کی بربادی عالم اور قیامت آجانے کی نسبت پیشین گوئی ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ اُن کی مخاطب نسل ختم ہونے نہ پائیگی کہ یہ سب باتیں پیش آجائیں گی، مگر ایک نسل کیا بہت سی نسلیں گزر گئیں اور وہ پیشین گوئی واقع نہ ہوئی۔

محمدی پیشین گوئیوں کا امتیاز

غور کرو یہ اسرائیلی پیشین گوئیاں بھلا قرآن کی بکثرت قطعی پیشین گوئیوں کا مقابلہ کیونکر کر سکتی ہیں جیسا کہ ہم سورۂ توبہ کی تفسیر کے خلاصہ میں بیان کر چکے ہیں۔ اور جیسا کہ منافقوں کے بارے میں پیشین گوئی ہے، یا سورۂ فتح کی پیشین گوئی، یا سورۂ روم کی یہ پیشین گوئی کہ غُلِبَتِ الرُّوْمُ فِیْ اَدْنَی الْاَرْضِ وَھُمْ مِّنْ بَعْدِ غَلَبِھِمْ سَیَغْلِبُوْنَ فِیْ بِضْعِ سِنِیْنَ(۱) الخ اور یہ پیشین گوئی کہ وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ فِی الْاَرْضِ(۲) ہے کہاں اسرائیلی پیغمبروں کی پیشین گوئیاں اور کہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنے صحابہ سے یہ پیشین گوئی کہ تم میرے بعد بہت جلد شام، ایران مصر فتح کر لو گے۔ قیصر و کسریٰ کی سلطنتوں پر قبضہ کر لو گے۔ اِسی قدر نہیں بلکہ آپ نے اُس کے عہد کے کسریٰ کا نام بھی بتا دیا تھا جیسا

---

(۱) ترجمہ۔ قریب کی سرزمین میں رومی مغلوب ہو گئے ہیں، اگر وہ چند ہی سال کے اندر عنقریب غالب آجائیں گے۔

(۲) ترجمہ۔ تم میں جو لوگ ایمان لائے ہیں اور عمل صالح رکھتے ہیں، خدا کا اُن سے وعدہ ہے کہ اُنہیں ضرور زمین پر خلیفہ بنا دے گا۔

کہ بخاری نے عدی بن حاتم سے روایت کیا ہے!

نبوت کے اِس ایک پہلو یعنی پیشین گوئیوں کی نسبت یہ بالاختصار کہا جا سکتا ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئیاں، چاہے وحی قرآنی کے ذریعہ ہوں یا دوسری طرح، انبیاء بنی اسرائیل کی پیشین گوئیوں سے کہیں زیادہ ظاہر، واضح، اور تاویل و شک سے بہت دور ہیں۔ مزید براں آپ نے گزشتہ غیبی باتوں کی بھی خبر دی ہے۔ میں عنقریب نبوت و وحی کے منکروں کی اِس بارے میں تاویلات کی قلعی کھول دونگا۔

نبوت کا دوسرا پہلو زیادہ اہم اور عظیم الشان ہے، اور وہ دینی عقائد، عبادات، آداب و احکام کا معاملہ ہے اور اس پر غور دو طرح سے کیا جا سکتا ہے:

۱۔ اگر یہ چیز ایسی ثابت ہو کہ اُس کا لانے والا اپنے دماغ، علم، اور حاصل کردہ معلومات کے ذریعہ اُس تک پہنچ نہیں سکتا ہے، تو ایسی صورت میں ماننا پڑے گا کہ یہ چیز ضرور وحی الٰہی ہے۔

۲۔ اگر یہ چیز انسانوں کی ہدایت اور اُن کے دین و دنیا کی بھلائی کے لحاظ سے بذات خود اتنی بلند ہے کہ اُس کے لانیوالے کے زمانہ میں لوگوں کا علم وہاں تک پہنچ نہیں سکتا تھا، تو ماننا پڑے گا

کہ وہ چیز ضرور وحی الٰہی ہے۔

پہلی بات رسول کی ذات سے تعلق رکھتی ہے۔ ہر عقلمند اور آزاد خیال آدمی، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اور انبیاء بنی اسرائیل علیہم السلام کی تاریخ دیکھنے کے بعد جان جائے گا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم بالکل اُمّی تھے۔ پڑھنا لکھنا نہیں جانتے تھے۔ آپ کی قوم بھی جس میں آپ کی نشو ونما ہوئی اَن پڑھ تھی بت پرست تھی۔ دوسری قوموں کے عقائد، تاریخ، قانون اور فلسفی علوم سے جاہل تھی، حتیٰ کہ مکہ بھی جو عرب کا پایۂ تخت، عربوں کے دین کا گہوارہ، اُن کے بڑوں اور سرداروں کا موطن، حج وتجارت کا مرکز، اور فصاحت و بلاغت کے اظہار کا میدان تھا، سو وہاں بھی نہ کوئی مدرسہ تھا نہ کوئی کتاب تھی۔ اِس صورت حال کو دیکھتے ہوئے یہ کامل و مکمّل دین، یہ عادل و عالمگیر شریعت جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم لائے، ناممکن ہے کہ آپ نے کسی سے سیکھی ہو یا اپنی عقل سے بنائی ہو۔ جیسا کہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں اور عنقریب اُس شبہہ کا بھی ازالہ کردینگے جو یہاں وارد کیا جاتا ہے۔

لیکن اس کے مقابلہ میں حضرت موسیٰ کو دیکھو، جو اسرائیلی پیغمبروں میں اپنے کارنامے، شریعت، اور رہبری کے لحاظ سے سب سے بڑے تھے۔ موسیٰ علیہ السّلام کی پرورش ایک [illegible] قوم کے بادشاہ کے محل میں ہوئی

تھی جو اُس وقت روئے زمین کی سب سے بڑی قوم تھی۔ قانون، علم، حکمت، صنعت و حرفت میں سب سے آگے تھی۔ حضرت موسیٰ، فرعون مصر کے گھر میں بڑھے پلے تھے۔ اُنہوں نے اِس طاقتور و جابر بادشاہ کی حکومت میں اپنی قوم کو سخت ذلت و غلامی میں دیکھا تھا، اُس کے لڑکے ذبح کر ڈالے جاتے تھے اور لڑکیاں زندہ رکھی جاتی تھیں تاکہ پوری قوم صفحۂ ہستی سے ناپید ہو جائے۔ یہ سب دیکھ چکنے کے بعد حضرت موسیٰ کئی سال مدین میں اپنے سسر (شعیب) کے پاس رہے تھے جو نبی تھے — یا کاہن تھے جیسا کہ اہل کتاب کہتے ہیں — اِنہی حالات کی بنا پر منکرین وحی کہتے ہیں کہ اپنی قوم کے لیے موسیٰ جو شریعت لائے وہ ان کے جیسے بلند ہمت اور بادشاہت، قانون، اور دانائی کے گھر میں پلنے والے آدمی کے لیے کوئی بڑی چیز نہیں ہے۔

پھر اِس بیسویں صدی کے اوائل میں یہ راز کھلا ہے کہ توراۃ کی شریعت اپنے اکثر احکام میں کلدان کے بادشاہ، حمورابی کے قانون کے مطابق ہے جو حضرت موسیٰ سے پہلے گزر چکا ہے۔ حمورابی کی شریعت کا سراغ جرمن علماء نے لگایا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ موسیٰ کی شریعت اِسی بادشاہ کے قانون سے ماخوذ ہے، وحی الٰہی نہیں ہے، جیسا کہ ہم بہ تفصیل "المنار" کی چھٹی جلد میں اور اختصار کے ساتھ سورۂ توبہ کی تفسیر (۹ : ۳۰) میں

بیان کر چکے ہیں۔ اِس صورت حال میں آزاد خیال آدمی کم سے کم یہ کہتے ہیں کہ توراۃ اگر حمورابی کے قانون سے ماخوذ نہیں ہے، تو وحی الٰہی ہونے کی بھی مستحق نہیں ہے، کیونکہ حمورابی نے کبھی دعوی نہیں کیا کہ اُس کی شریعت، خدا کی طرف سے وحی ہے۔

پھر یہ بھی یاد رہے کہ زمانۂ قدیم کے تمام انبیاء، توراۃ کے تابع اور اُسی کے ماننے والے تھے۔ وہ اِسی توراۃ کی تفسیر دوسرے علوم کے ساتھ اپنے خاص مدرسوں میں پڑھتے تھے، لہذا ہرگز روا نہیں کہ اُن میں سے کسی ایک کا نام بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم گرامی کے ساتھ لیا جائے۔ نیز یہ بھی خیال رہے کہ بپتسمہ دینے والا پیغمبر یوحنا، جسے مسیح نے تمام پیغمبروں پر فضیلت دی ہے، وہ بھی نہ کوئی نئی شریعت لایا نہ غیب کی کوئی خبر دے گیا۔ بلکہ خود عیسٰی علیہ السلام بھی، جو اِن پیغمبروں میں سب سے بڑے، سب سے زیادہ مشہور، سب سے زیادہ اثر پیدا کرنیوالے ہیں، نئی شریعت نہیں لائے بلکہ توراۃ ہی کی شریعت کے پیرو بنے اگرچہ اُس کے احکام میں خفیف تنسیخ کی اور یہودیوں کے مادّی جمود کی اخلاقی روحانی اصلاح کر دی۔ بنابریں وحی کے منکروں کو یہ کہنے کا موقعہ مل گیا ہے کہ مسیح جیسے سیچی فطرت والے، زبردست عقل والے اور یہودی شریعت، رومی تہذیب، یونانی دانائی کی گود میں پلنے والے

زہد و روحانیت کے اثر میں نشو و نما پانے والے آدمی کے لیے ذرا مشکل نہیں کہ اِس قسم کے اخلاقی وعظ سنائے۔ ہم مسلمان یہ خیال نہیں رکھتے ہیں لیکن یہ خیال اُن مادّی، لا مذہب، اور عقلی لوگوں کا ہے جن میں سے ہزاروں مختلف عیسائی فرقوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

نبوت کا دوسرا پہلو، یعنی دینی عقائد، عبادات، آداب و احکام تو ہر آزاد عقل جو کسی دین کی مقلد نہیں، تسلیم کریگی کہ اسلام کے عقائد، یعنی توحید الٰہی، ہر نقص سے اُس کی تنزیہ، ہر صفت کمال سے اُس ذات برحق کی توصیف، عقلی علمی، نیچرل دلائل سے اس پر استدلال، رسولوں کی ہدایت کا بیان، نفس کو پاک کرنیوالی اور عقل کو بلند کرنے والی عبادات، منصفانہ قانون، اور سوسائٹی کو ترقی دینے والی حکومتِ شوری —— یہ سب چیزیں توراۃ، انجیل اور عہد قدیم و جدید کے تمام صحیفوں کی تعلیمات سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ ہیں، بلکہ یہی وہ اصلاح ہے جسے دین الٰہی نے اعلیٰ کمال تک پہنچا دیا ہے، اور خود علماء فرنگ اِس کی شہادت دے رہے ہیں۔ اس بارے میں ہم اپنے اور اُن کے نقطۂ نظر کی تشریح "المنار" اور تفسیر میں کئی جگہ کر چکے ہیں (آخری تشریح تفسیر جلد ۱۰ صفحہ ۲۵۹ میں دیکھیے)

آدم، نوح، ابراہیم، لوط، اسحاق، یعقوب، یوسف علیہم السلام کے قصّے، توراۃ کی کتاب پیدایش میں اور موسیٰ، داؤد، سلیمان وغیرہم انبیاء علیہم السّلام کے حالات عہد قدیم کی دوسری کتابوں میں دیکھو۔ پھر یہی قصّے قرآن میں مطالعہ کرو۔ صاف معلوم ہوجائے گا کہ اِن جلیل القدر پیغمبروں کی سیرتوں سے ہدایت پیش کرنے میں دونوں جگہ کتنا بڑا فرق ہے۔ عہد قدیم میں تمھیں نظر آئے گا کہ خدا کی طرف جہالت اور انسان کے پیدا کرنے پر ندامت کو منسوب کیا گیا ہے، نیز اُسے منتقم ظاہر کیا گیا ہے حالانکہ یہ باتیں خدا کی شان سے بعید ہیں اِسی طرح انبیاء کی طرف بڑے بڑے گناہ منسوب کیے گیے ہیں جن سے وہ کہیں بلند ہیں اور انسان میں جن کی موجودگی، بد ترین نمونہ ہے لیکن قرآن میں اللہ کی حکمت، رحمت، عدل، فضل، اُس کے قانونِ قدرت، پھر اُس کے نبیوں اور رسولوں کے کمال اور محاسن اعمال کے ایسے ایسے بیان موجود ہیں کہ تلاوت کرنے والے کا ایمان زیادہ ہوتا اور ان کے بہترین نمونہ سے ہدایت حاصل ہوتی ہے۔ عہد قدیم وجدید میں پیغمبروں کے حالات، جنگل کی طرح ہیں جس میں درخت، گھانس، کانٹے، پھول، پھل، کیڑے مکوڑے سب ہی موجود ہیں، لیکن یہی چیز قرآن میں اِس طرح ہے گویا پھولوں سے نکلا ہوا عطر

اور پھلوں سے بنا ہوا شہد ہے ۔ یہاں ایک ایسا چمن نظر آتا ہے جس میں نگاہ کے لیے ہر حسن جمع کر دیا گیا ہے ۔

ہم یہاں اُن کتابوں کا ذکر کرنا نہیں چاہتے جو عہد قدیم و جدید کی تردید میں آزاد علماء فرنگ نے لکھی ہیں ۔ اِن میں سب سے زیادہ مختصر مگر عجیب کتاب وہ ہے جس کا نام "توراۃ و انجیل کی مضرتیں" ہے اور ایک انگریز عالم کی تصنیف ہے ۔ اِن کتابوں کے مصنفوں نے دکھایا ہے کہ توراۃ و انجیل میں علم، عقل، تاریخ کی کتنی مخالفتیں موجود ہیں ، لیکن قرآن اِن تمام اعتراضوں سے دور ہے ۔

کلیسا کی اسلام دشمنی

کلیسا کے لوگوں نے جب دیکھا کہ اسلام نے بت پرستی اور آتش پرستی کا خاتمہ کر دیا ہے ، قریب ہے کہ مشرقی دنیا میں عیسائیت کا قلع قمع کر ڈالے ، اور اُس کا نور دنیا میں پھیلتا جاتا ہے ، تو اُنھوں نے اپنی دینی پیشوائی کو بچانے کے لیے جس سے مسیح علیہ الصلاۃ والسلام بالکل بری ہیں ، یہی حربہ اٹھایا کہ اسلام ، اُس کے نبی ، اور اُس کی کتاب کے خلاف کذب ، بہتان ، اور سب و شتم سے لبریز کتابیں لکھنا ، اشعار بنانا ، اور گانے طیار کرنا شروع کر دئے اور اس طرح اپنے آپ کو

ثابت کر دیا کہ تمام لوگوں سے زیادہ جھوٹے اور حق و اخلاق کے سب سے زیادہ دشمن ہیں۔

کلیسا کے مقلد اِن تمام تہمتوں کو سَر آنکھوں پر لیتے اور اسلام کے خلاف جوش میں آجاتے تھے، لیکن اِن میں سے جس کسی کو اسلامی کتابیں پڑھنے اور مسلمانوں سے ملنے جلنے کا موقعہ مل جاتا، کلیسا کے جھوٹ سے واقف ہوجاتا اور پھر بڑی بری طرح اُسے رسوا کر دیتا تھا، جیسا کہ کونٹ دی کاستری نے اپنی کتاب "اسلام، خواطر و سوانح" میں اور آج کل موسیو درمنگم نے اپنی کتاب "حیاتِ محمدؐ" میں کیا ہے۔ یہ دونوں مصنف، رومن کیتھولک فرقے سے تعلق رکھتے ہیں، مگر دوسروں کی طرح اِنہوں نے بھی صاف لکھ دیا ہے کہ کلیسا ہی نے اسلام پر ظلم و جور اور کذب و افترا میں پیش قدمی کی ہے اور یہ کہ مدافعت میں مسلمانوں نے تہذیب کا دامن ہاتھ سے کبھی جانے نہیں دیا ہے[1]۔

---

(۱) موسیو درمنگم اپنی اِسی کتاب میں لکھتے ہیں "جب اسلام اور مسیحیت میں جنگ شروع ہوئی تو قدرتی طور پر مخالفتوں اور غلط فہمیوں کا دروازہ کھل گیا اور حالت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔ اس بات کا اعتراف کرنا چاہیے کہ مغرب کے لوگوں ہی نے مخالفت میں پیش قدمی کی تھی۔ بیزنطینی مناظرہ بازوں نے اسلام کے مطالعہ کی زحمت اٹھائے بغیر اُس کی تحقیر کو اپنا شیوہ قرار دے لیا تھا۔ یورپ

(باقی صفحہ ۴۶ پر)

پھر جب یورپ پر اسلام کا نور پڑنے کے بعد پروٹسٹنٹ فرقہ ظاہر ہوا اور انگلوساکسوں اور جرمن قوموں میں اُس کا مذہب پھیل گیا تو اُس کے پادریوں اور مشنریوں نے بھی نہ جھوٹ بولنے اور تہمت تراشنے سے پرہیز ضروری سمجھا، نہ انصاف و تہذیب و ایمانداری سے کام لیا۔ بلکہ موجودہ زمانہ میں یہی فرقہ تمام دوسرے فرقوں سے زیادہ بے ادبی کے ساتھ افترا پردازی میں مصروف ہے۔ لیکن یہ بھی ماننا چاہیے کہ اِس فرقہ کے جن علماء نے اسلام کے ساتھ انصاف کیا ہے، وہ رومن کیتھولک سے زیادہ صاف گو اور شاید تعداد میں بھی اُن سے بڑھے ہوئے ہیں۔ نیز اِسی فرقہ کے لوگوں نے اسلام سے ہدایت بھی

(باقی صفحہ ۴۵ کا)

کے مصنفوں اور شاعروں نے مسلمانانِ اندلس سے صرف گالیوں ہی کے ساتھ جنگ کی ہے۔ اُنہوں نے فرض کر لیا تھا کہ محمد، قزاق تھے، عیش و نشاط کے دلدادہ تھے ساحر تھے۔ ڈاکوؤں کے سردار تھے۔ اِسی قدر نہیں بلکہ یہ بھی فرض کر لیا گیا تھا کہ محمدؐ رومن پادری تھے اور اِس لیے خفا ہو گئے تھے کہ پاپائیت کے عہدے کے لیے منتخب نہ ہو سکے تھے۔ بعضوں کے خیال میں محمد، جھوٹے خدا تھے جس پر انسانوں کو بھینٹ چڑھایا جاتا تھا! گیبرڈ نوجن، سنجیدہ اہل قلم تھا، مگر وہ بھی لکھتا ہے کہ محمد کی وفات شراب کے نشہ سے ہوئی اور اُن کی لاش گھورے پر پڑی تھی جسے جابجا سے سوروں نے کھا لیا تھا۔ اِس شخص نے یہ اس لیے لکھا تاکہ اسلام میں

(باقی صفحہ ۴۷ پر)

زیادہ حاصل کی ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اُن کی تربیت میں آزادی و ذہنی استقلال کو زیادہ دخل ہے۔ جلد وہ وقت آنے والا ہے جب یہی لوگ یورپ، امریکا، اور تمام دنیا میں اسلام کی اشاعت کریں گے جیسا کہ مسٹر برناڈ شا نے اپنی کتاب "حیات زوجیت" میں وثوق ظاہر کیا ہے۔

معجزات

رہ گیا معجزوں کا معاملہ جن پر تمام مسیحی کلیساؤں نے باوجود باہمی اختلاف عقائد کے اپنی بنیاد رکھی ہے، اور جس کی نسبت دعویٰ

(باقی صفحہ ۴۶ کا)

شراب اور سوئر کی حرمت کا سبب بتا سکے .... گیتوں میں تو یہاں تک ستم کیا گیا ہے کہ محمد کا طلائی بُت بنا دیا گیا ہے اور مسجدوں کو بُت خانہ قرار دے دیا گیا ہے جو بتوں اور تصویروں سے لبریز رہتی ہیں "انطا کی گیتوں" کے مصنف نے اُس آدمی کی گفتگو نقل کی ہے جس نے "اپنی آنکھ سے" ماحوم (محمد) کا بُت خالص سونے اور چاندی کا ڈھلا ہوا دیکھا تھا اور وہ چڑا اژدہا ہاتھی پر سوار تھا! رولان کے گیتوں میں دکھایا گیا ہے کہ بادشاہ شارلیمان کے شہسوار، اسلامی بُت توڑ رہے ہیں۔ اس شخص نے دعویٰ کیا ہے کہ اندلس کے مسلمان ایک ثالوث کے پجاری ہیں، جو ترفاجان، ماحوم، ابولین سے مرکب ہے۔ "قصۂ محمد" کا مصنف کہتا ہے کہ اسلام میں عورت کے لیے جائز ہے کہ بیک وقت کئی کئی مردوں سے شادی کرے۔ غرضکہ بغض و کینہ اور خرافات کا دور دورہ رہا۔ رو ڈالف دلوہیم کے وقت سے آج تک نیکولا ڈیکز، دلفیس، مرچی، ہوٹنگر، ملبیا نتار، پدیڈ وغیرہم بہت سے لوگ ہوئے، مگر سب نے یہی کہا کہ محمد دجّال تھے، اور اسلام میں کفر و شیطنت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ مسلمان وحشی ہیں اور قرآن، خرافات کا مجموعہ ہے!"

کر رہے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم معجزات سے بالکل تہی دامن تھے، حالانکہ موجودہ زمانہ میں یہی معجزے، مسیحی دین کی مضبوطی نہیں بلکہ کمزوری کا سبب بن گیے ہیں۔ علماء و عقلاء کو ان معجزوں سے اطمینان نہیں ہوتا، بلکہ یہی چیز اُنھیں دین کی طرف سے بدظن کر رہی ہے۔ اگر قرآن میں بھی اُن خدائی نشانیوں کا ذکر نہ ہوتا جن سے اللہ نے موسیٰ و عیسیٰ علیہما السّلام کی تائید فرمائی تھی، تو آزاد خیال فرنگیوں میں اُسے زیادہ مقبولیت حاصل ہوتی اور اُس کی ہدایت عالمگیر ہو جاتی، کیونکہ قرآن کی بنیاد عقل، علم، فطرت انسانی کی موافقت، افراد کے تزکیۂ نفس اور جماعت کے مصالح کی ترقی پر ہے۔ سب سے بڑا معجزہ جس کی بنیاد پر ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ قرآن، خدا کی طرف سے ہے، تو وہ خود قرآن ہی ہے اور محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اُمیّ محض ہونا ہے۔ یہ معجزہ سراسر علمی ہے اور عقل، حواس، اور ضمیر سے اُسے جانچا جا سکتا ہے:

کفاک بالعلم فی الامی معجزۃ فی الجاھلیۃ والتادیب فی الیتم

رہ گیے کائناتی معجزے تو اُن کی روایت، صحت، اور دلالت میں بہت سے شبہات اور تاویلات پیدا ہوتی ہیں۔ پھر اس طرح کی چیزیں ہر زمانہ میں بہت لوگوں کے ہاتھوں ظاہر ہوا کرتی ہیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں سے ایسی چیزیں اُس سے کہیں زیادہ منقول

ریں جتنی عہد قدیم وجدید اور مسیحی ولیوں کے بارے میں روایت کی جاتی ہیں۔ لیکن یہ چیزیں اس زمانہ میں علماء کو دین سے نفرت دلانے والی ہیں۔ عنقریب ہم اس بارے میں اسلام کا قول فیصل بیان کر دیں گے۔

حضرت مسیح کے معجزے

عجائبات اور اُن کی قسموں سے متعلق کتاب مقدّس کی مذکورۂ بالا لغت میں لکھا ہے:

"عجیب واقعہ، ایک ایسا واقعہ ہے جو خارق عادت خدائی قوت سے پیش آتا ہے تاکہ اُس شخص کی پیغمبری کو ثابت کر دے جس کے ہاتھ سے ظاہر ہوا ہے۔ حقیقی عجیب واقعہ، نیچر سے بالا ہوتا ہے نہ کہ اُس کا مخالف۔ وہ فطری قوانین کے روک دئے جانے سے ظاہر ہوتا ہے نہ کہ اُن کا توڑنے والا ۔ اُس سے نیچر کا زیادہ بلند نظام ظاہر کیا جاتا ہے جس کے تحت نیچر کا معمولی نظام ہوتا ہے۔ خود ہمارے اپنے ارادہ پر اگر ہم غور کریں تو اِن عجیب واقعات یا معجزات کی حقیقت سمجھ میں آجائیگی۔ ہم اپنے ارادہ سے ہاتھ اٹھا دیتے ہیں اور اس طرح قانونِ ثِقل کو روک دیتے ہیں۔ خدا، نیچر کی قوتوں پر مسلّط ہو جاتا ہے، اُن کی رہنمائی کرتا ہے، اُنہیں اپنی خواہش کے مطابق چلاتا ہے، کیونکہ

وہ اسی کی مشیئت کے تابع ہیں۔ ایسے کام صرف اللہ ہی کی طرف سے پیش آتے ہیں یا جنہیں اُس نے اِن کی اجازت دیدی ہے۔

"اگر ہم ہر چیز کی قدرت رکھنے والے خدا پر ایمان رکھتے ہیں تو ہمارے لیے عجائبات کے وقوع کو مان لینا مشکل نہیں ہے۔ سب سے پہلا عجیب واقعہ جو پیش آیا ہے، وہ ارادۂ الٰہی سے اِس کائنات کا عدم سے پیدا ہوجانا ہے۔ رہ گیے مسیح تو اُن کا اقنوم ایک عظیم الشان اخلاقی معجزہ ہے، اور آپ کے تمام عجائبات اِسی اقنوم اور اُس کے اعمال ظاہر کرنے کے لیے تھے۔ اگر ہم خدا کے معصوم بیٹے مسیح پر ایمان رکھتے ہیں تو ہمارے لیے اُس کے معجزوں کی تصدیق کچھ مشکل نہیں ہے۔ لیکن شیطان کے تمام عجائبات جھوٹے ہوتے ہیں۔

"عجائبات و معجزات، دین کی تائید کے لیے ضروری ہیں۔ مسیح نے اپنے معجزوں کے ذریعہ بارہا اپنے لاہوت کو اور مسیح ہونے کو ثابت کردیا ہے۔ وہ اپنے معجزے اِس لیے ظاہر کرتے تھے کہ اللہ کی بزرگی قائم ہو اور مخلوق کے روح و جسم کو فائدہ پہنچے۔ وہ اپنے معجزے دوستوں اور دشمنوں کے عام مجمعوں میں ظاہر کیا کرتے تھے۔ دشمن بھی اِن معجزوں سے انکار نہ کرسکے لیکن انہوں نے یہ کیا کہ بعلزبول[1] کی طرف اُنہیں

[1] یعنی شیطان کی طرف، انجیلوں نے شیطان کے ہاتھوں بھی عجائبات کا وقوع تسلیم کیا ہے، جیسا کہ اِس مصنف نے تصریح کی ہے۔

منسوب کر دیا۔ ہم چاہے خارجی شہادت سے اُن کی جانچ کریں یا خدا کی طرف سے پیغمبری کی مناسبت پر غور کریں، بہرحال ہر بے غرض انہیں ماننے پر مجبور ہو جائے گا۔ لیکن اگر اُن کے صحیح ہونے سے انکار کر دیا جائے تو پھر تسلیم کرنا پڑیگا کہ اُن کے ماننے والے جھوٹے تھے، حالانکہ اس بات کا تصوّر بھی مسیح اور اُن کے حواریوں کی نسبت نہیں کیا جا سکتا۔

"حواریوں کے زمانہ تک معجزات وعجائبات کی قدرت باقی تھی، لیکن جب دین مسیح عام ہو گیا تو اِس چیز کی ضرورت باقی نہ رہی[1]۔ اِس زمانہ میں ہمیں صرف اِس دین کے اخلاقی معجزوں کی ضرورت ہے جن کے ساتھ اُن کی صحت کی داخلی دلیلیں بھی ہوں۔ لیکن خدا کو قدرت حاصل ہے کہ جب چاہے معجزے ظاہر کرنا شروع کر دے۔"

اِس تفصیل کے بعد مؤلف نے سَدوم اور عَمورہ میں قوم لوط کی بربادی کے وقت سے یونان (یونس) کے مچھلی کے پیٹ میں چلے جانے تک عہد قدیم کے معجزوں کا نقشہ پیش کیا اور اُس میں ۶۷ معجزے شمار کیے ہیں۔ اِس کے بعد حمل کے وقت سے آسمان پر جانے تک مسیح کے معجزے گنائے ہیں اور وہ ۲۷ ہیں۔ پھر آپ کے حواریوں

(۱) یہ پروٹسٹنٹ لوگوں کا مذہب ہے۔ رومن کیتھولک فرقہ ہر زمانہ میں ایسے عجائبات کا وجود مانتا ہے۔

کے بیس معجزے شمار کیے ہیں اور لکھا ہے کہ بتسمہ دینے والے یوحنا کے معجزے کتاب مقدس میں درج نہیں ہوئے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ مسیح کے جو ۲۷ معجزے بیان کیے گیے ہیں، اُن میں بیماروں اور آسیب زدہ دیوانوں کا اچھا کرنا ہے۔ تین معجزے موت کے بعد مُردوں کا زندہ کر دینا ہے۔ اِس کے بعد جو معجزے باقی رہتے ہیں وہ خود حضرت کا حمل میں آنا، پانی کو شراب بنا دینا، بحرِ جلیل میں جال ڈالنا ایک مرتبہ پانچہزار اور دوسری مرتبہ چار ہزار آدمیوں کو پیٹ بھر کھلا دینا بانجھ انجیر کے درخت کو خشک کر دینا، پھر خود زندہ ہو جانا، مچھلی کا شکار کرنا اور آسمان پر چڑھ جانا ہے، ہم یہاں سب سے بڑے معجزے یعنی مُردوں کو زندہ کر دینے کی نسبت انجیلوں کی روایتوں اور معجزات کے منکروں کے اقوال کا خلاصہ درج کرتے ہیں؛

پہلا مُردہ، شہرِ نائین کا رہنے والا تھا۔ اُس کا جنازہ اٹھ چکا تھا اور اُس کی ماں رو رہی تھی۔ مسیح نے جنازہ روک کر کہا "اے جوان میں تجھ سے کہتا ہوں، اٹھ۔ وہ مردہ اٹھ بیٹھا اور بولنے لگا۔ اور اُس نے اُسے اُس کی ماں کو سونپ دیا۔ اور سب پر دہشت چھا گئی۔ اور وہ خدا کی بڑائی کر کے کہنے لگے کہ ایک بڑا نبی ہم میں اٹھا ہے۔ اور یہ کہ خدا نے اپنی امت پر توجہ کی ہے" (لوقا ۷: ۱۱-۱۶)

دوسری میت ایک لڑکی کی تھی۔ اُس کے باپ نے مسیح سے کہا اور وہ سردار تھا کہ "میری بیٹی ابھی مری ہے لیکن تو چل کر اپنا ہاتھ اُس پر رکھ تو وہ زندہ ہو جائیگی۔ اور جب یسوع سردار کے گھر میں آیا اور بانسلی بجانیوالوں کو اور بھیڑ کو غل مچاتے دیکھا۔ تو کہا ہٹ جاؤ کیونکہ لڑکی مری نہیں بلکہ سوتی ہے، وہ اُس پر ہنسنے لگے۔ مگر جب بھیڑ نکال دی گئی تو اُس نے اندر جا کر اُس کا ہاتھ پکڑا اور لڑکی اٹھی"۔ (متی ۹: ۱۸-۲۴)

عجائبات و معجزات کے منکر اس موقعہ پر کہتے ہیں کہ یہ نوجوان مرد اور عورت، دراصل مرے ہی نہیں تھے۔ ہر زمانہ میں ایسے واقعات ہوتے رہے ہیں کہ لوگ اپنے تابوتوں بلکہ قبروں تک سے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں حالانکہ لوگ اُنہیں مردہ سمجھ چکے تھے۔ یہی سبب ہے کہ مہذب حکومتیں اُسی وقت دفن کی اجازت دیتی ہیں جب مستند ڈاکٹر موت کی شہادت لکھ دیتا ہے۔ معجزوں پر ایمان رکھنے والوں کو تو اور بھی زیادہ یقین کرنا چاہیے کہ لڑکی مری نہیں تھی، کیونکہ خود مسیح علیہ السّلام نے صاف طور پر یہی کہا تھا۔

تیسرا واقعہ، آپ کے محبوب، لعزر کا ہے جو مر گیا تھا اور آپ کی چہیتی مریم کا بھائی تھا۔ وہ اپنے گاؤں "بیت عنیاہ" میں بیمار پڑا۔ اُس کی بہنوں نے یسوع کو کہلا بھیجا "اے خداوند، دیکھ، جسے تو عزیز رکھتا ہے

وہ بیمار ہے،، دو دن بعد حضرت وہاں گیے تو وہ چار دن پہلے ہی مر چکا تھا۔ مرتھا نے یسوع سے کہا "اے خداوند، اگر تو یہاں ہوتا تو میرا بھائی نہ مرتا" پھر اُس نے اپنی بہن مریم کو بلایا۔ مریم آپ کے قدموں پر گر گئی اور مرتھا نے جو کہا تھا وہی کہنے لگی۔ سب لوگ قبر پر میت کو رونے گیے تھے۔ جب یسوع نے مریم کو اور اُس کے ساتھ آنے والے یہودیوں کو روتے دیکھا تو اپنی "روح میں نہایت رنجیدہ ہوا اور گھبرا کر کہا تم نے اُسے کہاں رکھا ہے؟" لوگوں نے قبر بتا دی۔ آپ بھی رونے لگے۔ قبر، ایک غار میں تھی جس پر پتھر رکھا ہوا تھا۔ آپ نے پتھر ہٹانے کا حکم دیا اور وہ ہٹا دیا گیا۔ پھر یسوع نے آنکھیں اُٹھا کر کہا "اے باپ، میں تیرا شکر کرتا ہوں کہ تو نے میری سُن لی۔ اور مجھے تو معلوم تھا کہ تو ہمیشہ میری سنتا ہے مگر اِن لوگوں کے باعث جو آس پاس کھڑے ہیں، میں نے یہ کہا تاکہ وہ ایمان لائیں کہ تو ہی نے مجھے بھیجا ہے" یہ کہکر آپ نے بلند آواز سے پکارا "اے لعزر، نکل آ، جو مر گیا تھا وہ کفن سے ہاتھ پاؤں باندھے ہوئے نکل آیا اور اُس کا چہرہ رومال سے لپٹا ہوا تھا۔ یسوع نے اُن سے کہا اُسے کھول کر جانے دو" (انجیل یوحنا کے باب ۱۱۔ کا خلاصہ)

اس قصہ کے بارے میں معجزات کے منکر کہتے ہیں کہ اگر روایت کے لحاظ سے یہ صحیح ہو، تو یہ در اصل ایک سازش تھی جس میں مسیح،

اُن کا محبوب، اور محبوبہ تینوں شراکت تھے تاکہ یہودیوں کو اپنی نبوت کا یقین دلا دیں۔ یہ توجیہ میں نے ایک شامی پروٹسٹنٹ ڈاکٹر کی زبان سے سنی ہے۔ حاشا وکلّا حضرت مسیح علیہ السلام پر یہ شبہہ نہیں کیا جاسکتا لیکن میں نے اِسے یہاں یہ دکھانے کے لیے نقل کر دیا ہے کہ موجودہ زمانہ میں اِس قسم کی روائتیں مسیح کی نبوت بھی ثابت نہیں کرسکتیں، کجا اُن کی الوہیت۔ پھر اِن روایتوں سے اگر استدلال ہوسکتا ہے تو صرف نبوت پر، نہ کہ الوہیت پر جس کی یہ بذات خود نفی کر رہی ہیں، جیساکہ اُن لوگوں نے بھی سمجھا تھا جو اِن کے شاہد عینی تھے۔ پھر اِن واقعات کے لکھنے والوں کے پاس نہ کوئی سلسلۂ اسناد موجود ہے، نہ روایت میں ان کی معصومیت کی کوئی دلیل ملتی ہے۔ جو لوگ اِن واقعات کو مکر و فریب سے تعبیر کرتے ہیں، یا محض اتفاقات کا نتیجہ بتاتے ہیں، اُن سے اگر قطع نظر بھی کرلی جائے تو خود اِن واقعات کی روایت بھی کوئی وزن نہیں رکھتی۔

اگر سب سے بڑے معجزے یعنی مُردے زندہ کر دینے کے بارے میں اس قسم کی تاویلیں کی جاسکتی ہیں تو بیماروں کو اچھا کرنے اور آسیب اُتارنے کے معجزوں کی نسبت کیا کچھ نہیں کہا جاسکتا جبکہ ایسے ہی واقعات ہر زمانہ میں بکثرت پیش آتے رہتے ہیں۔ تمام طبیبوں کا فیصلہ ہے کہ جن بیماریوں کو لوگ آسیب کا اثر سمجھتے ہیں، وہ دراصل عصبی بیماریاں

ہوتی ہیں اور دوا، وہم، اور عقیدے کے ذریعہ اچھی ہو جاتی ہیں بزراب مچھلی اور انجیر کے معجزے تو اس سے بھی اُتر کر ہیں۔

محمدی معجزہ، علمی عقلی ہے

اِس کے مقابلہ میں محدثین نے کہیں متصل اسانید سے اور کہیں مُرسل طریقہ پر وہ کائناتی معجزے روایت کیے ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو سرفراز کیا تھا اور جن کی تعداد، انجیلوں کے روایت کردہ معجزوں سے کہیں زیادہ اور احتمالات سے بہت دور ہے۔ لیکن اِن معجزوں کو آپ نے نہ صحتِ دین کی دلیل قرار دیا نہ اُن کی روایت و تلقین ہی کا حکم دیا ہے۔

اور یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے محمدؐ کی نبوت و رسالت، علم و عقل کی بنیادوں پر استوار کی ہے اور اِنہی بنیادوں میں اُس کا ثبوت رکھا ہے کیونکہ انسان، سِنّ شعور کو پہنچنے لگا تھا، اور اُس میں وہ فکری استقلال پیدا ہونے لگا تھا جس کی موجودگی میں عقل ایسے لوگوں کی پیروی نہیں کرتی جو فطری قوانین کے خلاف عجیب واقعات دکھایا کرتے ہیں۔ انسان کی ترقی اِس قسم کی چیزوں سے بڑھتی نہیں بلکہ رُکتی ہے، اِسی لئے خاتم النبیین کی نبوت کی اصلی حجت وہی چیز قرار دیدی گئی ہے جو اُس کی نبوت کا اصلی موضوع ہے، اور وہ آپ کی کتاب ہے جو اپنی ہدایت، علوم، اور

لفظی و معنوی اعجاز میں تمام انسانوں کے لیے معجزہ بنی ہوئی ہے (جیسا کہ ہم سورۂ بقرہ کی تفسیر میں بیان کر چکے ہیں) اور یہ اس لیے کہ اِس فکری استقلال میں انسان کی تربیت کرے اور اُسے اُس کمال تک پہنچائے جس کی قابلیت اُس میں خدا نے رکھ دی ہے۔

یہی وہ فیصلہ کن فرق ہے جو گزشتہ خاص نبوتوں، اور عام دائمی نبوت میں موجود ہے۔ اِسی بات کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح بیان فرمایا ہے "کوئی نبی نہیں جسے خدا نے نشانیاں نہ دی ہوں جن کے تناسب سے لوگ اُس پر ایمان لائے۔ لیکن مجھے جو نشانی دی گئی ہے، وہ وحی ہے جو مجھ پر آیا کرتی ہے۔ مجھے امید ہے کہ قیامت کے دن سب نبیوں سے زیادہ پیرو میرے ہی نکلیں گے" (حدیث ابی ہریرہؓ متفق علیہ)

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں ہمیں بتایا ہے کہ مشرکوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کائناتی نشانیوں کا مطالبہ کیا تھا۔ اِس کے جواب میں آپ نے قرآن کو بحیثیت مجموعی پیش کیا اور گزشتہ پیغمبروں اور آسمانی کتابوں کی خبروں کو بھی سنایا جن سے نہ خود آپ واقف تھے نہ آپ کی قوم واقف تھی۔ نیز اپنی کتاب کی ہدایت، علوم، اور اُس کی نظیر لانے سے تمام دنیا کا عجز ثابت کر کے سب لوگوں پر حجت قائم کر دی:

قُلْ لَئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ، لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا (۱۷ : ۸۸)	اے پیغمبر، آپ کہہ دیجئے کہ اگر انسان اور جنات سب جمع ہو کر بھی اِس قرآن جیسی چیز لانا چاہیں، تو ہرگز لا نہ سکیں گے اگرچہ باہم ایک دوسرے کے معین و مددگار رہوں

رہ گئیں کائناتی نشانیاں جو اللہ نے آپ کو مرحمت فرمائی تھیں تو اِس لیے نہ تھیں کہ آپ کی نبوت و رسالت کی حجت بنیں بلکہ شدائد و مصائب میں وہ اللہ کی طرف سے آپ کے لیے اور آپ کے اصحاب کے لیے رحمت وعنایت تھیں، چنانچہ برسر فساد کافروں پر خدا نے انہیں فتحیاب کیا، حالانکہ وہ تعداد میں، طیاری میں، ہتیار اور سامان رسد میں مسلمانوں سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھے۔ غزوۂ بدر اور اس میں مومنین کی فتحمندی کی مثال ہی کافی ہے۔ پھر غزوۂ احزاب (جنگ خندق) کو دیکھو جس میں بت پرست اور یہودی ایکا کر کے مسلمانوں پر چڑھ آئے تھے اور مدینہ کو گھیر لیا تھا لیکن خدا نے بغیر کسی جنگ کے دشمنوں کو بے مراد واپس کر دیا۔

حضرت مسیح کی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نشانیوں میں بھی بیماروں کو اچھا کرنا، اندھوں کو بینائی بخشنا، اور غزوۂ خندق و غزوۂ تبوک میں تھوڑے سے کھانے سے بہت آدمیوں کو سیر کر دینے

کے واقعات موجود ہیں۔ اسی قبیل سے یہ واقعہ ہے کہ بدر میں خدا نے مسلمانوں کے لیے اَبر کو مسخر کر دیا تھا، چنانچہ وہ خوب سیراب ہوئے اور ریگ بھیگ جانے کی وجہ سے اُن کے قدم دھنسنے سے محفوظ رہے، مگر مشرکوں کو اِس ابر سے ایک بوند بھی نصیب نہ ہوئی۔ اِسی طرح غزوۂ تبوک میں ہوا کہ فوج کا پانی ختم ہوگیا تھا۔ صحرائی مقام تھا اور گرمی سخت تھی۔ اونٹ بھی کم تھے۔ مجاہدین اُنہی کو ذبح کرتے اور اُن کے پیٹ سے پانی نکال کر پیتے تھے، مگر اُن میں بھی حلق تر کرنے کے لیے پانی نہ نکلتا تھا۔ یہ دیکھکر حضرت ابوبکر نے عرض کیا یارسول اللہ، اللہ نے آپ کی دعا میں بھلائی رکھ دی ہے، ہمارے لیے دعا فرمائیے۔ آپ نے دونوں ہاتھ اٹھا دیے اور دعا کرنے لگے۔ ابھی ہاتھ ہٹانے نہیں پائے تھے کہ مینھ برسنا شروع ہوگیا اور سب نے اپنی مشکیں بھرلیں۔ لیکن مسلمانوں کے پڑاؤ سے آگے کہیں بارش نہ تھی!

افراد و اقوام پر عجائبات کا اثر

پیغمبروں کی نشانیاں یا معجزے اُن جھگڑالو منکروں پر حجت تھے جو اپنی ہٹ دھرمی کی وجہ سے دنیا و آخرت میں عذاب الٰہی کے مستحق بن گیے۔ اِن معجزوں کے دیکھنے والوں میں سے صرف وہی لوگ ایمان لائے جو اُن پر ایمان لانے کی قابلیت رکھتے تھے۔ چنانچہ فرعون اور اُس

کی قوم، حضرت موسیٰ کے معجزوں پر ایمان نہ لائی۔ اکثر بنی اسرائیل بھی اِن معجزوں کو سمجھ نہ سکے اور گائے کے بچھڑے کی پوجا کرنے لگے۔ خود حضرت مسیح کے بارے میں یہودیوں نے کہا کہ اگر وہ شیاطین کے سردار نہ ہوتے تو انسان سے شیطان کو باہر نکال نہ سکتے۔ کہنے لگے کہ ابلیس یا بعلز بول، مسیح سے بڑے معجزے دکھاتا ہے! چنانچہ اکثر یہودی آپ پر ایمان نہ لائے۔ اِسی طرح اسلام کے زمانہ میں منافقوں نے دیکھا کہ ابر کا ایک ٹکڑا آیا اور نبی صلعم کی دعا کے وقت سخت گرمی میں صرف مسلمانوں کے لشکر کو سیراب کر گیا، تو یہ دیکھ چکنے کے بعد بھی کہنے لگے "دعا سے نہیں بلکہ بچھتّر کی وجہ سے پانی برسا ہے!"

اِن نشانیوں اور معجزوں پر اکثر ایمان لانے والوں کی گردنیں اُن کے آگے اِس لیے جھک گئی تھیں کہ وہ اِن باتوں کا کوئی سبب نہ جانتے تھے، چنانچہ فرض کر لیا کہ ایسی نشانیاں لانے والے اگر خود خالق نہیں ہیں تو اُس کے مَظہر ضرور ہیں۔ جتنوں نے یہ معجزے تسلیم کیے اُن سے کہیں زیادہ وہ لوگ تھے جو اُنہی جیسی عقیدت جادوگروں، شعبدہ بازوں، اور دجّالوں سے رکھتے تھے اور اب تک رکھتے ہیں۔

مسیح علیہ السّلام سے روایت ہے کہ جھوٹے مسیح اور جھوٹے نبی اٹھ کھڑے ہونگے اور ایسے بڑے نشان اور عجیب کام دکھائیں گے کہ اگر

ممکن ہو تو برگزیدوں کو بھی گمراہ کرلیں" (متی ۲۴ : ۲۴) کتاب مقدس کی لغت میں ان جھوٹے مسیحوں کے بہت سے نام گنائے گیے ہیں۔ میں کہتا ہوں، انہی میں وہ قادیانی بھی ہے جو مسلمانان ہند میں ظاہر ہوا تھا۔ نیز اخباروں میں ایک اور ہندوستانی کے ظہور کا بھی ذکر کیا گیا ہے جو اپنے عجائبات اِسی سال امریکا میں ظاہر کرنا چاہتا ہے۔ نیز مسیح کا یہ قول بھی روایت کیا گیا ہے کہ "میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ ہر نبی اپنے وطن میں مقبول نہیں ہوتا" اور مسیح نے سچے نبی کی پہچان یہ بتائی ہے کہ اُس کی نشانیوں اور معجزوں سے نہیں بلکہ انسانوں میں اُس کی ہدایت کے نتیجہ سے اُسے پہچانو گے۔ چنانچہ فرمایا "اُن کے پھل سے اُنہیں پہچانو گے" اور معلوم ہے کہ مسیح سے پہلے اور ان کے بعد کوئی ایسا نبی ظاہر نہیں ہوا، انسانیت کی رہنمائی میں جس کے اچھے پھل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے جیسے ہوں۔ نیز کوئی ایسا شخص بھی ظاہر نہیں ہوا جس پر یوحنا کی انجیل کی یہ عبارت صادق آتی ہو "مجھے تم سے اور بہت سی باتیں کہنی ہیں۔ مگر اب تم اُن کی برداشت نہیں کرسکتے، لیکن جب وہ فارقلیط یعنی سچائی کا روح آئیگا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھا دے گا" (یوحنا ۱۶ : ۲۱) ظاہر ہے کہ مسیح کے بعد کوئی نبی نہیں آیا جس نے پورے پورے حق کی طرف کی رہنمائی کی ہو، مگر ہاں وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جنہوں نے دین، توحید، تشریع

حکمت، ادب سب میں پورا پورا حق دنیا کو دکھا دیا ہے۔

تاریخ اقوام پر نظر رکھنے والے جانتے ہیں کہ آسمانی ادیان کے حلقہ بگوشوں سے زیادہ بت پرست لوگ اِس قسم کے عجائبات پر بھروسہ واعتماد رکھتے ہیں۔ پھر یہ سب لوگ اپنے اپنے بزرگوں کی عجیب عجیب باتیں اس قدر کثرت سے بیان کرتے ہیں کہ پیغمبروں کی بھی اُتنی بیان نہیں کی گئی ہیں، اور یہ کہ اِن عجائبات پر اکثر یقین کرنے والے، خرافاتی لوگ ہی ہوتے ہیں۔

محمد کی نبوت خود ثابت ہے اور دوسری نبوتونکو ثابت کرنیوالی ہے

غرضکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت بذات خود ثابت ہے۔ کائناتی نشانیوں اور معجزوں سے نہیں بلکہ ناقابل شک علمی عقلی دلیل وبرہان سے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا ثبوت، تمام عقلوں اور حواسوں کے لیے ہر زمانہ میں قائم ونمایاں ہے۔ پچھلے پیغمبروں کی نشانیاں اور معجزے ثابت ہی نہیں ہوسکتے جب تک محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور آپ کے لائے ہوئے اِس قرآن کو مان نہ لیا جائے۔ علم اور آزاد خیالی کے موجودہ زمانہ میں پچھلے نبیوں کے معجزوں کا ثبوت صرف یہی ہوسکتا ہے کہ قرآن اُن کی شہادت دے، کیونکہ جن کتابوں میں یہ معجزے لکھے گیے ہیں، خود اُنہیں بھی ثابت نہیں کیا جاسکتا کہ اپنے مصنفوں ہی

کی کتابیں ہیں۔ کیونکہ جن زبانوں میں یہ کتابیں لکھی گئی تھیں، اب اُن میں اُن کی کوئی ایک جلد بھی موجود نہیں ہے۔ نیز یہ بھی ثابت نہیں کیا جاسکتا کہ اِن کے مصنفؔ جن میں باہم بہت اختلاف و تناقض ہے، غلطی سے معصوم تھے۔ نیز اِن کے ترجموں کی صحت کا بھی کوئی ثبوت موجود نہیں ہے جیسا کہ ہم اوپر کہہ چکے اور بارہا تفصیل سے بیان کرچکے ہیں۔

دنیا میں صرف ایک ہی کتاب ایسی موجود ہے جو تَواتُر سے حرفاً حرفاً اپنے لانے والے کی طرف سے حفظ و تحریر، دونوں طریقوں سے نقل ہوتی چلی آئی ہے، اور وہ قرآن ہے۔ اور صرف ایک ہی پیغمبر ایسا ہے جس کی تاریخ متصل اسانید کے ساتھ حفظ و تحریر دونوں طریقوں سے روایت ہوتی چلی آئی ہے، اور وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ پس صرف ایک اکیلا دین جسے آزاد خیال علماء سمجھ سکتے اور جس کی بنیاد پر فیصلہ کرسکتے ہیں، اسلام ہے۔ پچھلے دینوں کی نسبت زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ قدیم تہذیب کی تمام قوموں میں ایسے لوگ پیدا ہوتے رہے ہیں جو عبادت الٰہی اور عمل صالح کی طرف دعوت دیتے تھے۔ شر اور بداخلاقی سے روکتے تھے، اِن میں بعض انبیاء تھے جو اللہ کے پیغام پہنچاتے تھے۔ اور ایسے حکماء بھی تھے جو عقل و تجربہ کی بناپر لوگوں کو اچھائیوں کی طرف بلاتے اور برائیوں سے منع کرتے تھے

اور یہ کہ اِن دونوں گروہوں کی نسبت جو کچھ روایت کیا گیا ہے، اُس میں خلافِ عقل باتیں بھی ہیں جن سے کسی کو فائدہ نہیں پہنچا، اور ایسی باتیں بھی ہیں جو اُن کے زمانہ کے لیے خاص ہیں، اور خرافات بھی ہیں جنہیں عقل کسی طرح باور نہیں کر سکتی۔

چونکہ اسلام اور پیغمبرِ اسلام کی ذات ہی ایسی ہے کہ اُس کی حقیقت و تاریخ بہ تفصیل معلوم ہے، اس لیے ہم یہاں مادّی علماء فرنگ اور اُن کے مقلدّوں کا ایک شبہہ درج کرتے ہیں، لیکن اُس کی تردید سے پہلے بہتر ہے کہ اجمالی طور پر اُن کی شہادت بھی درج کر دیں جو انہوں نے اِس بارے میں دی ہے:

علماءِ فرنگ اور سیرت محمدی

علماءِ فرنگ نے اپنے طریقۂ نقد و تحلیل کے مطابق قبل از اسلام کی تاریخِ عرب دیکھی۔ سیرت محمدی کا مطالعہ کیا اُس کی چھان بنان کی، اُسے اپنے دستور کی بموجب طرح طرح کے رنگوں سے رنگا۔ قرآن اُس کی اپنی زبان میں بھی پڑھا، ترجمہ بھی پڑھا جو اُنہی کے ہم قوموں نے کیا تھا۔ عہد قدیم و جدید، تاریخ مذاہب و ادیان، خصوصاً یہودیت و عیسائیت کا بھی پورا علم اُنہیں حاصل تھا، نیز کلیسا کے متعصب مصنفوں نے اسلام پر جتنی تہمتیں تراشی ہیں، اُن کی بھی اُنہیں خبر تھی۔ اپنے

اس تمام مطالعہ کے بعد وہ حسب ذیل نتیجہ پر پہنچے :

"محمدؐ، سلیم الفطرت تھے۔ اُن کی عقل کامل تھی۔ اعلیٰ اخلاق رکھتے تھے۔ سچے تھے۔ خوددار و بلند نفس تھے۔ تھوڑے رزق پر بھی قانع تھے۔ نہ دولت کی طمع تھی نہ اپنی سلطنت قائم کرنا چاہتے تھے۔ اُن کی قوم میں فخر و مباہات کی جو عادت تھی، اُس سے خود دور تھے۔ بلند پایہ تقریروں اور شعر و شاعری کا انہیں چسکا نہ تھا۔ اپنی قوم کے شرک، خرافات، بُت پرستی سے بیزار تھے۔ بہیمی خواہشوں میں لوگوں کے انہماک کی تحقیر کرتے تھے۔ شراب خواری، قمار بازی، ناجائز طریقہ پر لوگوں کا مال کھانا سخت برا سمجھتے تھے۔ آپ کے اِن حالات اور اپنی نبوت پر آپ کے یقین کو دیکھکر اِن لوگوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ چالیس سال کی عمر میں آپ اپنے اِس دعوے میں سچے تھے کہ آپ نے وحی کے فرشتہ کو دیکھا۔ اُس سے قرآن پڑھا، اور یہ کہ آپ اپنی قوم اور تمام دنیا کی ہدایت کے لیے خدا کے پیغمبر ہیں"

آپ کی صداقت کا اِن علماء فرنگ کو اس لیے اور بھی زیادہ یقین ہو گیا کہ آپ پر ایمان لانیوالوں اور آپ کی نبوت سے ہدایت پانیوالوں میں پیش پیش وہ لوگ تھے جو آپ کی اندرونی زندگی کے سب سے زیادہ جاننے والے تھے۔ چنانچہ اِن میں سب سے پہلی آپ کی زوجۂ مطہرہ حضرت خدیجہ تھیں جو اپنی دانائی، بلند نفسی، اور پاک باطنی میں مشہور تھیں۔ اور آپ کے غلام، زید بن حارثہ تھے جنہوں نے آپ کی غلامی منظور کی مگر اپنے باپ اور خاندان کے ساتھ جاکر آزادی منظور نہیں کی۔ پھر آپ پر سب سے پہلے ایمان لانے والے وہ لوگ تھے جو آزادی و آزاد خیالی میں تمام عربوں سے آگے تھے، خصوصاً ابو بکرؓ اور عمرؓ جیسے لوگ۔

اِن علماء فرنگ میں جو لوگ اللہ پر، اُس کے فرشتوں پر، اور اِس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ انسانی روح لازوال ہے، تو وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر بھی علم و دلیل کے ساتھ ایمان لے آتے ہیں اور جس قدر انہیں اسلام کی معرفت حاصل ہوتی جاتی ہے، اُسی قدر اُن کی تعداد بھی سال بسال زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ لیکن مادّی علماء مجبور تھے کہ اِس ناقابل انکار واقعہ کی کوئی ایسی تفسیر و توجیہہ کریں اور اس کی ایسی علمی تصویر اتاریں جسے وہ عقلیں مان لیں جو مادّہ یا نیچر کے پرے کسی عالم غیب کو ماننے کے لیے آمادہ نہیں ہیں۔

چنانچہ انہوں نے اپنے ذہن کے چقماق کو رگڑنا شروع کیا اور اپنے فلسفی نظریوں کو گرمی دینے لگے، یہاں تک کہ جب ذرا روشنی پیدا ہوئی تو اُنہوں نے اُس کے دھندھلے نور میں وہ خیالی صورت دیکھی جسے پروفیسر مونتیہ نے اجمال کے ساتھ (جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں) اور امیل درمنگم نے تفصیل کے ساتھ لکھا ہے اور جس کی تشریح ہم یہاں کرنا چاہتے ہیں۔

عالمِ غیب کے منکروں کا شبہہ
محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت وہ کس رنگ میں پیش کرتے ہیں؟

اِن مادّیوں کے خیالات کا خلاصہ یہ ہے کہ وحی، ایک الہام ہے جو خود پیغمبر کے نفس سے پیدا ہوتا ہے نہ کہیں باہر سے۔ اور یہ اس طرح کہ پیغمبر کا بلند نفس، پاک باطن، اللہ پر اُس کا پختہ ایمان، عبادت کی ضرورت پر اُس کا قطعی یقین، ماسوا اللہ اور بت پرستی سے اُس کی نفرت، موروثی عقائد سے اُس کی بیزاری، اِن سب چیزوں کا اثر یہ ہوتا ہے کہ اُس کے ذہن وعقل میں قسم قسم کے خواب اور روحانی احوال پیدا ہوجاتے ہیں، اور جس بات کو وہ ضروری سمجھتا ہے، اُسے براہ راست آسمان پر سے نازل ہونے والا خدائی فرمان یقین کرنے لگتا ہے، یا ایسا ہوتا ہے کہ اپنے سامنے کوئی وجود مجسّم دیکھتا ہے جو اُسے تلقین کرتا ہے اور

یہ پیغمبر اُسے عالمِ غیب کا فرشتہ خیال کر لیتا ہے۔ وہ اپنے اعتقاد کے مطابق جاگتے میں بھی وہی دیکھنے اور سننے لگتا ہے جو سوتے میں دیکھتا اور سنتا ہے۔ یہ آخر اللہ کر معاملہ ہر پیغمبر کو پیش آتا ہے، اور پیغمبر اپنی وحی کی نسبت جو کچھ دعویٰ کرتا ہے، اُس کے خیال کے مطابق صحیح ہوتا ہے۔

مادّی لوگ کہتے ہیں "ہم محمدؐ کی سچائی میں شک نہیں کرتے۔ اُنہوں نے جو کچھ سننے اور دیکھنے کا دعویٰ کیا ہے، اُن کے خیال میں صحیح تھا۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اِس چیز کا سرچشمہ خود اُن کے اپنے اندر موجود تھا۔ اِس عالمِ مادہ کے پرے عالمِ غیب سے کوئی چیز اُن پر نازل نہیں ہوئی تھی۔ اِس طرح کی کوئی چیز ہمارے ہاں ثابت نہیں ہے۔ نیز اِس کے بطلان کی بھی کوئی دلیل ہمارے پاس نہیں ہے۔ اِسی لیے ہم غیر معمولی مظاہر کی وہی تفسیر کر سکتے ہیں جسے ہم جانتے ہیں۔ ہم کوئی ایسی بات کیونکر کہہ سکتے ہیں جسے جانتے ہی نہیں ؟"

پیغمبروں کی وحی کے مقابلہ میں وہ فرانسیسی دوشیزہ جان آف آرک کا قصہ پیش کرتے ہیں، جسے رومن کیتھولک چرچ نے اُس کی موت کے بہت زمانہ بعد ولی اللہ قرار دیدیا ہے۔ معاملۂ وحی کی تصویر مادّی علماء نے کھینچی ہے، اُس سے بہت سے شکّی اور اِنہی مادّیوں کے مقلّد مسلمانوں میں بھی شبہہ پیدا ہوگیا ہے۔ اِس خیالی تصویر کو بے پردہ کرنے

کے لیے میں پہلے جان آف آرک پر کچھ گفتگو کرتا ہوں۔ اس بارے میں میرے پاس ایک مسئلہ پہنچا تھا جسے میں نے جواب کے ساتھ "المنار" جلد ۶ صفحہ ۸۸۷ (۱۳۲۱ھ) میں شایع کیا ہے اور وہ حسب ذیل ہے:

وحی پر ایک شبہہ

سائل لکھتا ہے "وحی کے بارے میں چند شبہات میرے دل میں پیدا ہو گیے (حالانکہ وحی، دین کی بنیاد ہے) چنانچہ میں نے شیخ محمد عبدہ کے رسالۂ توحید کی طرف رجوع کیا اور اُس کے دو باب "وحی کی ضرورت" اور "وحی کا امکان" پڑھے۔ میں نے گفتگو اچھی اور معقول پائی، لیکن کسی چیز کی ضرورت ہونے سے لازم نہیں آتا کہ وہ چیز پیش بھی آجائے۔ اسی طرح عقلاً اُس کے ممکن ہونے اور محال نہ ہونے سے اُس کا واقع ہو جانا بھی ضروری نہیں ہے۔ پھر یہ بتایا گیا ہے کہ نبیؐ کی حالت کیسی تھی۔ اپنی قوم میں آپ کی روش کیا تھی۔ آپ نے کیسے بڑے بڑے کارنامے دکھائے ہیں، اور لوگوں کو آپ کے ذریعہ کتنے بہت فوائد پہنچے ہیں، لہذا آپ کا پیغمبر ہونا بھی یقینی ہے۔ یہ استدلال کوئی وزن نہیں رکھتا۔ کیونکہ ہو سکتا ہے نبوت کے مدعی میں یہ تمام باتیں موجود ہوں وہ اپنے آپ کو سچا بھی سمجھتا ہو، اُس کے ذریعہ اس کی قوم کو عروج بھی حاصل ہوا ہو، مگر اس سے لازم نہیں آتا کہ حقیقت میں بھی وہ پیغمبر

ہی ہو۔

"پندرہویں صدی عیسوی میں جب فرانس انگریزوں سے مغلوب ہوچکا تھا، تو وہاں ایک لڑکی "جان آف آرک" ظاہر ہوئی۔ یہ نہایت نیک نفس اور پاک باطن تھی۔ اپنے خاندان میں رہتی تھی اور سیاسی معاملات سے دور تھی، مگر اُسے دفعتاً یقین ہوگیا کہ خدا نے اُسے وطن کی آزادی اور دشمن کی پامالی کے لیے بھیجا ہے۔ چنانچہ وحی کی صدائیں سننے لگی، اور جنگ کے لیے مخلصانہ دعوت دینے لگی۔ اپنے سچے ارادے کی بدولت وہ ایک چھوٹی سی فوج کی سپہ سالار بھی بن گئی اور اسی فوج سے اُس نے دشمن کو شکست دیدی۔ پھر اِس فتحمندی کے بعد خود اپنوں کی بے وفائی کے سبب اُسے شکست ہوگئی۔ دشمن نے قید کرلیا اور آگ میں زندہ جلا ڈالا۔ اِس طرح اس لڑکی نے تاریخ میں لازوال نام پیدا کرلیا جو آج تک اپنی قوم کے احتراموں اور تکریموں کا مرکز بنا ہوا ہے۔ اِسی کے بعد فرانس میں بیداری پھیلی اور علم و ترقی میں وہ بہت دور نکل گیا۔

"تو کیا اِس واقعہ کی بنا پر ہم تسلیم کرلیں کہ یہ لڑکی، خدا کی طرف سے پیغمبر ہوکر آئی تھی؟ ممکن ہے آپ کہیں کہ اِس لڑکی کا کارنامہ، پیغمبروں کے کارناموں کے سامنے کچھ بھی نہیں ہے، لیکن کیا ہمارے پاس کوئی ایسی

ترازو موجود ہے جس سے مفید کارنامے تولے جا سکیں اور کہا جا سکے کہ یہ لڑکی اُس درجہ تک پہنچی تھی یا نہیں جس میں کسی کا دعویٰ تسلیم کر لینا ضروری ہو جاتا ہے؟ فرض کیجئے کہ اتفاقات نے ایک شخص کا ساتھ دیا اور وہ اپنے عمل کے لحاظ سے بہت فائدہ مند اور اثر کے لحاظ سے بہت پائیدار ہو گیا، پھر کسی وہم کی وجہ سے اُس نے اپنے آپ کو پیغمبر بھی قرار دے لیا، تو کیا ہمارے لیے ضروری ہو جائے گا کہ اُس کی پیغمبری پر یقین کر لیں؟

”میں سمجھتا ہوں کہ اِن باتوں سے ترجیح کا پہلو تو نکل سکتا ہے۔ مگر یقین ہرگز پیدا نہیں ہوتا۔ میری آرزو ہے کہ میں غلطی پر نکلوں اور آپ مجھے قائل کر دیں۔ میں جانتا ہوں کہ بہت سے مسلمانوں کا بھی وہی خیال ہے جو میں ظاہر کر چکا ہوں، لیکن وہ اسے خوف سے ظاہر نہیں کرتے، مگر میں سوال کرنے میں کوئی ذلت نہیں سمجھتا، کیونکہ ہر عقل کو ٹھوکر لگ سکتی ہے۔“

”المنار“ کا جواب

ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہے کہ اگرچہ شبہہ، سائل کے ذہن میں جم چکا ہے، لیکن اُس نے اُس کے سامنے ہتھیار رکھ دینا منظور نہیں کیا تاکہ دین کی سرحدوں سے نکل کر خواہشوں کے دلدل میں پڑ جائے

جہاں روحوں کے ساتھ جسم بھی بگڑ جاتے ہیں، بلکہ سائل نے دین کے فطری شعور کی پیروی کی اور کتابوں اور لوگوں سے جانچ کرنے پر آمادہ ہوگیا۔ بہت لوگوں کا حال یہ ہے کہ جونہی ایک ذرا سا شبہہ پیدا ہوا اور دین سے پھر گیے۔ کیونکہ یہ لوگ لذتوں سے بہرہ اندوز ہونے کے خوگر بن چکے ہیں اور دین کو اپنی خواہشوں کی راہ میں روک پاتے ہیں، لہذا وہ اُس کے فطری شعور کو اُسی طرح قتل کر ڈالنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں جس طرح جہل، اُس کی کسبی دلیل و برہان کو قتل کر چکا ہے۔

سائل نے رسالۂ توحید کے مقدّمات تو اچھی طرح سمجھے ہیں، لیکن اُس کے مقاصد و نتائج میں باریک بینی سے کام نہیں لیا، اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ وہ مقدمات کو تسلیم کرتا ہے مگر نتیجہ کو نہیں مانتا، حالانکہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ اگر سائل پھر اِس رسالہ کے باب "نبوت کی ضرورت" کو بغور پڑھے اور اللہ پر ایمان کے ساتھ یہ بھی مانتا ہوں کہ اُس ذات برتر نے یہ کائنات، حکمتِ بالغہ اور کامل نظام پر استوار کی ہے تو امید ہے اُسے ضرور اطمینان حاصل ہو جائے گا۔ پھر میں سوال کے مضمون سے سمجھتا ہوں کہ اُس نے اس رسالہ کی بحث "وحی و رسالت کا وقوع" نہیں دیکھی یا دیکھی ہے، مگر سمجھی نہیں، کیونکہ اُس نے خود رسالت کی دلیل کا حوالہ دیکر اپنا شبہہ ظاہر نہیں کیا، بلکہ مقدمات کے اجزا میں سے ایک جزو

پہ اُسے قائم کر لیا ہے۔ اُس کا شبہہ دراصل پیغمبروں کی بعض صفات ہی سے متعلق ہے۔ میں پہلے اسی شبہہ کو دور کیے دیتا اور بتائے دیتا ہوں کہ وہ برمحل نہیں ہے۔ اِس کے بعد اصلی موضوع پر اظہار رائے کرونگا۔

جس جان آف آرک کی وجہ سے سائل کو پیغمبروں کی وحی پر شبہہ ہوا ہے اُس نے کبھی نہ کسی دین کی دعوت دی نہ کسی مذہب کی، اُس نے انبیاء کی طرح کبھی نہیں کہا کہ میں ایسی دعوت لائی ہوں جو انسان کو دونوں زندگیوں میں خوش نصیبی بخشتی ہے۔ وہ کوئی کائناتی یا علمی نشانی بھی ایسی نہیں لائی جو انسان کی قدرت سے باہر ہو اور جس کے ذریعے چیلنج دیکر اُس نے لوگوں کو اپنے ایمان کی طرف بلایا ہو۔ جان آف آرک دراصل شریف ضمیر رکھتی تھی۔ دینی احساس اور سیاسی جوشش نے اُسے برانگیختہ کیا اور وہ برانگیختہ ہو گئی۔ حکومت نے اُس کی مدد کی۔ قوم بھی ذلت سے نکلنے کے لیے بے قرار تھی۔ اِن حالات نے اُس کی مدد کی، اور جس دینی جوش نے اُسے کھڑا کیا تھا اُسی نے اُسے دشمن پر فتحیاب کر دیا۔ فرانس کے باشندوں کو جوش دلانا جس قدر آسان ہے، سب جانتے ہیں۔ نپولین اُنہیں موت کے منھ میں ڈھکیلتا تھا اور وہ گر پڑتے تھے کیونکر؟ صرف ایک شاعرانہ جذباتی بات کہکر، ویسی بات جیسی اُس نے اہرام مصر کے سامنے کہی تھی۔

میں دانشمند سائل سے کہنا چاہتا ہوں کہ اُس نے جان آف ارک کو سیاسیات سے دور دکھا کر غلطی کی ہے۔ "بُستانی" کی عربی انسائیکلوپیڈیا میں اُس کا حال اِس طرح لکھا ہے:۔

"جان آف ارک، گھر کے باہر کام کاج کرنے کی عادی تھی۔ مویشی چراتی تھی۔ چشمہ تک گھوڑے پر سوار جاتی اور لوٹ آتی تھی"۔ "ڈومر" (یعنی اُس کے گاؤں) کے اطراف میں لوگ خرافات کے قائل اور فرانس کو برباد کرنیوالے اختلافات میں "اور لیان پارٹی" کے طرفدار تھے۔ جان، سیاسی ہیجان اور مذہبی جوش میں اُن کی شریک تھی۔ تخیّل اور پارسائی اُس میں بہت تھی۔ کنواری مریم کے قصوں، خصوصاً اُس پیشین گوئی پر بہت غور کیا کرتی تھی جو اُس زمانہ میں پھیلی ہوئی تھی، یعنی کسی کنواری لڑکی کے ہاتھوں فرانس اپنے دشمنوں سے نجات پائیگا۔ جب اُس کی عمر تیرہ برس کی ہوئی تو مافوق الطبیعۃ ظہورات پر اعتقاد رکھتی، طرح طرح کی آوازیں سنتی، اور خواب دیکھتی تھی۔ پھر چند سال بعد اُسے خیال پیدا ہوگیا کہ وہ اِس کام پر مقرر کردی گئی ہے کہ اپنے ملک کو نجات دلائے اور بادشاہ کو تاج پہنادے۔ پھر جب خود اُس کے گاؤں پر بھی دشمن نے دست درازی کی تو اُسے اپنے اِس خیال کا اور زیادہ یقین ہوگیا"

اِس کے بعد لکھا ہے کہ کس طرح اُس نے حکّام کی خوشامدیں کیں

یہاں تک کہ شاہی فوج کی کمان دار بن گئی جس کی تعداد دس ہزار تھی اور جس کے افسر شاہ پسند تھے۔ پھر اُس نے انگریزوں پر حملہ کیا جو ۱۴۲۹ء میں اورلیان کا محاصرہ کیے ہوئے تھے اور انہیں شکست دیدی۔ لیکن اِس فتح کے بعد اُس کے پرجوش خیالات دور ہو گیے، چنانچہ ایک ہی سال (سنہ ۱۴۳۰ء) میں انگریزوں نے اس پر حملہ کیا اور وہ مغلوب و زخمی ہو کر قید ہو گئی۔

اِس خلاصہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ جان کا معاملہ اِس کے سوا کچھ نہ تھا کہ ایک عصبی ہیجان اُس پر طاری ہو گیا تھا، جو اُس سیاسی صورت حال سے رنج و خفگی کا نتیجہ تھا جس سے اُس کی قوم کے سب ہی لوگ اُس زمانہ میں متاثر تھے۔ یہ چیز کوئی نئی نہیں ہے بلکہ ایسے واقعات پیش آتے رہتے ہیں اور اُن کا سبب بھی معلوم ہے۔ ایسے ہی عصبی مزاج کے وہ لوگ بھی ہوتے ہیں جو مہدی منتظَر کے نام سے اٹھا کرتے ہیں مثلاً محمد احمد سودانی اور محمد علی باب (اِسی طرح بہا، اور قادیانی بھی) بلکہ "جان" کے معاملہ میں اِن دونوں شخصوں کے معاملہ سے بھی کم شبہ پیش آتا ہے۔ اگرچہ اِن دونوں کے اور "جان" کے اٹھنے کے اسباب باہم ملتے جلتے ہیں، لیکن یہ دونوں پھر بھی ایک خاص چیز کی طرف دعوت دیتے اور اُسے اصلاح بتاتے تھے اگرچہ وہ (جھوٹی) تھی۔

کہاں یہ نبوت جس کا زمانہ بہت کم ہوا، جس کا سبب مشہور و معروف ہے، جس میں نہ علم کی طرف کوئی دعوت تھی نہ اجتماعی اصلاح کی طرف، بلکہ جس کی غرض صرف وطن کی مدافعت تھی، یعنی وہ بات جو انسان اور گونگے حیوان میں مشترک ہے، جس کی نہ کوئی حجت تھی کہ اُس کی تائید کرتی، نہ معجزہ تھا کہ اُسے تقویت دیتا، بلکہ یہ ایک شعلہ تھا جو اُٹھا اور بجھ گیا؟ ہاں کہاں یہ چیز اور کہاں انبیاء کی دعوت جس کی بقول استاذ امام شیخ محمد عبدہ، انسانی سوسائٹی قدرتی طور پر محتاج ہے۔ نوع انسانی نے اپنی استعداد کی زبان سے اِس دعوت کو طلب کیا اور مدبّر و حکیم خدا نے اُسے بخش دی۔ اِسی دعوت کی بدولت انسان اپنے کمال کی طرف بڑھا ہے اور دوسری ادنیٰ مخلوقات سے برتر بن گیا ہے، پھر کہاں اِس واہی چیز کی دلیل اور کہاں نبوت کی دلیل؟ کہاں اِس ناپائیدار چیز کا اثر اور کہاں نبوت کا اثر؟ جن قوموں کو وحی کے ذریعہ ترقی حاصل ہوئی ہے، تو اُن کی یہ ترقی، وحی کا قدرتی اثر و نتیجہ تھا۔ برخلاف اِس کے فرانس نے جان آف آرک کی رہنمائی سے ترقی نہیں کی۔ اِس لڑکی کی مثال اُس سپہ سالار کی سی ہے جسے فیصلہ کن معرکہ میں اپنی شجاعت اور دوسرے ایسے اسباب سے فتح حاصل ہوتی ہے جن میں اُس کا کوئی ہاتھ نہیں ہوتا۔ پھر فتح کے بعد سپہ سالار کی قوم اس ملک پر قابض

ہو جاتی ہے اور اُسے اپنے علماء کے علوم، حکماء کی حکمت، صنّاعوں کی صنعت سے ترقی دیتی ہے۔ فاتح سپہ سالار نہ یہ چیزیں جانتا تھا نہ اُس کی رہنمائی سے وہ پیش آئیں، لہذا ایسی صورت میں کون کہے گا کہ وہ فاتح سپہ سالار ہی ہے جس نے مفتوح ملک کو یہ تمام ترقی دی ہے، اگرچہ سپہ سالار کو اِس ترقی کا ایک دُور کا قدرتی سبب قرار دیا جا سکتا ہے، جس طرح سمندر میں طوفان آجائے اور دشمن کے بیڑے کی غرقابی کی وجہ سے کسی قوم کو فتح حاصل ہو جائے۔

کہاں یہ لڑکی جو محض ایک شرار یا بجلی تھی کہ چمکی اور غائب ہو گئی اور کہاں محمدی نبوت کا آفتاب جس نے سارے جہان کو روشن کر دیا، اور جس کا نور آج بھی چمک رہا ہے اور ہمیشہ چمکتا ہی رہے گا۔ ایک اُمّی یتیم جس کا بچپن اور جوانی، گمنامی و خاموشی میں گزری۔ نہ اُس کے پاس کوئی علم تھا نہ تخیّل، نہ دینی وہم، نہ شعر شاعری، نہ خطبوں کی بلاغت دفعتًا وہ چالیس برس کی عمر میں تمام جہان کے سامنے کھڑے ہو کر چلّاتا ہے "تم سب کھلی گمراہی پر ہو۔ آؤ میری پیروی کرو، تمھیں سیدھی راہ دکھا دونگا!" پھر اِس شخص نے اَن پڑھ ہونے پر بھی تمام انسانی دینوں کی اصلاح کر دی، عقائد کی بھی، اخلاق کی بھی، قوانین کی بھی۔ اُس نے زمین کا سارا انتظام بدل ڈالا، اور دنیا اُس کی تعلیم کی برکت سے ایک نئے دَور میں

داخل ہوگئی۔ یقیناً دونوں حالتوں میں بے حد فرق ہے اور ہر غور کرنیوالے عقلمند کے لیے ظاہر ہے۔

استاذ امام شیخ محمد عبدہ نے وحی کے ثبوت میں جو کچھ کہا ہے، اُسے پوری طرح سمجھنے والا، بشرطیکہ علیم وحکیم، فاعل و مختار خدا کے وجود پر ایمان رکھتا ہو، مجبور ہوگا کہ اُن کا بیان بے چون وچرا تسلیم کرلے۔ اُنہوں نے ثابت کردیا ہے کہ وحی ورسالت کا وجود، علم وحکمت الٰہی کے لیے عقلی طور پر لازم وناگزیر ہے، کیونکہ وہ ذات برحق وہی ہے اَلَّذِیۡۤ اَعۡطٰی کُلَّ شَیۡءٍ خَلۡقَہٗ ثُمَّ ہَدٰی جس نے ہر چیز کو قاعدہ سے بنایا اور اُس کی رہنمائی کردی ہے۔ یہ بات وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جنہیں علم اجتماع، حکمتِ وجود اُس کے قوانین، اور اصول عقائد میں معلومات کے ساتھ عربی زبان کی بلاغت کا بھی کچھ علم حاصل ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ورسالت اِس فلسفہ وبلاغت کی مدد کے بغیر بھی ثابت کی جاسکتی ہے، اور یہی وہ چیز ہے جس نے علماء فرنگ کی عقلوں کو مجبور کردیا ہے کہ آپ کی دعوت کی تصدیق کریں، اور مادّیوں کو مجبور کیا ہے کہ اُسے ایک خاص رنگ میں رنگ دیں جس کی تفصیل وتردید ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:

شبہہ کی تفصیل و تردید

پروفیسر نے جس شبہہ کا اجمالاً ذکر کیا تھا، اُسے امیل درمنگم نے اِتنی تفصیل سے لکھا ہے کہ دوسرے یورپین اہلِ قلم کے ہاں اِتنی تفصیل موجود نہیں، اسی لیے اِس کی تحریر سے بہت مسلمان بھی فریب میں مبتلا ہو گیے ہیں۔

ہمارے حکیم سید جمال الدین افغانی، عیسائی مُناظروں سے فرمایا کرتے تھے "تم نے عہدِ قدیم (توراۃ) کے چیتھڑوں سے ایک کُرتا تیار کیا ہے اور اُسے مسیح علیہ السلام کے جسم پر منڈھ دیا ہے" اور ہم کہتے ہیں کہ تم نے تاریخ اسلام کو جہاں تک سمجھا ہے، اُس سے ایک کرتا بنایا ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم پر منڈھ دیا ہے۔ میں اس شبہہ کو درمنگم سے بھی زیادہ شرح و بسط کے ساتھ لکھ کر اِس کی یہاں تردید کر دینا چاہتا ہوں!

۱۔ درمنگم اور دوسرے علماء فرنگ کہتے ہیں کہ محمدؐ شام کے شہر البُصریٰ میں بحیرا راہب سے ملے تھے۔ بحیرا کے بارے میں اِن کا بیان ہے کہ وہ نسطوری فرقہ سے تھا اور آریوس کا متبع جو مسیح کی الوہیت اور عقیدۂ تثلیث کا منکر ہے۔ اور یہ کہ ضرور محمد نے اُس سے اُس کے عقیدہ کی تعلیم لی ہوگی۔ بحیرا کی نسبت اِن لوگوں کا یہ خیال بھی ہے کہ وہ علم نجوم کا ماہر اور جادوگر تھا اور اُس کا اعتقاد تھا کہ خدا نے ظاہر ہو کر اُسے بتایا ہے کہ آلِ اسماعیل

کو مسیحی دین کی طرف لانیوالا ایک نبی عنقریب پیدا ہوگا۔ اِسی قدر نہیں بلکہ بعض راہبوں سے ہم نے یہاں تک سنا ہے کہ بحیرا، محمد کا معلّم و اُستاد تھا اور پیغمبری کے بعد بھی آپ کے ساتھ رہتا تھا، اور یہ کہ آپ نے شراب محض اِس وجہ سے حرام کی ہے کہ آپ نے معاذاللہ نشہ کی حالت میں اپنے اِس استاد کو قتل کر ڈالا تھا۔ غرضکہ اِسی قسم کی بے شمار تہمتیں اور بہتان اِن لوگوں کے ہاں موجود ہیں۔ حالانکہ آپ کی سیرت سے واقف ہر مسلمان جانتا ہے کہ آپ نو برس اور بعض روایتوں کے بموجب بارہ برس کی عمر میں اپنے چچا ابوطالب کے ساتھ شام گیے تھے۔ اِسی موقعہ پر اِس راہب نے آپ کو قریش کے ساتھ اِس حال میں دیکھا تھا کہ ابر کا ایک ٹکڑا آپ کو دھوپ سے بچا رہا تھا۔ چنانچہ اُس نے آپ کے چچا سے کہا کہ یہ لڑکا کچھ اور ہی نکلے گا اور اِسے یہودیوں سے بچانا چاہیے۔ اِسی کے ہم معنی اور بھی روائیتیں ہیں لیکن سب کی سب ضعیف ہیں بجز ترمذی کی روایت کے جس میں بحیرا کا نام نہیں ہے اور جس کے متن میں بھی غلطی ہے۔ لیکن کسی ایک روایت میں بھی یہ نہیں کہا گیا ہے کہ آپ نے بحیرا سے اُس کے عقیدے یا دین کے بارے میں کچھ بھی سیکھا یا سنا تھا۔

۲۔ علماء فرنگ کہتے ہیں کہ ورقہ بن نوفل اُن عربوں میں سے تھا جو عیسائی ہو گیے تھے۔ وہ مسیحیت کا عالم تھا، اور خدیجہؓ کا رشتہ دار تھا۔

اِس قول سے اُن کی غرض پڑھنے والے کو یہ دھوکہ دینا ہے کہ آپ نے اہل کتاب کا علم، ورقہ بن نوفل سے حاصل کیا تھا حالانکہ ورقہ کے بارے میں صحیح طور پر وہی ثابت ہے جو شیخین یعنی بخاری و مسلم وغیرہما نے روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خدیجہؓ کو جب بتایا کہ میں نے غار حراء میں فرشتہ دیکھا ہے تو وہ آپ کو ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں اور تمام ماجرا اُسے کہہ سنایا۔ وہ بوڑھا اور اندھا تھا، اور کچھ مدت بعد مر گیا۔ یہ ثابت نہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس واقعہ کے بعد پھر کبھی اُس سے ملاقات کی ہو (اِس بارے میں جو حدیث معتبر ہے، اُسے میں اِس بحث کے آخر میں ذکر کروں گا)۔

محدّثوں اور مورّخوں نے ورقہ کے بارے میں جو کچھ بھی کہا گیا ہے سب کو جمع کر دیا ہے عام اس سے کہ اس کی روایت صحیح ہو یا نہ ہو جیسا کہ اُن کا دستور تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق ہر بات کو جمع کر دیتے تھے۔ لیکن اِن میں سے کسی نے بھی یہ نہیں لکھا کہ ورقہ نے کبھی بھی مسیحیت کی طرف دعوت دی ہو یا اِس کے متعلق کچھ لکھا ہو۔

البتہ صرف اِس قدر کہا گیا ہے کہ ورقہ نے جب خدیجہؓ کی زبانی محمد کا ماجرا سنا تو کہا "یہی وہ نبیِ مُنتظر ہے جس کی مسیح عیسیٰ بن مریم نے بشارت دی ہے" بعض روایتوں میں یہ بھی مذکور ہے کہ ورقہ زندہ رہا

یہاں تک کہ اُس نے دیکھا کہ بُت پرست لوگ بلالؓ کو اُن کے اسلام کی وجہ سے تکلیفیں پہنچا رہے ہیں۔ لیکن یہ شاذ روایت ہے اور حضرت عائشہ کی صحیح روایت کے مخالف ہے جس میں صاف کہہ دیا ہے کہ آغاز وحی کے وقت ورقہ اندھا تھا اور جلد ہی مر گیا۔ بلال کی آزمایش اُس وقت پیش آئی ہے جب اسلام کی دعوت کا اعلان ہو چکا تھا اور لوگ اُس میں داخل ہو چکے تھے، یعنی آغاز وحی سے تین سال بعد۔

امیل درمنگم نے وحی کے رُک جانے کا حال غلط لکھا ہے، کیونکہ حدیث سے ناواقفیت کی وجہ سے وہ روایات کے اختلاف سے عہدہ برآ نہ ہو سکا۔ ورقہ کے بارے میں محدثین کی دلچسپی کا سبب صرف اِس قدر ہے کہ وہ جاننا چاہتے تھے کہ ورقہ صحابی ہے یا نہیں، کیونکہ صحابی وہی ہو سکتا ہے جس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مسلمان ہونے کی حالت میں دیکھا ہو اگر اُنہیں ورقہ کے بارے میں کچھ بھی معلوم ہوا ہوتا کہ توراۃ یا انجیل کا عالم تھا تو اُسے ضرور لکھتے۔

۳۔ مادّی علماء نے لکھا ہے کہ اسلام سے پہلے عرب میں یہودیت اور مسیحیت پھیل چکی تھی اور بعض فصحاء و شعراء عرب، عیسائی بن چکے تھے مثلاً قسُ بن ساعِدہ الایادی، اور اُمیۃ بن ابی الصّلت، اور یہ کہ یہ لوگ اہل کتاب کی زبانی سن کر کہتے پھرتے تھے کہ عنقریب وہ نبی ظاہر ہونیوالا

ہے جس کی موسیٰ وعیسیٰ وغیرہما پیغمبروں نے بشارت دی تھی۔ توراۃ وانجیل اور دوسرے صحیفوں کی اِس بارے میں بعض پیشین گوئیاں ہم نے آیت "اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَکْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰاةِ وَالْاِنْجِیْلِ" (۱۵۷۔سورۂ اعراف) کی تفسیر میں نقل کردی ہیں۔

قُس بن ساعدہ کا معاملہ یہ ہے کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے پہلے ہی مرچکا تھا۔ روایت ہے کہ آپ نے اپنی بعثت سے بہت پہلے اُسے دیکھا تھا۔ وہ سوق عکاظ میں اپنے اونٹ پر بیٹھا بہت پرتکلّف الفاظ میں تقریر کررہا تھا۔ کہتا تھا "خدا کا ایک دوسرا ہی دین ہے جو تمہارے دین سے بہتر ہے۔ ایک پیغمبر آنیوالا ہے۔ اُس کا وقت تمھارے سر پر آپہنچا ہے۔ مبارک باد ہے اُن کے لیے جو اِس پیغمبر کو دیکھیں گے اور اس کی پیروی کریں گے۔ ہلاکت ہے اُن کے لیے جو اُس کی مخالفت کرینگے"۔ اِس بارے میں تمام روائتیں ضعیف ہیں لیکن اُن کے تعدُّد سے معلوم ہوتا ہے کہ معاملہ کی اصلیت ضرور ہے۔

رہ گیا اُمیّہ بن ابی الصَّلْتِ الثَّقَفی تو وہ مشہور شاعر ہے۔ ابوعبیدہ کہتے ہیں کہ عربوں کا بالاتفاق فیصلہ ہے کہ اُمیّہ، قبیلۂ ثقیف کا سب سے بڑا شاعر ہے۔ زبیر بن بکّار کہتے ہیں کہ میرے چچا نے کہا: اُمیّہ نے جاہلیت

میں کتابیں پڑھی تھیں اور عبادت گزاروں کے کپڑے پہن لیے تھے۔ ابراہیم و اسماعیل اور دین حنیفی کا بار بار ذکر کیا کرتا تھا۔ شراب چھوڑ دی تھی۔ بُت پرستی سے دور ہو گیا تھا۔ اُسے خود اپنے نبی ہونے کا لالچ پیدا ہو گیا تھا، کیونکہ اُس نے کتابوں میں پڑھا تھا کہ حجاز میں ایک نبی پیدا ہونے والا ہے، لہٰذا امید باندھ لی کہ وہ نبی میں ہونگا! لیکن جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی تو اُسے حسد پیدا ہو گیا اور اسلام قبول نہیں کیا۔ بدر میں قتل ہونے والے مشرکوں کا مرثیہ اُس نے کہا جس کا مطلع ہے:

ماذا ببدر والعقنقل من مرازبة جحاجح

"مرآۃ" میں ابن ہشام سے مروی ہے کہ اُمیّہ، نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آیا تھا، چنانچہ حجاز آیا تاکہ طائف سے اپنا روپیہ پیسہ لے کر ہجرت کر جائے۔ یہیں اُسے غزوۂ بدر اور اُس میں اکابر قریش کے قتل کا حال معلوم ہوا۔ قتل ہونے والوں میں اُس کے دو ماموں زاد بھائی بھی تھے۔ سخت رنجیدہ ہوا۔ اپنی اونٹنی کی ناک کاٹ ڈالی۔ اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے، اور بہت رویا۔ طائف ہی میں رہ گیا اور مر گیا۔ لیکن اس بارے میں صحیح روایت یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شرید بن عمرو سے اُمیّہ کے شعر پڑھوائے اور فرمایا "قریب تھا کہ اسلام لے آتا"

ساتھ ہی یہ بھی واقعہ ہے کہ اُمیۃ، ابراہیم علیہ السّلام کی حنیفی ملّت پر قائم تھا
اُس نے مسیحیت قبول نہیں کی تھی خود کہتا ہے :

کل دین یوم القیامۃ عند اللہ...... الا دین الحنیفۃ زور

(قیامت کے دن اللہ کے حضور، حنیفیت کے سوا ہر دین جھوٹا ہوگا!)

۴۔ سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے اسلام کو بھی اِن لامذہبوں نے بہت بڑھا یا چڑھایا ہے۔ سلمان، ایران کے باشندے اور آتش پرست تھے۔ پھر بعض راہبوں کے ذریعہ عیسائی ہوگیے اور اُن کے کئی عابدوں کے ساتھ رہے۔ اِنہی راہبوں اور دوسرے لوگوں سے انہوں نے سنا کہ عرب میں عنقریب وہ نبی پیدا ہونے والا ہے جس کی بشارت عیسٰی اور دوسرے پیغمبروں نے دی ہے۔ یہ سُن کر عرب کو روانہ ہوئے مگر ظلم و زبردستی کے ساتھ مدینہ کے یہودیوں کے ہاتھ بیچ ڈالے گیے۔ سلمان نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہجرت ہی کے بعد دیکھا۔ چنانچہ اسلام لے آئے اور اپنے آقا سے معاملہ کرکے آزاد ہوگیے۔ اِن کے حالات میں بہت سی متضاد روائتیں آئی ہیں، لیکن درمنگم وغیرہ کا مقصود یہی ہے جو ہم نے بتا دیا ہے۔

۵۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ قریش، جاڑے میں یمن کا سفر کرتے تھے اور گرمی میں شام کا۔ اِن ملکوں میں قریش خانقاہوں میں عیسائی پادریوں اور راہبوں سے ملتے تھے، جو اُنہیں بتاتے تھے کہ عنقریب

عرب میں ایک نبی پیدا ہونیوالا ہے۔

۶۔ درمنگم کہتا ہے کہ خود مکہ میں بعض یہودی اور عیسائی موجود تھے، لیکن سب کے سب غلام اور نوکر تھے۔ سردارانِ قریش اُنہیں اجازت نہیں دیتے تھے کہ عرب کے بتوں کے مقدس حرم، مکہ میں رہیں۔ چنانچہ مکہ کے اطراف میں رہتے تھے "کعبہ سے دور اور صحراء سے قریب مکانوں میں" یہ لوگ اپنے دین کی باتیں بیان کیا کرتے تھے جو سرداران قریش کے کانوں تک پہنچتی نہ تھیں یا وہ اُن کی پروانہ کرتے تھے کیونکہ اِسی قسم کی باتیں وہ اپنے بکثرت سفروں میں بھی سنا کرتے تھے۔ لیکن درمنگم نے لکھا ہے کہ ابوسفیان نے امیۃ بن ابی الصلت کو اِس بات پر ملامت کی تھی کہ وہ اِس پیغمبری کے بارے میں راہبوں کی گفتگو کا چرچا کیوں کرتا رہتا ہے؟

یہ مقدمات، یورپین اہل قلم اِس لیے بیان کرتے ہیں کہ اپنے طریقۂ استنباط اور بزعم خود تحلیلی تنقید پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوائے نبوت کو پرکھیں اور اُس کی تعلیل و توجیہہ کریں۔ ساتھ ہی وہ اور مقدمات بھی پیش کرتے ہیں جن میں آپ کی نفسی و ذہنی کیفیت اور آپ کی قوم کی حالت پر گفتگو کرتے ہیں۔ ہم اِسی بحث کے ساتھ اِن تمام مزاعم کا بھی خلاصہ یہاں پیش کیے دیتے ہیں:

۷۔ درمنگم نے آپ کے دادا عبدالمطلب کی وفات کے بعد ابوطالب کی سرپرستی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے: ابوطالب، مالدار نہ تھے اس لیے بچہ (محمدؐ) کو تعلیم نہ دے سکے اور وہ زندگی بھر اَن پڑھ ہی رہ گیا (یہ کہہ کر لوگوں کو اس وہم میں مبتلا کرنا مقصود ہے کہ مکہ میں مالداروں کے لڑکے، تعلیم حاصل کیا کرتے تھے، گویا وہاں مہذّب ملکوں کی طرح مدرسے موجود تھے جن میں لڑکے فیس دیکر پڑھا کرتے تھے، حالانکہ یہ محض بے بنیاد ہے)

اِس کے بعد کہتا ہے "لیکن ابوطالب اپنے اِس بھتیجے کو سوداگری کے سفروں میں ساتھ لے جاتے تھے۔ قافلے، صحراء میں چلتے اور عظیم الشان مسافتیں طے کرتے تھے۔ بچہ (محمدؐ) ساتھ ہوتا۔ اُس کی خوبصورت آنکھیں مَدْیَن، وادیؐ الْقریٰ، اور ثمُوْدْ کی ویران آبادیوں کے کھنڈر دیکھتیں۔ اُس کے کان، جو ہمہ وقت عربوں اور بدویوں کی باتیں سننے کے لیے مستعد رہتے تھے، اِن مقامات کے حالات سنا کرتے۔ کہا جاتا ہے کہ محمدؐ نے اپنے اِنہی شامی سفروں میں سے ایک سفر میں بحیرا راہب کو شہر بُصریٰ کے اطراف میں دیکھا اور اُس سے ملا، اور یہ کہ راہب نے اُس میں نبوت کی وہ علامتیں موجود پائیں جو کتابوں میں لکھی ہیں۔ شام ہی میں محمد نے رومی احبا کو، پادریوں کو، انشاپرداز وں کو دیکھا اور معلوم کیا کہ آتش پرست ایرانی، رومی عیسائیوں کے دشمن ہیں اور اُن کی گھات

میں لگے ہوئے ہیں۔"

درمنگم نے یہ جو کچھ کہا ہے، محض اُس کے اپنے دماغ کی پیداوار ہے، بحیرا راہب کے معاملے کی اصلیت صرف اُتنی ہی ہے جو ہم بیان کر آئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ درمنگم نے اپنی یہ بات ثابت کرنے کی اس لیے کوشش نہیں کی کہ وہ چرچ کے بہتانوں سے واقف ہے۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چچا کے ساتھ تجارت کے سلسلہ میں جب شام گیے، تو جیسا کہ بتایا جاچکا ہے، بچہ تھے اور ابوطالب نے اُنہیں سفر پورا ہونے سے پہلے ہی واپس کر دیا تھا۔ اِس کے بعد آپ خدیجہ کی سوداگری کے سلسلہ میں صرف ایک مرتبہ شام گیے۔ اِس دفعہ آپ جوان تھے۔ لیکن اِن دونوں موقعوں پر آپ بُصریٰ کی منڈی سے آگے نہیں بڑھے۔

پھر جو قافلے شام جاتے ہیں، مَدیَن سے نہیں گزرا کرتے تھے جو سرزمین سینا میں واقع ہے۔ یہ تجارتی قافلے عربوں یا بدویوں سے مقامات کے حالات اور اُن کی تاریخ پر بحث کرنے میں اپنا وقت ضایع نہیں کیا کرتے تھے۔ یہ بھی ثابت نہیں ہوا کہ عرب تاجر، عیسائی پادریوں سے ملتے ہوں اور اُن کے مذہب اور کتابوں کے بارے میں گفتگو کیا کرتے ہوں۔ ایسی صورت حال میں محمدؐ کی نسبت بھی خیال نہیں کیا

جا سکتا کہ اپنی تجارتی زندگی میں قوموں کے حالات، اُن کی تاریخ، مذاہب، اور کتابوں کی چھان بنان میں رہتے اور اُن کے مذہبی پیشواؤں سے ملتے اور مباحثے کیا کرتے ہوں۔ درمنگم نے یہ لبسنت اپنے دل سے اس لیے بنایا ہے کہ قرآن میں پیغمبروں کے جو قصّے آئے ہیں اور ایرانیوں پر رومیوں کے غلبہ کی جو پیشین گوئی کی گئی ہے، اس کی کوئی توجیہہ اُس کی سمجھ میں آ نہ سکتی تھی۔ عنقریب ہم دکھا دیں گے کہ درمنگم کی یہ تمام تعلیل و تحلیل، اور بناوٹ کیا وقعت رکھتی ہے۔

۸۔ اِس کے بعد درمنگم نے کہا ہے کہ سوداگری یا جنگ سے فارغ ہونے کے بعد عرب خصوصاً مکہ کے باشندے اپنا زیادہ تر وقت شراب خواری اور بدکاری وغیرہ میں صرف کیا کرتے تھے۔ تاریخ شاہد ہے کہ محمدؐ اُن کی یہ حرکتیں دیکھتے تھے مگر اُن میں کبھی شریک نہ ہوتے تھے، اِس لیے نہیں کہ فقیر اور تنگ دست تھے۔ درمنگم کہتا ہے "لیکن محمد کے دل کو یہ لگن لگی ہوئی تھی کہ چشم عبرت سے سب کچھ دیکھیں، سب کچھ سنیں، سب کچھ جانیں۔ چونکہ اُس تعلیم سے محروم رہے تھے جو اُن کے ہم عصروں کو ملی تھی، اس لیے شاید اُنہیں علم و معرفت کا اور بھی زیادہ شوق ہو گیا تھا۔ وہ عظیم الشان شخصیت جس کے آثار بعد میں ظاہر ہوئے اور جس کا اقتدار آج بھی دنیا میں قائم ہے، کمال کی تلاش میں تھا، اس پست لہو ولعب

سے بیزار تھی جس میں مکہ والے ڈوبے ہوئے تھے۔ وہ تو زندگی کے اُس نور کی متلاشی تھی جو جملہ مظاہر حیات سے ان لوگوں کی چشم حقیقت بیں کے لیے عیاں ہے جنہیں خدا نے اُس کے دیکھنے کی قوت بخشی ہے"

یہ بات بھی درمنگم کی ایجاد ہے۔ محمدؐ کو ہرگز شوق نہ تھا کہ مکہ والوں کا فسق و فجور دیکھیں یا سنیں یا جائیں۔ صحیح طور پر ثابت ہے کہ آپ صرف دو مرتبہ اُن کی رات کی صحبتیں دیکھنے کے لیے گیے تھے مگر دونوں مرتبہ خدا نے آپ کی آنکھوں پر نیند طاری کر دی۔ آپ بے خبر سو گیے یہاں تک کہ صبح ہو گئی اور آپ نہ کچھ دیکھ سکے نہ سن سکے اِس تفصیل سے درمنگم کا بیان کردہ یہ فرضی واقعہ باطل ہو جاتا ہے جس میں اگرچہ تحریف ہے لیکن اِس تحریف میں دو فریب پوشیدہ ہوئے ہیں :

۱۔ یہ کہ آپ کے قریشی ہم عصر، تعلیم یافتہ تھے اور آپ تعلیم سے محروم تھے، اور اِسی محرومی کی وجہ سے آپ کو جستجو و تلاش زیادہ ہو گئی تھی۔

۲۔ اِسی سبب سے آپ کی طبیعت کو بے حد رغبت ہو گئی تھی کہ زندگی کے جملہ جلووں کی اصلیت تک پہنچیں۔ اِس تحریف سے درمنگم کی غرض یہ ہے کہ آپ کی وحی کا معاملہ ایک خاص رنگ میں رنگ

دیا جائے۔ لیکن اِس کا بطلان بھی عنقریب ظاہر ہو جائے گا۔

۹۔ ورمنگم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فرزندوں؛ قاسم، طیّبؔ طاہر کا بھی ذکر کیا ہے۔ اُسے اِن کے وجود میں شک ہے۔ کہتا ہے کہ آپ کی کنیتؔ "ابوالقاسم" (قاسم کے باپ) اِس بات کی دلیل نہیں ہے کہ آپ کا کوئی لڑکا بھی اِس نام کا موجود تھا۔ اور اگر ثابت ہو جائے کہ آپ کے لڑکے پیدا ہوئے تھے، تو وہ سب کے سب طفولیت ہی میں فوت ہو گیے تھے۔ اِس بارے میں تحقیق یہ ہے کہ آپ کا ایک لڑکا تھا جس کا نام قاسم تھا، اور اِسی سے آپ کی کنیت، ابوالقاسم ہوئی۔ وہ طفولیت ہی میں فوت ہو گیا تھا۔ بعض روایتوں میں ہے کہ قاسم، بڑا ہو کر مرا یہاں تک کہ گھوڑے پر سوار ہونے لگا تھا، اور یہ کہ طیّبؔ و طاہر، اِسی لڑکے کے لقب ہیں۔ لیکن ورمنگم نے اِن لڑکوں کی موت کے واقعہ کو، جن کے وجود میں خود اُسے بھی شک ہے، بہت اہمیت دیدی ہے اور اِس پر ایک عجیب وہم کا قلعہ بنا ڈالا ہے۔ وہ اپنے قارئین میں یہ خیال پیدا کرنا چاہتے ہیں کہ اولاد کی محرومی پر چونکہ آپ سے صبر نہ ہو سکا، اِس لیے زید بن حارثہ کو اپنا لڑکا بنا لیا تھا۔

چنانچہ کہتا ہے:

"مورّخ کو چاہیے کہ اِس واقعہ پر بلکہ اُن تین مصیبتوں پر غور

کرے جو محمدؐ کو اپنی اولاد کی وجہ سے پیش آئیں اور جن کا اثر اُن کی زندگی اور ذہنیت پر ہونا ضروری تھا۔ یہ اس لیے بھی کہ محمدؐ اُمّی تھے اور مباحثے و مناظرے اُنہیں واقعات سے عبرت و سبق حاصل کرنے سے روک نہیں سکتے تھے، درد انگیز واقعات، جیسے اولاد کا مر جانا، تو یہ واقعہ ایسا تھا جو اُن کے دماغ پر گہرا اثر ڈالے بغیر نہیں رہ سکتا تھا، نیز یہ واقعات محمدؐ کو بُتوں سے بھی بیزار کرنے والے تھے۔ خدیجہ، کعبہ کے بُتوں پر چڑھاوے چڑھایتں اور ہُبَل، لات، عُزّیٰ، اور مَنات کے سامنے قربانیاں پیش کیا کرتی تھیں کہ بے اولادی کے رنج سے نجات پائیں، مگر ان چڑھاووں اور بھینٹوں سے کوئی فائدہ بھی حاصل نہ ہوتا تھا۔

"بلاشبہ یہ واقعہ ہے کہ وہاں عرب میں عیسائیت کے دباؤ سے،
جس کے دھارے شام، روم، یمن، اور حبش سے بہتے چلے آرہے تھے،
بت پرستی کی بنیادیں ہلنا شروع ہوگئی تھیں"

ورمنگم نے اِن لڑکوں کی موت کو، جن کی پیدایش بھی مشتبہ ہے اس قدر اس لیے بڑھا دیا ہے کہ اپنے دل سے گڑھ کر یہ افسانہ باور کرائے کہ خدیجہؓ، نرینہ اولاد پانے کے لیے بتوں سے منتیں مانتی تھیں۔ پھر اس فلسفہ سے یہ نتیجہ نکالے کہ بتوں کے ذریعہ چونکہ کوئی مراد بر نہ آئی، اس لیے خدیجہؓ اور اُن کے شوہر محمدؐ کی عقیدت، مسیحی خیالات کے زیر اثر بتوں سے کمزور

ہو گئی تھی۔ پھر اس پُرپیچ طریقہ سے وحی محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیل و توجیہہ بیان کرے ۔ حالانکہ حق یہ ہے کہ آپ نے زید کو صرف اِس وجہ سے مُتبنّیٰ کیا تھا کہ اُنہوں نے اپنے باپ اور چچا کے ساتھ آزاد رہنے پر آپ کی غلامی کو ترجیح دی تھی۔ اُن کے والد اور چچا مکہ آئے تھے تاکہ فِدیہ دے کر اُنہیں آزاد کرالے جائیں۔ آپ نے فرمایا کہ "زید کو بلاؤ اور اختیار دیدو۔ اگر تمھارے ساتھ جانا پسند کرے تو بغیر فدیہ کے لے جاؤ" چنانچہ زید بلائے گئے اور اُنہوں نے اپنے باپ اور چچا کو پہچان لیا۔ آپ نے فرمایا "تم مجھے اور میرے برتاؤ کو اچھی طرح دیکھ چکے ہو۔ تمھیں اختیار ہے کہ میرے ساتھ رہو یا اپنے باپ کے ساتھ چلے جاؤ"، زید نے جواب دیا "میں آپ کے مقابلہ میں کسی کو بھی ترجیح دے نہیں سکتا۔ آپ میرے لیے باپ اور چچا کی جگہ ہیں!" زید کے باپ نے کہا، تیرا برا ہو، غلامی کو آزادی پر اور اپنے باپ، چچا، اور خاندان پر ترجیح دیتا ہے؟ زید نے کہا، اِس شخص نے (یعنی محمدؐ نے) میرے ساتھ وہ کیا ہے کہ اِس کے مقابلہ میں کسی کو میں پسند نہیں کر سکتا! رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جب یہ دیکھا تو اُنہیں لیکر حجر میں گیے اور لوگوں سے پکار کر فرمایا "گواہ رہو کہ زید میرا بیٹا ہے۔ وہ میرا وارث بنے گا اور میں اُس کا وارث بنوں گا!" اُن کے والد اور چچا نے جب یہ دیکھا تو خوش ہو گیے۔ (ابن سعد کی یہ روایت ہے

اور سیرت ابن اسحاق میں بھی اسی طرح ہے)

محمد صلے اللہ علیہ وسلم اپنے لڑکے یا کسی اور کی موت پر پریشان نہیں ہوجایا کرتے تھے، بلکہ حد درجہ کے صابر تھے۔ قاسم کی موت کے بعد بھی خدیجہ نا امید نہیں ہو گئی تھیں کہ خدا اُنہیں اور کوئی لڑکا نہ دے گا۔ انہوں نے کبھی بتوں کے لیے قربانی نہیں کی۔ لات، طائف میں ایک چٹان کا نام تھا جس کی قبیلۂ ثقیف پرستش کرتا تھا اور وہ قریش کا بُت نہ تھا۔ عُزّیٰ، نخلہ کی سرزمین میں ایک درخت کا نام تھا جس کی قریش کنانہ، اور غطفان پوجا کرتے تھے۔ مَناۃ، بنی ہلال، ہُذیل، اور خُزاعہ کا بُت تھا۔ درمنگم نے اُس زمانہ میں بت پرستی کے کمزور ہونے کا جو ذکر کیا ہے ـــــ اور جس کا سبب اُس کے زعم میں مسیحیت ہے ـــــ تو بت پرستی کی اِس کمزوری کا نتیجہ تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ خدیجہ، جو عورتوں میں سب سے زیادہ دانشمند، سب سے زیادہ سلیم الفطرت، اور ملتِ ابراہیم سے قریب تر تھیں، بتوں سے بیزار ہوتیں، اور لڑکے کی امید میں نہ اُن پر چڑھاوے چڑھاتیں نہ قربانیاں کرتیں۔ اور اگر اُن کی عقل و فطرت کا یہ تقاضا نہ تھا تو اُن کے شوہر، محمد مصطفیٰ کی شان یہی تھی کہ اُنہیں اِس طرح کی بات سے روکتے، کیونکہ وہ جیسا کہ خود درمنگم کو بھی اعتراف ہے، بچپن ہی سے بت پرستی کے دشمن تھے، لیکن ہے یہ

خواہش کی پیروی آدمی کو وہ بات بھی بھلا دیتی ہے جسے عام حالات میں بھول نہیں سکتا۔

۱۰۔ درمنگم کہتا ہے کہ ملک عرب میں مسیحیت کے پھیل جانے سے ایک خاص ذہنیت پیدا ہو گئی تھی۔ اور اُس نے عربوں کو اُس چیز میں بہت زیادہ راغب کر دیا تھا جسے تَحَنُّث یا تَحَنُّف کہتے تھے۔ یعنی گوشہ نشینی وعبادت، یہ فرض کرکے وہ کہتا ہے:

"محمد کو تَحَنُّثا میں اپنے دل کا سکون و اطمینان حاصل ہوتا تھا کیونکہ وہ تنہائی پسند تھے اور تنہائی کو معرفت حاصل کرنے اور کائنات کے اسباب معلوم کرنے کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ اِسی لیے وہ ہر رمضان میں پورے تیس دن کوہ ابوقُبَیس کے غار میں رہتے تھے۔ تھوڑی سی خوراک اُنہیں پہنچا دی جاتی تھی اور وہ غار میں بیٹھے دنیا کے ہنگاموں اور زندگی کی ہلچل سے دور غور و فکر وعبادت میں مصروف رہتے تھے"

میں کہتا ہوں کہ محدّثین کی روایتوں کے بموجب غارِ حرا میں خلوت آپ کو اُسی سال مرغوب ہوئی تھی جس سال آپ پر وحی نازل ہوئی ہے۔ اپنی خوراک آپ خود لے جاتے تھے۔ کوئی اور نہیں پہنچاتا تھا۔ ابن اسحاق نے ہر رمضان میں آپ کا غار میں بیٹھنا جو لکھا ہے، تو اُس سے مقصود وہ زمانہ ہے جب وحی رک گئی تھی جیسا کہ عنقریب بیان کیا جائیگا۔

یہاں پہنچ کر درمنگم اپنے مقدسات کے آخر پر پہنچ گیا ہے جہاں سے اُس کا مطلوبہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے، اِسی لیے اُس نے اپنے خیالات کو بے لگام کر دیا ہے، اور مہمیز دیکر دماغ کو مطلق العنان چھوڑ دیا ہے اپنے فرانسیسی شاعرانہ تخیل کو پوری آزادی دیدی ہے تاکہ غار میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جس طرح چاہے تصور کرے، چنانچہ اُس نے راتوں میں آپ کا ستاروں کو دیکھنا، دن میں سورج کو مشاہدہ کرنا، بلند پہاڑ کی چوٹی پر سے ریگستانوں اور بیابانوں پر نظر دوڑانا، خیمے اور کنوئیں دیکھنا، چرواہوں کا اپنے گلّوں کو پتے چھوڑ چھوڑ کر کھلانا فرض کر لیا ہے، حالانکہ وہاں درختوں کا نشان بھی نہیں، بلکہ اِس شخص نے سمندروں تک کا ذکر کر دیا ہے، حالانکہ وہاں سمندر کہاں؟ غرضکہ شاعرانہ تخیل مکمل ہے، اگرچہ خود اُس مقام سے کوئی سروکار نہیں جس کی تصویر اتارنا چاہتا ہے۔

درمنگم اپنی خواہش کے مطابق سب کچھ فرض کر کے کہتا ہے:

"صحرا کی رات میں، ستارے بے حد وحساب روشن ہوتے ہیں اتنے روشن کہ آدمی کو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا اُن کے نور کے چلنے کی آواز سن رہا ہے، گویا وہ دہکتی ہوئی آگ کے آتشیں نغمے ہیں!

"بے شک، سمجھنے والوں کے لیے آسمان میں نشانیاں ہیں۔ اُس جہان میں غیب ہے، بلکہ خود پورا جہان، غیب ہے۔ لیکن کتنے آدمی

ہیں جو آنکھیں کھولیں اور دیکھیں ؟ اپنے کان آمادہ کریں اور سنیں ؟
ہاں، حق کو دیکھیں اور لازوال صدائیں سنیں ! افسوس، لوگ آنکھیں
رکھتے ہیں جو دیکھتی نہیں۔ کان رکھتے ہیں جو سنتے نہیں...... لیکن
محمدؐ کو یقین ہے کہ وہ سنتے اور دیکھتے ہیں۔ آسمان کے پرے کی آوازیں
سننے کے لیے تمھیں کیا اس کے علاوہ کسی اور چیز کی بھی ضرورت ہے
کہ تمھارے سینہ میں قلبِ خالص اور نفسِ مخلص موجود ہو اور ایسا دل
جو ایمان سے لبریز ہو چکا ہے؟

"محمد کو لوگوں کی دانائی میں شک پر شک ہے، لہذا وہ صاف
و خالص حق ہی جاننا چاہتے ہیں جس سے باطل کو دور کا بھی لگاؤ نہیں
وہ صرف حق ہی کے ساتھ زندہ رہ سکتے ہیں، مگر اپنے گرد و پیش کہیں
حق نہیں دیکھتے۔ قریش کی زندگی، حق نہیں ہے۔ سود خواروں کا سود،
بدوؤں کی لوٹ، بے شرموں کی بدمعاشیاں، یہ چیزیں بھی حق نہیں
ہیں۔ کعبہ میں ہجوم کرنے والے بت بھی حق نہیں ہیں۔ ہبل، وہ لمبی
داڑھی اور معطر کپڑے پہننے والا دیوتا بھی حق نہیں ہے

"پھر حق کہاں ہے اور کیا ہے؟

"محمد، غار حرا میں لگاتار کئی سال ہر رمضان میں آکر بیٹھتے
رہے۔ یہاں وہ خیالات میں اس قدر ڈوب جاتے تھے کہ خود اپنے

آپ کو بھی بھول جاتے تھے۔ اپنا کھانا بھول جاتے تھے۔ دنیا و مافیہا کو بھول جاتے تھے، کیونکہ دنیا میں اُنہیں کہیں حق دکھائی نہیں دیتا تھا۔ وہاں غار میں بیٹھکر وہ اپنی کتابِ دل کی ورق گردانی کرتے تھے، اور لوگوں کی روش سے اُن کی بیزاری بڑھتی چلی جاتی تھی۔ اُنہیں یہ امید بھی نہیں ہو سکتی تھی کہ احبار و رہبان کے قصّوں اور کتابوں میں حق ملے گا مگر ہاں جس حق کی اُنہیں تلاش تھی وہ اِسی عالم کون میں مل سکتا تھا جو اُنہیں ہر طرف سے گھیرے ہوئے تھا۔ وہ حق، آسمان میں، ستاروں میں، ماہتاب میں، آفتاب میں ہو سکتا تھا۔ تپتے ہوئے ریگستان میں مل سکتا تھا جبکہ سورج اپنے پورے زور سے اُس پر چمکتا ہے، یا جب چاند اور ستاروں کی ٹھنڈی روشنیاں اُس سے کھیلنے کو نیچے اُترتی ہیں۔ وہ حق، سمندر میں اور اُس کی موجوں پر مل سکتا تھا۔ ہر اُس چیز میں مل سکتا تھا جو نیچر سے ملی ہوئی اور وحدۃُ الوجود میں شامل ہے ـــــ محمد اِسی عالم کون میں حقیقتِ عُلیا کے متلاشی تھے، اور اِس دُھن میں اتنے پکّے تھے کہ اپنی خلوت کی گھڑیوں میں بلند ہو کر اِس عالم کون سے مل جاتے اور اُس کے پردے چاک کر کے سربستہ رازوں تک پہنچ جاتے تھے،،

اِس کے بعد درمنگم کہتا ہے "تقریباً سنہ ۶۱۰ء میں محمدؐ کی ذہنی

اُلجھن اپنی آخری حد کو پہنچ چکی تھی۔ اِس یقین نے اُن کے دل کو سخت پریشانی میں ڈال دیا تھا کہ کوئی اصلی چیز ایسی ہے جس سے وہ خود اور اُن کی قوم محروم ہے، سب لوگ اِس اصلی چیز کو بھول چکے ہیں، اور ہر ایک اپنی قوم یا قبیلہ کے بُت پر جھکا ہوا ہے۔ لوگ، جنوں اور بھوتوں سے ڈرنے لگے ہیں، مگر بر ترحقیقت کو پسِ پشت ڈال چکے ہیں۔ شاید انہوں نے اِس کا انکار نہیں کیا ہے، لیکن اِسے بالکل بھول چکے ہیں اور اِس کے بھول جانے ہی میں روح کی موت ہے۔ محمدؐ کا ذہن اُن تمام خرافات سے پاک ہو چکا تھا، اُن تمام قوتوں سے باغی ہو چکا تھا جو ماسوا کے آگے جھکتی ہیں، ہر اُس چیز سے الگ ہو چکا تھا جو اُس واحد و اَحد وجود کا مظہر نہیں ہے۔

"محمدؐ کو معلوم تھا کہ شام اور مکہ میں رہنے والے عیسائیوں کا دین آسمانی ہے۔ وہ جانتے تھے کہ قوموں میں پیغمبر آتے رہے ہیں، خدا کا پیغام اُن پر نازل ہوا تھا۔ اُنہوں نے حق کو جانا اور اپنے نبیوں کی زبان سے سیکھا تھا۔ یہ بھی معلوم تھا کہ جب جب لوگ گمراہ ہو جاتے ہیں، خدا کی طرف سے اُن کی ہدایت کو پیغمبر آتے اور اُنہیں راہ راست دکھا دیتے ہیں اور یہ کہ دین الٰہی جسے ہر زمانہ میں پیغمبر لاتے رہے ہیں ایک ہی ہے اور جب کبھی اُس میں فساد پیدا ہو جاتا ہے، تو آسمان

سے پیغمبر آکر اُسے دور کر دیتے ہیں۔ عربوں کی گمراہی حد کو پہنچ چکی تھی اور محمدؐ کے دل میں بار بار خیال پیدا ہوتا تھا کیا ابھی وقت نہیں آیا کہ اللہ کی رحمت، عربوں میں پھر نازل ہو اور حق کی طرف اُن کی رہنمائی کر دے؟

"محمدؐ کو لوگوں کے میل جول سے بے رغبتی بڑھتی گئی۔ غار کی تنہائی میں اُن کے دل کی خوشی زیادہ گہری ہوتی گئی۔ تھوڑا سا کھانا لیکر وہ لگاتار کئی کئی ہفتے وہاں رہنے لگے اور فاقہ کشی، شب بیداری، اور ذہنی ورزش سے اُن کی روح تیز وروشن ہوتی چلی گئی۔ رات، دن، خواب، بیداری، کوئی چیز بھی یاد نہ رہی۔ غار میں گھنٹوں سر جھکائے بیٹھے رہتے، یا دھوپ میں آکر لیٹ جاتے، یا ریگستان میں تیز تیز چلا کرتے۔ اُنہیں ایسا معلوم ہوتا جیسے پہاڑوں کی چٹانیں، بول رہی ہیں۔ پکار رہی ہیں۔ اپنے ایمان کا اقرار کر رہی ہیں۔

"اِسی حال میں چھ مہینہ گزر گیے، حتیٰ کہ محمدؐ کو اپنی جان کا ڈر پیدا ہو گیا۔ خدیجہ سے یہ اندیشے بیان کیے۔ اُنہوں نے اطمینان دلایا کہ آپ امین ہیں۔ جن اور بھوت آپ کے قریب آ نہیں سکتے! ایک دن جبکہ محمدؐ غار میں سو رہے تھے، فرشتہ آگیا اور کہنے لگا "پڑھ!" اُنہوں نے جواب دیا، میں پڑھنا نہیں جانتا۔ وحی اور نبوت کا یہی آغاز تھا۔

"اب ایک نہایت ہی زبردست روحانی حِدّت کی زندگی شروع ہوتی اور نگاہوں کو خیرہ اور عقلوں کو دنگ کر دیتی ہے، لیکن یہ اللہ کے لیے، حق کے لیے، انسانیت کے لیے بے لاگ قربانی کی زندگی تھی،،

میں کہتا ہوں کہ درمنگم نے یہ جو کہا ہے، اُس کا بیشتر حصہ غلط ہے۔ اِس فرانسیسی عالم نے کیونکر جانا کہ محمد کو رات یاد رہی تھی نہ دن۔ خواب نہ بیداری، اور یہ کہ آپ نے اِسی حال میں چھ مہینے گزارے تھے ـــــ یہ اور اِسی طرح کی تمام باتیں، من گھڑت ہیں اور یہ دھوکہ باور کرانے کے لیے بنائی گئی ہیں، کہ نبی علیہ الصلاۃ والسلام کا دماغ قابو میں نہ رہا تھا، اور بے خودی چھا گئی تھی۔

ہم یہاں غار میں آپ کی عبادت کے بارے میں صحیح ترین روائتیں نقل کرتے ہیں۔ یہ روائتیں صرف وحی والے سال کے رمضان سے متعلق ہیں، کیونکہ اِسی رمضان میں آپ غار میں جایا کرتے تھے ـــــ تاکہ درمنگم کے جھوٹ کی قلعی کھل جائے اور اُن مضطرب روایتوں سے بے نیازی ہو جائے جو اس شخص نے آیندہ فصل میں وحی سے متعلق لکھی ہیں۔ ہم جو روایتیں نقل کر رہے ہیں، وہ بخاری اور مسلم دونوں نے اپنی صحیح میں روایت کی ہیں۔ بخاری

رضی اللہ عنہ کی روایتوں کے لفظ حسبِ ذیل ہیں:

باب، رسول اللہ صلعم پر کس طرح وحی کا آغاز ہوا؟

بخاری نے یہ باب بلکہ پوری کتاب اِس حدیث سے شروع کی ہے: "اِنّما الاعمالُ بِالنیّات" (عمل کا اعتبار نیت ہی سے ہے) اِس کے بعد وہ کہتے ہیں:

"ہم سے عبداللہ بن یوسف نے کہا کہ اُنہیں مالک نے ہشام بن عروہ کے واسطے سے خبر دی ہے اور اُنہوں نے اپنے والد کے ذریعہ اُمّ المومنین عائشہ رضی اللہ سے روایت کیا ہے کہ حارث بن ہشام رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اے رسول اللہ، آپ پر وحی(۱) کیونکر نازل ہوتی ہے؟ رسول اللہ

---

(۱) وحی کے معنی عام ہیں اور یہ لفظ لغوی معنی کی موافقت کے ساتھ مخفی ذریعہ سے علم حاصل ہونے کی کئی صورتوں کے لیے بولا جاتا ہے۔ انہی میں رویائے صادقہ ہے۔ دل میں کسی بات کا آجانا ہے۔ الہام ہے۔ فرشتہ کا القاء ہے۔ وحی کے خاص معنی بھی ہیں اور وہ خطاب الٰہی کی تین قسموں میں سے ایک ہے جو اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں درج ہیں" وَمَا کَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّکَلِّمَہُ اللّٰہُ اِلَّا وَحْیًا اَوْ مِنْ وَّرَاءِ حِجَابٍ اَوْ یُرْسِلَ رَسُوْلًا فَیُوْحِیَ بِاِذْنِہٖ مَا یَشَاءُ اِنَّہٗ عَلِیٌّ حَکِیْمٌ" (کسی آدمی کے لیے یہ نہیں کہ خدا اُس سے گفتگو کرے، مگر ہاں وحی کے طور پر یا پردے کے پیچھے سے، یا کسی قاصد کو بھیجے جو اُس کے حکم سے وحی کرے خدا بلند ہے اور حکمت والا) مذکورہ بالا حدیث بخاری میں پہلی قسم اور تیسری قسم کا ذکر ہے۔ رہ گئی دوسری قسم یعنی پردے کے پیچھے سے خدا کا براہ راست بات کرنا، تو یہ معاملہ، (باقی صفحہ ۱۰۳ پر)

صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا "کبھی گھنٹی(۲) کی آواز کی طرح آتی ہے اور یہ سب سے زیادہ سخت ہوتی ہے۔ جب فرشتہ الگ ہوتا ہے تو میں اُس سے سب کچھ سمجھ چکا ہوتا ہوں۔ کبھی فرشتہ آدمی(۳) کی صورت میں مجھے دکھائی دیتا ہے۔ مجھ سے کہتا ہے اور میں اُس کا کہنا سمجھ لیتا ہوں"۔ عائشہ رضؓ کہتی ہیں میں نے سخت جاڑے میں آپ پر وحی نازل ہوتے دیکھی ہے۔ وہ ختم ہوتی تھی اور آپ کی پیشانی سے

(باقی صفحہ ۱۰۲ کا)
شبِ معراج میں نبی صلعم کو پیش آیا تھا اور موسیٰ علیہ السلام کو بھی پیش آیا تھا۔ ان تین قسموں کے سوا وحی عام کو خدا کا تشریعی فرمان نہیں شمار کیا جاتا۔ رؤیائے صادقہ اور الہام، پیغمبر کو بھی حاصل ہوتا ہے اور دوسروں کو بھی۔

(۲) اس تشبیہ سے مقصود یہ ہے کہ ویسی آواز سنائی دیتی تھی جیسی گھنٹی کی ہوتی ہے جس میں صرف آواز ہوتی ہے مگر حرفوں سے مرکب کوئی بات نہیں ہوتی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ ملائکہ پاس موجود ہوتے تھے اگرچہ آواز سنتے وقت آپ انہیں دیکھتے نہ تھے۔ یہ حالت سب سے زیادہ سخت اس لیے ہوتی تھی کہ بقول حکیم ابن خلدون، اس صورت میں جسمانی بشریت سے نکل کر ملائکہ کی روحانی حالت میں منتقل ہونا ہوتا تھا۔ برخلاف اس کے دوسری صورت وہ ہے جس میں فرشتہ اپنی خالص روحانیت سے جسمانی بشریت میں آجاتا تھا۔

(۳) آدمی کی صورت میں اس لیے کہ فرشتہ، عقل وارادہ والی روح ہے اور مادّے میں تصرّف کی قوت رکھتا ہے۔ وہ مادے کی جو صورت چاہے اختیار کر سکتا ہے۔ موجودہ زمانہ کے علم کیمیا نے اِس تصرّف کو ہمارے تصوّر سے زیادہ قریب کر دیا ہے۔ اُس سے ثابت ہے کہ ہر مادّہ کثافت سے لطافت کی طرف چلا جاتا ہے، اور یہ بات حرارت کی قوت سے پیش آتی ہے۔ سب حرارتوں سے زیادہ قوی، بجلی کی حرارت ہے، لیکن فرشتہ بجلی میں بھی جس طرح چاہتا ہے تصرّف کر لیتا ہے اس معنیٰ کو ہم نے آیت ولما جاء موسیٰ لمیقاتنا وکلمہ ربہ (۷: ۱۴۳) کی تفسیر میں بیان کر دیا ہے (دیکھو تفسیر جلد ۹ صفحہ ۱۶۲ - ۱۶۷)

پسینہ بہتا ہوتا تھا[1]"

"یحییٰ بن بکیر نے ہم سے بیان کیا کہ لیث نے عقیل و ابن ہشام وعروہ بن الزبیر کے واسطہ سے روایت کیا ہے کہ عائشہ اُمّ المومنین نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا آغاز اس طرح ہوا کہ سب سے پہلے آپ سوتے میں سچے خواب[2] دیکھنے لگے۔ جو خواب بھی دیکھتے، صبح کی روشنی کی طرح صاف سچا نکلتا۔ پھر آپ کو خلوت پسند ہو گئی۔ چنانچہ غار حراء میں جاتے اور لگاتار کئی کئی دن عبادت کیا کرتے۔ آپ اپنا کھانا ساتھ لے جاتے تھے۔ جب ختم ہو جاتا تو خدیجہ کے پاس واپس آتے اور کھانا لے جاتے، یہاں تک غار ہی میں حق آپ پر نازل ہو گیا[3]۔ فرشتہ آیا اور کہنے لگا "پڑھو"، آپ نے فرمایا

---

(۱) علّامہ ابن قیمؒ کہتے ہیں کہ اگر نزول وحی کے وقت آپ سوار ہوتے تھے تو سواری اُس کی شدّت اور بوجھ سے بیٹھ جاتی تھی۔ ایک مرتبہ وحی اِس حال میں اُتری کہ آپ کا زانو، زید بن ثابت کے زانو پر تھا، زید کہتے ہیں کہ قریب تھا میرا زانو بوجھ سے پھٹ جائے۔

(۲) زیادہ تر خواب، یونہی بے ہودہ ہوتے ہیں اور بعض اسباب کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ سچا خواب مستعد طبیعت کے لیے ایک طرح کا انکشاف ہے جو سوتے میں جبکہ ذہن پاک اور محسوسات وافکار سے دور ہوتا ہے، حاصل ہو جاتا ہے۔ تشریعی وحی سے پہلے پیغمبروں کے خواب اس لیے ہوتے ہیں کہ اُن کا نفس، کلام الٰہی قبول کرنے کے لیے آمادہ ہو جائے۔

(۳) صحیحین کی اِس روایت سے ثابت ہے کہ یہ معاملہ جاگتے میں پیش آیا تھا۔ سیرت ابن ہشام میں ہے کہ جبریل سوتے میں آئے تھے۔ یہ عمرو بن عبید کی مرسل حدیث (باقی صفحہ ۱۰۵)

میں پڑھنا نہیں جانتا" آپ نے بیان کیا کہ اِس پر فرشتہ نے مجھے پکڑ کر
زور سے دبوچا[1] اور چھوڑ کر کہنے لگا "اِقْرَاْ"[2] (پڑھ) میں نے کہا "میں پڑھنا
نہیں جانتا۔ اُس نے دوبارہ مجھے زور سے دبوچا یہاں تک کہ میں
ہلکان ہو گیا۔ چھوڑ کر کہنے لگا "پڑھ"، میں نے کہا میں پڑھنا نہیں جانتا
اُس نے سہ بارہ مجھے بہت زور سے دبوچا اور چھوڑ کر کہنے لگا "پڑھ"
اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ، خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ، اِقْرَاْ وَرَبُّكَ

(باقی صفحہ ۱۰۴ کا)

ہے جو اگرچہ ثقہ ہیں اور صحابیوں میں سے ہیں، لیکن صحیحین کی روایت ہی مستند ہے۔ بعض محدثین نے دونوں روایتوں میں اس طرح تطبیق دی ہے کہ آپ نے فرشتہ کو پہلے خواب میں دیکھا تھا اور یہ ماجرا پیش آیا تھا، پھر بیداری میں دیکھا، حالانکہ اگر یہ بات خواب میں پیش آ چکی ہوتی تو آپ مانوس ہو چکے ہوتے اور بیداری میں دیکھنے کے بعد اِس قدر خوفزدہ ہو کر خدیجہ کے پاس نہ پہنچتے۔

(۱) یہ دبوچنا اس لیے تھا کہ آپ کی روحانیت قوی ہو جائے اور آپ فرشتہ سے متصل ہو کر اُس کا خطاب سمجھ سکیں۔

(۲) یہ حُکم، تکوینی تھا نہ کہ تکلیفی۔ یعنی فرمایا "پڑھنے والا بن جا"، اِسی لیے تیسری مرتبہ فرمایا "اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ" یعنی خدا کے نام سے، اُس کے حکم سے، اور محض اُس کی قوت سے نہ کہ اپنی ذاتی قوت سے پڑھنے والا بن جا، کیونکہ خدا جانتا ہے کہ تو اُن پڑھ ہے اور اپنے ارادے و قوت سے پڑھ نہیں سکتا، لیکن اب چونکہ خدا چاہتا ہے کہ تو پڑھنے والا بن جائے وہ خدا جس نے انسان کو نطفہ کے لوتھڑے سے پیدا کیا اور ایسا بنا دیا کہ وہ مکمل آدمی ہو کر دیکھتا، سنتا، اور سمجھتا ہے، لہٰذا ایسے ہی خدا کی قوت سے تو بھی پڑھنے والا بن جائے گا تاکہ جو کچھ وحی اُس کے پاس سے آئے تو اُسے لوگوں کے سامنے پڑھ سکے۔

اکاکرم[1]" آپ اِس ماجرے کے بعد دھڑکتے دل کے ساتھ خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ عنہا کے پاس پہنچے اور فرمایا "مجھے کمبل اڑھاؤ، کمبل اڑھاؤ"، آپ کو کمبل اڑھا دیا گیا۔ جب آپ کا ڈر دور ہو گیا تو آپ نے خدیجہ کو تمام ماجرا سنا دیا اور کہا "مجھے اپنی نسبت بہت ڈر[2] پیدا ہو گیا ہے"، خدیجہ نے کہا "ہرگز نہیں۔ خدا آپ کو کبھی رسوا نہیں کرے گا۔ آپ رشتہ داری کا پاس کرتے ہیں بیکسوں کا بار اٹھاتے ہیں۔ تہی دستوں کی مدد کرتے ہیں۔ مہمان نوازیں۔

---

(۱) یہاں مختصر ہے۔ باب التفسیر میں اتنا اور اضافہ ہے "الذی علم بالقلم علم الانسان ما لم یعلم"

(۲) اِس بارے میں علماء کا اختلاف ہے کہ آپ کو کس بات کا خوف پیدا ہو گیا تھا۔ بعضوں نے کہا ہے کہ جنون کا اندیشہ تھا اور یہ کہ آپ نے جو دیکھا، کہیں وہ جنات نہ ہو۔ لیکن قاضی ابوبکر بن عربی نے اِس سے انکار کیا ہے۔ حافظ ابن حجر بھی اِس انکار میں اُن کے ساتھ ہیں، مگر کہتے ہیں کہ یہ حدیث متعدد طریقوں سے روایت ہوئی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ خدیجہ رضؓ کے جواب سے یہی بات ظاہر ہوتی ہے۔ لیکن اس پر یہ اشکال پیش کیا گیا ہے کہ وحی کے ساتھ پیغمبر کو اِس بات کا قطعی علم ہوتا ہے کہ وہ اللہ کی طرف سے وحی ہے اور یہ کہ جس کے ذریعہ پہنچ رہی ہے، وہ فرشتہ ہی ہے۔ اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ پیغمبر کو یہ علم اُس وقت ہوتا ہے جب فرشتہ اُس سے اپنا تعارف کرا چکتا ہے، مگر اِس پہلے موقعہ پر فرشتہ کا ظہور صرف اِس لیے ہوا تھا کہ آپ اُس سے مانوس ہو جائیں اور احکام کی وحی قبول کرنے کے لیے طیار ہو سکیں پڑھنے کا حکم، تکوینی حکم تھا نہ کہ تکلیفی، کیونکہ آپ پڑھنا جانتے ہی نہ تھے۔ بعضوں نے کہا ہے کہ آپ کو اپنی موت کا ڈر پیدا ہو گیا تھا۔ یہ زیادہ محتمل ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی اقوال ہیں مگر تکلف سے خالی نہیں۔ بہرحال اس روایت سے ظاہر ہے کہ فرشتہ کو دیکھنے کے بعد آپ سمجھ نہ سکے کہ نبی ہو گئے ہیں، اور یہ کہ جسے آپ نے دیکھا ہے وہ فرشتۂ وحی، جبریل علیہ السلام ہیں۔ اس کی تائید ورقہ کے واقعہ سے بھی ہوتی ہے۔

لوگوں کی مصیبتوں میں کام آتے ہیں،، پھر خدیجہؓ آپ کو ورقہ بن نوفل ابن اسد بن عبد العزیٰ کے پاس لے گئیں، جو اُن کے چچیرے بھائی ہوتے تھے۔ ورقہ، جاہلیت میں عیسائی ہو گیے تھے۔ عبرانی زبان جانتے تھے اور انجیل کو عبرانی میں لکھتے تھے۔ وہ بہت بوڑھے اور اندھے تھے۔ خدیجہؓ نے اُن سے کہا "اے ابن عم، ذرا اپنے بھتیجے کا قصہ سنو" ورقہ نے آپ کو مخاطب کر کے کہا "میرے بھتیجے، کیا بات ہے؟" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ دیکھا تھا، سنا دیا۔ ورقہ نے کہا "یہی وہ ناموس ہے جو موسیٰ پر اللہ نے اتارا تھا۔ کاش میں اُس وقت جوان ہوتا، کاش میں اُس وقت تک زندہ رہتا جب تجھے، تیری قوم جلاوطن کردیگی!" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "کیا میری قوم مجھے نکال دیگی؟" ورقہ نے جواب دیا "ہاں، جو آدمی بھی ویسی بات لایا جیسی تم لائے ہو، لوگوں نے اُس سے دشمنی کی ہے۔ اگر میں آپ کے زمانہ تک زندہ رہا، تو آپ کی پوری پوری مدد کرونگا"۔ اِس واقعہ کے بعد ہی ورقہ مر گیے۔ اور وحی کا سلسلہ رُک گیا۔

ابن ہشام کی روایت ہے کہ ابو سلمہ بن عبد الرحمٰن نے مجھ سے بیان کیا کہ جابر بن عبد اللہ انصاری نے سلسلۂ وحی کے منقطع ہو جانے کا واقعہ بیان کرتے ہوئے کہا کہ نبی صلعم نے فرمایا "میں چلا جا رہا تھا کہ یکایک

آسمان پر سے ایک آواز سنائی دی۔ میں نے آنکھ اٹھا دی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ وہی فرشتہ جو غار میں میرے پاس آیا تھا آسمان و زمین کے مابین ایک کرسی پر بیٹھا ہے۔ میں اُس سے مرعوب ہو گیا۔ ڈر گیا۔ میں نے (گھر لوٹ کر گھر والوں سے کہا) مجھے کمبل اڑھاؤ۔ اُسی وقت خدا نے یہ وحی نازل فرمائی "یا ایھا المدثر قم فانذر و ربک فکبر و ثیابک فطھر الخ
اِس کے بعد وحی کا سلسلہ جاری ہو گیا[1] الخ"

---

(۱) یعنی تبلیغ کے پورے بیس سال تک وحی کا سلسلہ جاری رہا لیکن وہ حسب ضرورت تھوڑی تھوڑی نازل ہوا کرتی تھی۔ کبھی کوئی پوری سورۃ بیک دفعہ نازل ہو جاتی تھی۔ کبھی متفرق آیتیں نازل ہوتی تھیں۔ کبھی کچھ مدت کے لیے وحی رُک جایا کرتی تھی جیسا کہ سورۂ وَالضُّحٰی کے سبب نزول میں روایت کیا گیا ہے۔ یہ روایت در منثم کی سمجھ میں نہیں آئی اسی لیے گمان کر بیٹھا کہ یہ سورۃ، وحی کے رک جانے کے بعد سب سے پہلے نازل ہوئی تھی۔ حالانکہ احادیث میں وارد ہے کہ اِس سے پہلے کئی سورتیں اتر چکی تھیں۔ اِس سورۃ کا سببِ نزول صحیحین کی روایت جندب بن سفیان میں یہ بتایا گیا ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت کچھ ناساز ہو گئی تھی، اور آپ نے دو یا تین رات شب بیداری نہ کی تھی (یعنی نماز و تلاوت سے معذور رہے تھے) اِس پر ایک عورت نے آپ سے کہا "اے محمد، میں سمجھتی ہوں کہ تمھارے شیطان نے اب تمھارا پیچھا چھوڑ دیا ہے، کیونکہ میں نے اُسے تمھارے پاس دو تین رات سے نہیں دیکھا!" اِسی کے جواب میں یہ سورۃ نازل ہوئی جس عورت نے یہ گفتگو کی تھی وہ ابولہب کی بیوی، اُمِّ جمیل بنت ابی سفیان تھی، جیسا کہ حاکم نے، زید بن ارقم سے روایت کیا ہے۔ یہ واقعہ سورۂ تَبَّتْ یَدَا اَبِی لَھَبٍ کے نازل ہونے کے بعد کا ہے۔ ابن جریر نے دو مُرسَل طریقوں سے روایت کیا ہے کہ ایک مرتبہ جبریل کے آنے میں دیر ہوئی تو آپ بہت ہی زیادہ بے قرار ہو گئے۔ یہ دیکھ کر حضرت خدیجہؓ نے عرض کیا: میں سمجھتی ہوں کہ آپ کا پروردگار آپ سے ناخوش ہو گیا ہے کیونکہ آپ اِس قدر بے قرار ہو جایا کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ سورۃ نازل ہوئی (باقی صفحہ ۱۰۹ پر)

میں کہتا ہوں کہ بخاری نے سورۂ مدثر کی تفسیر میں جابر کی یہ حدیث کئی طریقوں سے روایت کی ہے۔ بعض طریقوں میں آیا ہے کہ اس سورۃ کی ابتدائی آیتیں، اولین وحی ہے، اور بعضوں میں کہا گیا ہے، جیسا کہ یہاں لکھا گیا کہ یہ وحی کے درمیان میں رک جانے کی حدیث نبوی ہے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ آپ نے فرمایا "میں اِس قدر ڈر گیا تھا کہ زمین پر گر پڑا"

محدثین کے نزدیک آغاز قرآن کے بارے میں یہی حدیث معتمد علیہ ہے۔ مشہور ہے کہ سورۂ مدثر کی اولین آیتوں کے بعد سورۂ مزمل پوری نازل ہو گئی تھی اور اِس کے بعد سورۂ مدثر کی باقی آیتیں نازل ہوئیں۔ مجاہد کہتے ہیں کہ سب سے پہلے سورۂ "ن والقلم" نازل ہوئی۔ مگر یہ غلط ہے۔ علی کرم اللہ وجہہ سے روایت ہے کہ سب سے پہلے سورۂ فاتحہ نازل ہوئی۔ ہمارے شیخ (یعنی مفتی محمد عبدہ) نے بھی اِسی روایت کو پسند کیا ہے۔ کیونکہ اُن کے نزدیک سورۂ فاتحہ ہی کو سب سے پہلے اترنا چاہیے۔ مگر کہا جا سکتا ہے کہ تمہیدی وحی کے بعد سب سے پہلے جو پوری سورۃ نازل ہوئی، وہ یہی سورۂ فاتحہ تھی۔ اِس کے بعد نماز فرض ہوئی اور سورۂ مزمل

(باقی صفحہ ۱۰۸ کا) لیکن صحیحین کی مذکورۂ بالا روایت کے مقابلہ میں اِس روایت کی کوئی وقعت نہیں اگرچہ حافظ ابن حجر نے یہ کہکر دونوں میں تطبیق دینے کی کوشش کی ہے کہ خدیجہؓ نے یہ بات ہمدردی کی راہ سے کہی تھی اور اُمِ جمیل نے شماتت کی راہ سے۔

نازل ہوئی یا یہ دونوں سورتیں بیک وقت نازل ہوئیں۔

علماء فرنگ، وحی محمدیؐ کی کس طرح تصویر اتارتے ہیں؟

میں وہ تمام مقدمات بیان کرچکا ہوں جو اِن علماء فرنگ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ، آپ کی نفسی وعقلی کیفیت، آپ کی قوم ووطن کی حالت سے استنباط کیے ہیں، نیز یہ بھی بتاچکا ہوں کہ انھوں نے آپ کے سفروں اور غار حراء میں عبادتوں سے کیا کیا قیاسات کیے ہیں۔ ساتھ ہی وحی کی صفت اور اُس کے آغاز والتواء، اور آپ کی تبلیغ و دعوت کی ابتداء کے بارے میں صحیح ترین حدیثیں بھی پیش کرچکا ہوں۔

اب میں بتاتا ہوں کہ اِن لوگوں نے کس طرح فرض کرلیا ہے کہ یہ وحی اُن کے مفروضہ اسباب سے خود محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دل ودماغ سے پھوٹی تھی۔ اِس چیز کو میں عقل سے اِس درجہ قریب کر دکھاؤنگا کہ اِس کی نظیر میں نے کہیں اور نہیں دیکھی، اِس کے بعد عقل ونقل وتاریخ اور صحیح سیرت نبوی کے دلائل سے اِس تمام ہوائی قلعہ کو جڑ سے اکھاڑ پھینکونگا چنانچہ کہتا ہوں:

اِن لوگوں کا قول ہے "محمد کی ہیولانی عقل نے اپنے ذاتی نور سے دیکھ لیا کہ اُن کی قوم کی بُت پرستی، باطل ہے۔ بت پرستی کا بطلان محمد

کے سوا بعض دوسرے عربوں نے بھی معلوم کر لیا تھا،،

بہت اچھا مان لیا۔

"آپ کی پاک فطرت نے عربوں کی سود خواری اور قمار بازی کو حقیر سمجھا،،

بہت اچھا، مان لیا۔

"آپ کی غربت اور ابو طالب کی تنگدستی نے آپ کو عربوں کی شہوت پرستی، شراب خواری، عیّاشی سے بچا لیا،،

لیکن یہ قول غلط ہے۔ صحیح یہ ہے کہ آپ نے یہ چیز ناپسندیدگی کی راہ سے چھوڑی تھی نہ کہ مجبوری سے۔

"آپ بہت سوچتے رہے کہ کس طرح عربوں کو اس بُرے شرک سے نکالیں اور کس طرح اِن بدکاریوں سے اُنہیں پاک کر دیں،،

خیر کچھ حرج نہیں۔

"آپ کو اپنے سفروں سے فائدہ پہنچا۔ اِن سفروں میں اور خود مکہ میں بکثرت عیسائیوں سے ملاقات کا موقعہ ملا اور اُن سے بنی اسرائیل کے پیغمبروں کی نسبت بہت سی معلومات آپ نے حاصل کیں جنہوں نے اسرائیلیوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی بخشی تھی،،

یہ چیز ہمارے ہاں ثابت نہیں، مگر اس سے ہمیں کوئی نقصان

بھی نہیں۔

"آپ کو عیسائیوں سے جو معلومات حاصل ہوئیں، آپ کی عقل نے اُنہیں ٹھیک نہیں سمجھا، کیونکہ مسیح اور اُن کی والدہ کی الوہیت کے ذریعہ مسیحیت بھی شرک سے آلودہ ہو چکی تھی اور اُس میں دوسری بہت سی خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں،،

یہ دعویٰ پہلے دعوے پر مبنی ہے۔ معقول ہے مگر منقول نہیں۔

"آپ سن چکے تھے کہ پچھلے پیغمبروں کی طرح ایک عرب پیغمبر بھی حجاز میں پیدا ہوگا، جس کی عیسیٰ مسیح وغیرہ انبیاء نے بشارت دی ہے۔ یہ خیال آپ کے دل میں جم چکا تھا اور آپ کو امید ہو گئی تھی کہ وہ پیغمبر آپ ہی ہونگے جس کے ظہور کا وقت آ چکا ہے،،

یہ اوپر کے مقدمات کا ایک استنباط ہے اور اِس کی قلعی آگے کھولی جائیگی۔

اِن سب باتوں کا نتیجہ یہ نکالا گیا ہے کہ آپ اپنی منزل مقصود تک اِس طرح پہنچے کہ غار حراء میں بیٹھکر اللہ کی عبادت و توجہ کی۔ اِس سے آپ کا ایمان قوی ہو گیا۔ ضمیر بلند ہو گیا۔ دماغ میں وسعت پیدا ہو گئی بصیرت کا نور بہت بڑھ گیا، اور آپ کی بڑی عقل، ملکوتُ السّماداتِ و لکارض کی اُن نشانیوں کی اصلیت تک پہنچ گئی جو اِس تمام کائنات کی موجد اور

اِس حیرت انگیز نظام کا اصلی راز ہے۔ اِسی روشنی نے آپ میں قابلیت پیدا کر دی کہ لوگوں کی رہنمائی کریں اور اُنہیں ظلمت سے نور میں لے آئیں۔ آپ برابر سوچتے اور غور کرتے رہے، بے چین و پریشان ہوتے رہتے، تکلیفوں اور آرزوؤں میں گردش کرتے رہے یہاں تک کہ یقین ہو گیا کہ آپ وہی نبی ہیں جس کا انتظار کیا جا رہا ہے اور جسے خدا انسانوں کی ہدایت کے لیے بھیجنے والا ہے۔ یہی یقین پہلے خواب میں ظاہر ہونے لگا پھر قوت حاصل کر کے یہ حالت ہو گئی کہ بیداری میں بھی معلوم ہونے لگا کہ فرشتہ وحی سنا رہا ہے۔

رہ گیے وہ معلومات جو آپ کو اِس وحی سے حاصل ہوئے تو اُن کے بارے میں یہ لوگ کہتے ہیں کہ درحقیقت اُنہی معلومات سے ماخوذ ہیں جن کی طرف اوپر اشارہ گزر چکا ہے، نیز آپ کی عقل کو بھی اِن میں دخل تھا جو غلط و صحیح میں تمیز کر سکتی تھی۔ لیکن خود آپ اپنے ان معلومات کو آسمان ہی سے نازل ہوتے سمجھتے تھے اور یہ کہ خود خدائے عزوجل آپ سے ناموس اکبر کے ذریعہ خطاب کر رہا ہے، وہ ناموس اکبر جو وحی کا فرشتہ یعنی جبریل ہے جو موسیٰ بن عمران اور عیسیٰ بن مریم اور دوسرے انبیاء علیہم السلام پر نازل ہوا کرتا تھا۔

ایک مصری مُلحد کہتا ہے کہ یونانی حکیم، سولن نے اپنی قوم کے

لیے ایک قانون یا شریعت بنادی تھی، لہذا عقل کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں کہ محمد نے بھی ایک شریعت بنادی۔ اِس خیال کا فساد بھی میں عنقریب دکھادوں گا۔

مخالفین کے مزاعم کا بُطلان

ا۔ جن مقدمات سے یہ نیتجہ اِن لوگوں نے نکالا ہے، اُن میں سے اکثر محض خیال کی پیداوار ہیں، یا بے بنیاد دعوے ہیں، نہ کہ ثابت تاریخی واقعات، جیساکہ ہم اوپر بتا آئے ہیں۔ اور یہ طے شدہ اصل ہے کہ جب مقدمات باطل ہوگیے تو نیتجہ بھی باطل ہے۔

مثلاً یہ لوگ کہتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے شام کے عیسائیوں کی زبانی سنا تھا کہ ایرانی، رومیوں پر غالب آگیے ہیں۔ اِن لوگوں نے یہ اِس لیے کہا ہے کہ سورۂ روم کے شروع میں رومیوں کے غلبہ کی جو پیشینگوئی آئی ہے، اُسے اُنہی باتوں کا نیتجہ بتائیں جو آپ نے شامی عیسائیوں سے بقول اِن کے سنی ہونگی۔ لیکن یہ چیز تاریخ وعقل دونوں کی رو سے مردود ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ ایرانیوں کا رومیوں پر غلبہ سنہ ۶۱۰ء میں ہوا تھا یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری سفر شام کے چودہ برس بعد اور آغاز وحی

سے ایک سال پہلے۔ پھر تاریخ ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ اُس زمانہ میں، رومی سلطنت کی حالت اس درجہ ابتر تھی کہ کسی کو امید نہیں ہو سکتی تھی کہ زبردست ایران کو مغلوب کر سکتی ہے۔ حتیٰ کہ خود مکہ والے بھی اس قرآنی پیشین گوئی پر ہنسے تھے۔ ابوبکرؓ نے اُن میں سے ایک شخص سے اسی پیشین گوئی کے بارے میں شرط باندھی تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اُنہیں اِس شرط کی اجازت دیدی تھی اور وہ جیت گیے۔

عقل کہتی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جیسی عقل رکھنے والا ـــــ جس کی بڑائی پر سب متفق ہیں ـــــ ناممکن ہے کہ جزم ووثوق کے ساتھ اعلان کر دے کہ چند سال کے اندر رومی ضرور ایرانیوں کو شکست دیدیں گے۔ اِس قسم کی بات نہ عقل سے کہی جا سکتی ہے کہ دل کی وحی سے جو غیر معتبر خبروں پر مبنی ہو۔ رومیوں کو ۶۲۲ء میں فتح نصیب ہوئی تھی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو وحیٔ تبلیغ ۶۱۴ء میں ہوئی۔ اگر فرض کیا جائے کہ سورۂ روم اسی سال نازل ہوئی تو مطلب یہ ہوگا کہ رومی فتح اِس کے آٹھ سال بعد پیش آئی۔ اور اگر یہ سورۃ دوسرے سال نازل ہوئی ہے تو فتح سات برس بعد قرار پاتی ہے۔ تفسیر میں اِسی پر اعتماد کیا گیا ہے۔ قرآن کی پیشین گوئی میں "بِضْعِ سِنِيْنَ" فرمایا گیا ہے (یعنی چند سال کے اندر) "بِضْعُ" کا لفظ تین سال اور نو سال کی درمیانی

مدت کے لیے بولا جاتا ہے۔ فرمایا ”غُلِبَتِ الرُّومُ فِي أَدْنَى الْأَرْضِ وَهُمْ مِنْ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُونَ فِي بِضْعِ سِنِينَ“ بضع سنین فرمایا۔ یہ نہیں کہا کہ سات سال یا آٹھ سال بعد۔ اور یہ اس لیے کہ معلوم ہو جائے کہ فتح اُس جنگ کا نتیجہ ہوگی جو اِس زمانے میں جاری رہے گی۔ وحی و عبرت کی پیشین گوئیاں، تاریخ کے اسلوب پر نہیں ہوا کرتیں کہ واقعات کو سنوں اور برسوں سے محدود کر دیا جائے۔ قرآن میں مسلمانوں سے فتحمندی کے بکثرت وعدے کیے گیے ہیں اور جو پیشین گوئیاں کی گئی ہیں اُن میں بھی برسوں اور مہینوں کا ذکر نہیں ہے، بنابریں یہ سورۂ روم کی آیت بالکل نرالی ہے۔

اُن کے مزاعم کی ایک دوسری مثال دیکھو۔ وہ کہتے ہیں کہ آپ اپنے سفرِ شام میں سرزمین مَدْیَن سے گزرے اور وہاں کے باشندوں سے باتیں کیں۔ یہ کہکر وہ دکھانا چاہتے ہیں کہ قرآن میں مدین کے واقع کہاں سے آئے۔ لیکن یہ بالکل غلط ہے جیسا کہ ہم اُن کے مقدمات کے سلسلہ میں بیان کر آئے ہیں۔ اور اگر یہ دعویٰ صحیح ہو تو بھی کون عقل باور کر سکتی ہے کہ آپ نے راستہ میں نامعلوم لوگوں سے جو ناقابل اعتبار باتیں سنیں، اُنہیں اُس وحی کی بنیاد بنا سکتے ہیں جو موسیٰ اور شعیب علیہ السلام کے قصہ میں وارد ہوئی ہے۔

۲۔ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شام میں عیسائی عالموں سے کچھ بھی سنا ہوتا یا اُن کی صحبت میں بیٹھے ہوتے تو آپ کے پیرو اُس کا ذکر ضرور کرتے، کیونکہ اُنہوں نے وہ سب جمع کر دیا ہے جس کا آپ سے کچھ بھی لگاؤ تھا، اگرچہ وہ صحیح ثابت نہ بھی ہو۔ اُنہوں نے اپنا فرض واقعات کا جمع کرنا سمجھا تھا اور اُن کی صحت کا معاملہ، اِسناد پر چھوڑ دیا تھا۔

۳۔ اگر اِس قسم کی کوئی بات ہوئی ہوتی جس کا اِن لوگوں نے دعویٰ کیا ہے تو آپ کے مکہ والے دشمن ضرور کہتے کہ تمھارا یہ وحی کا دعویٰ فضول ہے۔ یہ سب باتیں تم نے شام میں عیسائیوں سے سیکھی ہیں، کیونکہ وہ اِس سے کہیں زیادہ کمزور اور بیہودہ اعتراض کیا کرتے تھے۔ چنانچہ مکہ میں ایک رومی لوہار تھا جو تلواریں بنایا کرتا تھا۔ آپ اُس کی دوکان کے سامنے کھڑے ہو کر کبھی کبھی اُس کا کام دیکھا کرتے تھے۔ اِتنی سی بات کو یہ دشمن لے اُڑے اور کہنا شروع کر دیا کہ آپ اِسی لوہار کے شاگرد ہیں۔ اِس کی تردید میں خدا نے فرمایا:

وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ لِسَانُ الَّذِىْ يُلْحِدُوْنَ اِلَيْهِ اَعْجَمِىٌّ وَّهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِىٌّ مُّبِيْنٌ (۱۶: ۱۰۳)	ہم خوب جانتے ہیں کہ یہ لوگ کہہ رہے ہیں کہ اسے (نبیؐ کو) ایک آدمی ہی سکھایا کرتا ہے حالانکہ جس شخص کی نسبت یہ بکواس ہے، اُسکی زبان اعجمی ہے اور یہ قرآن، صاف کھلی ہوئی عربی زبان ہے

۴۔ قرآن کی صریح نصوص کہہ رہی ہیں کہ آپ وحی سے پہلے پیغمبروں کے واقعات اور قصّے بالکل نہ جانتے تھے۔ علماء فرنگ بھی ہماری طرح مانتے ہیں کہ آپ کبھی دروغ سے آلودہ نہیں ہوئے۔ پس اگر آپ نے کبھی کسی آدمی کے مقابلہ میں غلط بیانی سے کام نہیں لیا تو اللہ عزوجل کے ساتھ ایسا کیونکر کرسکتے ہیں، جیسا کہ خود آپ کے سب سے بڑے دشمن، ابوجہل نے بھی اعتراف کیا ہے۔ نیز یہ علماء، فرنگ ہماری طرح یہ بھی مانتے ہیں کہ آپ کا اللہ پر اور اُس کی بھیجی ہوئی وحی پر ایمان بہت ہی پختہ تھا۔

آپ کو پیغمبروں کے حالات معلوم نہ ہونے کی نسبت قرآن نے جابجا اشارہ کیا ہے۔ سورۂ قصص میں موسیٰ کا مدین میں حال بیان کرنے کے بعد فرماتا ہے:

وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ إِذْ قَضَيْنَا إِلَىٰ مُوسَى الْأَمْرَ وَمَا كُنْتَ مِنَ الشَّاهِدِينَ، وَلَٰكِنَّا أَنْشَأْنَا قُرُونًا فَتَطَاوَلَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ، وَمَا كُنْتَ ثَاوِيًا فِي أَهْلِ مَدْيَنَ تَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِنَا وَلَٰكِنَّا كُنَّا	تو پچھم طرف نہ تھا جب ہم نے موسیٰ پر رسالت اتاری۔ تو اس واقعہ کا دیکھنے والا نہ تھا لیکن منکروں کا معاملہ یہ ہے کہ ہم نے نسلوں پر نسلیں نکالیں تو ان پر مدت دراز ہوگئی (اور ان میں سرکشی آگئی) اور مدین میں بھی نہیں رہتا تھا کہ وہاں والوں کو ہماری آیتیں سناتا ہو (لہذا

مُرْسِلِیْنَ (۲۸: ۴۴ و ۴۵) | منکرونکا انکار بے بنیاد ہے کیونکہ رسولوں کو ہم ہی بھیجتے رہے ہیں

یا سورۂ ہود میں قصۂ نوح کے بعد فرماتا ہے:

تِلْكَ مِنْ اَنْبَاۗءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا فَاصْبِرْ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ (۱۱: ۴۹)	یہ غیب کی خبریں ہیں جنہیں ہم تجھ پر وحی کر رہے ہیں۔ اس سے پہلے نہ تو انہیں جانتا تھا نہ تیری قوم جانتی تھی، پس تو صبر کر، یقیناً نتیجہ میں پرہیزگار ہی کامیاب رہیں گے۔

اسی طرح سورۂ یونس میں حضرت یونس کے قصہ میں فرمایا ہے۔

۵۔ صحیح نہ ضعیف کسی حدیث میں بھی نہیں کہا گیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو امید تھی کہ نبیٔ منتظر وہی ہونگے جس کی بابت آپ کی بعثت کے پہلے بعض علماء یہود و نصاریٰ چرچا کیا کرتے تھے۔ اگر اس طرح کی کوئی بات ہوتی تو محدثین اُسے ضرور لکھ جاتے، جیسا کہ امیہ بن ابی الصلت کی نسبت لکھ گیے ہیں، کیونکہ وہ آپ کے بارے میں ہر بات ضرور لکھ دیا کرتے تھے۔

۶۔ آغاز وحی کی جو حدیث امام بخاری و امام مسلم اور دوسرے محدثین نے درج کی ہے، اُس سے صاف ظاہر ہے کہ آپ شروع شروع

فرشتہ کو دیکھکر خوفزدہ ہو گیے تھے اور یہ کہ دانشمند خدیجہ کے پاس آپ کو اطمینان دلانے اور خود اطمینان حاصل کرنے کا اس کے سوا کوئی ذریعہ نہ تھا کہ اپنے چچا کے لڑکے، ورقہ بن نوفل سے رجوع کریں جو عرب میں اِس معاملہ کو سب سے زیادہ جانتے تھے، کیونکہ عیسائی ہو چکے تھے اور یہود و نصاریٰ کی کتابیں پڑھی تھیں۔

۷۔ اگر محمدؐ کو اپنی نبوت کی امید و آرزو ہوتی، تو لبقول مخالفین جب غار حراء میں خلوت و عبادت، اور پریشان خیالی و جوش دلی کے بعد آپ میں نبوت کی پوری قابلیت پیدا ہو گئی تھی اور آپ نے سمجھ لیا تھا کہ آپ کی یہ آرزو پوری ہو گئی ہے، اگر واقعہ یہی ہوتا، تو ضرور آپ کی ولولہ انگیز طبیعت کا جوش اور روشن دماغی کا جوہر فوراً ہی قرآن کی ایک یا کئی بلیغ ترین سورتوں میں ظاہر ہو جاتا، جن میں آپ ایمان کے اصول، اللہ کی توحید، شرک کی بیخ کنی، بت پرستی کی مخالفت، کفر و طغیان کے سرداروں کی دنیا و آخرت میں رسوائی کو بیان کر دیتے، جیسا مفصّل سورتوں، خصوصاً "ق والقرآن المجید" والذاریات، الطور، النجم القمر، پھر الحاقّۃ، اَلنّبأ میں یا متوسط سورتوں میں جو دلائل اور عبرتوں سے لبریز ہیں، جیسے سورۂ الانبیاء، الحج، المومنون میں بیان کیا گیا ہے۔ لیکن واقعہ اِس طرح پیش نہیں آیا بلکہ ہوا یہ کہ آغاز وحی کے بعد

تین سال تک آپ اِس حال سے رہے کہ نہ کسی کو کوئی سورۃ سنائی، نہ کوئی دعوت دی۔ نہ اپنے خاندان، گھر، یا دوستوں سے اُس دینی اصلاح کے بارے میں کوئی گفتگو کی جس کا آپ بجتہ ارادہ کر چکے تھے۔ نہ اُن خرافات ہی کی کوئی مذمت کی جن سے آپ بیزار ہو چکے تھے کیونکہ اگر آپ نے اِس قسم کی کوئی بات کہی ہوتی یا کی ہوتی تو اس کا ذکر ضرور آجاتا۔ کوئی نہیں تو وہی لوگ اس بارے میں کچھ کہتے جو آپ سے سب سے زیادہ وابستہ تھے مثلاً آپ کے گھر میں خدیجہ، علی، زید بن حارثہ، اور دوستوں میں ابو بکر صدیق جن کا آپ سے زندگی بھر ساتھ رہا۔ سب کا یہ سکوت اِس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ علماءِ فرنگ نے وحی ذاتی کے لیے آپ کی طیاری، اور لوگوں سے سنی سنائی باتوں پر آپ کے علوم کے مبنی ہونے کی نسبت جو کچھ کہا ہے، سراسر بے بنیاد ہے۔

۸۔ واقعات اور ضرورتوں کے مطابق نزول وحی کی جو ترتیب روایت کی گئی ہے، وہ ہمارے خیال کی مؤید ہے۔ چنانچہ سورۂ مدّثر کے پہلے حصہ کے بعد چند آیتیں ولید بن مغیرہ مخزومی کے بارے میں نازل ہوئیں۔ ولید کا واقعہ یہ ہے کہ ابو جہل نے سنا کہ ولید نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن سنا اور پسند کیا ہے، چنانچہ معترض ہوا اور کہنے لگا اب کوئی ایسی بات کہہ دو جس سے تمھاری قوم کو یقین ہو جائے کہ تم

محمد اور اُن کے قرآن کو ناپسند کرتے ہو۔ ولید نے جواب دیا میں کیا کہوں؟ بخدا تم میں کوئی نہیں جو مجھ سے زیادہ شعر کو، اُس کے رجز و قصیدے کو، اور جنّات کے اشعار کو پرکھ سکتا ہو، بخدا محمد نے جو کچھ کہا ہے، وہ اِس طرح کی کوئی چیز بھی نہیں ہے۔ بخدا اُن کی یہ چیز بڑی میٹھی ہے۔ بڑی آب وتاب والی ہے۔ اُس کا اوپر بھی روشن ہے اور اُس کا نیچا بھی چمکیلا ہے۔ وہ خود غالب آجانے والی ہے۔ اُسے کوئی مغلوب نہیں کرسکتا۔ جو چیز بھی اُس کے سامنے آجائیگی، اُسے پاش پاش کرکے ڈال دے گی! ابوجہل نے کہا کچھ بھی ہو، تمھاری قوم اُس وقت تک ہرگز راضی نہیں ہوگی جب تک تم کچھ برائی نہیں کروگے۔ ولید نے کہا اچھا، ٹھہرو۔ مجھے سوچنے دو۔ پھر کہنے لگا "یہ جادو ہے جسے اِس نے کسی سے سیکھا ہے!" اِسی پر یہ آیتیں نازل ہوئیں؛ جیسا کہ حاکم نے ابن عباس سے باسناد صحیح، بخاری کی شرط پر روایت کیا ہے:

ذَرْنِیْ وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِیْدًا ، وَجَعَلْتُ لَهٗ مَالًا مَّمْدُوْدًا ، وَّبَنِیْنَ شُهُوْدًا وَّمَهَّدْتُّ لَهٗ تَمْهِیْدًا ، ثُمَّ یَطْمَعُ اَنْ اَزِیْدَ ، كَلَّا ، اِنَّهٗ	چھوڑ دو مجھے اور اُسے جسے میں نے اکیلا پیدا کیا، اُسے بہت سا مال دیا، حاضر باش بیٹے دیے، اُس کے لیے سب آسانیاں مہیّا کردیں، اِس کے بعد بھی وہ لالچ کرتا ہے کہ اُسے اور بھی دونگا۔ ہرگز نہیں۔ وہ ہماری

كَانَ لِاٰيٰتِنَا عَنِيْدًا ۔ سَاُرْهِقُهٗ صَعُوْدًا ۔ اِنَّهٗ فَكَّرَ وَقَدَّرَ ۔ فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ۔ ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ۔ ثُمَّ نَظَرَ ۔ ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ ۔ ثُمَّ اَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ ۔ فَقَالَ اِنْ هٰذَا اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ ۔ اِنْ هٰذَا اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ (۷۴: ۱۱ تا ۲۵)	نشانیوں کا کٹر مخالف ہے۔ عنقریب اُسے مصیبت میں مبتلا کرونگا۔ اُس نے غور کیا اور اندازہ کیا، وہ مارا جائے کس طرح اُس نے اندازہ کیا، پھر مارا جائے کس طرح اندازہ کیا۔ پھر اُس نے نگاہ کی۔ پھر تیوری چڑھائی۔ پھر منہ بسُورا۔ پھر پیٹھ موڑی، اور تکبر کیا، پھر کہنے لگا ضرور یہ جادو ہے جو چلا آتا ہے۔ یہ آدمی ہی کا کلام ہے۔

۹۔ مسئلہ وحی پر گفتگو کرنے والے اِن علماء فرنگ نے جو کچھ محمدی معلومات قرار دئے ہیں، وہ اِس قدر کم مایہ اور سطحی ہیں کہ قرآنی وحی کا ہرگز سرچشمہ بن نہیں سکتے۔

قرآن اُس سب سے اعلیٰ، وسیع تر، اور مکمل ہے جسے بیچارے عرب بدوی کیا، جو سفر شام میں آپ کو ملے ہونگے، بلکہ بحیرا، نسطورا، بلکہ شام بلکہ تمام دنیا کے یہود و نصاریٰ جانتے تھے۔

قرآن اِس حال سے نازل ہوا ہے کہ ایک طرف اہل کتاب کی اِس لحاظ سے تصدیق کرنے والا ہے کہ اُن کی کتابیں اصل میں موسیٰ، عیسیٰ، داؤد، سلیمان وغیرہم پیغمبروں پر نازل ہوئی تھیں، اور دوسری طرف وہ اُن پر نگراں و حکمراں بھی ہے جیسا کہ سورۂ مائدہ کی اِس

آیت میں فرمایا گیا ہے:

وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ الخ	ہم نے اے پیغمبر تجھ پر حق کے ساتھ کتاب اُتاری ہے جو آسمانی کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے اور اُن پر حاوی و حکمراں ہے۔

اہل کتاب یعنی یہودیوں اور عیسائیوں کے خلاف قرآن نے جو فیصلے کیے ہیں، اُن میں ایک یہ ہے کہ:

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً، يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ الخ	چونکہ انہوں نے اپنا عہد توڑ ڈالا، اس لیے ہم نے انہیں لعنت کی اور اُن کے دل سخت بنا دیے وہ لفظوں کو اُن کی جگہوں سے ہٹاتے ہیں اور جو ہدایت اُن پر آئی تھی، اُس کا ایک حصہ بھول چکے ہیں۔

قرآن نے بکثرت ایسے بڑے بڑے مسائل طے کر دیے ہیں جن میں اہل کتاب نے مخالف رائے قائم کر رکھی ہے یا باہم اختلاف کیا ہے۔ اس ضمن میں عقائد، احکام، اور تاریخی واقعات سبھی داخل ہیں۔ ظاہر ہے قرآن کے یہ فیصلے اُن راہبوں، پادریوں، اور دوسرے عیسائیوں سے ماخوذ نہیں ہو سکتے جنہوں نے بقول علماء فرنگ،

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کے سفرِ شام کے دوران میں اپنے مذہبی معلومات سے مستفید کیا تھا، عام اس سے کہ آریوس اور اُس کے پیروں کی طرح ان راہبوں وغیرہ میں موسوی وعیسوی توحید کچھ نہ کچھ باقی ہو یا نہ ہو، یا اُن انجیلوں کا کوئی حصہ موجود ہو جنہیں چرچ نے غیر قانونی قرار دیا ہے جیسے انجیل طفولیتِ مسیح یا انجیل برناباس۔ محمدؐ نے شام میں یا مکہؓ میں چرچ کی کانفرنسوں کی طرح کوئی مسیحی کانفرنس منعقد نہیں کی تھی کہ انجیلوں اور عیسوی مذہبوں کے مابین فیصلہ کریں اور ایک کو دوسرے پر ترجیح دیں۔

ظاہر ہے اِس سفرِ شام میں آپ کے لیے قطعًا ناممکن تھا کہ انجیلوں اور مسیحی مذہبوں کے مابین محاکمہ کریں۔ اِس بارے میں کوئی ایک روایت بھی نہیں آئی ہے اور اِس بات کا دعویٰ کرنے والے بھی خوب جانتے ہیں کہ عقلاً یہ محال ہے۔ اور فرض کرو کہ ایسا ہوا تھا تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اِس تھوڑی سی مہلت میں کیونکر آپ یہ محاکمہ کرسکے اور کس طرح آپ کو اپنے فیصلے کے صحیح ہونے کا یقین ہوگیا؟ حالانکہ صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ آپ نے اپنے صحابہ کو حکم دیا تھا کہ اہل کتاب کی نہ تصدیق کریں نہ تکذیب، یعنی اُن باتوں میں جن سے قرآن نے خاموشی اختیار کی ہے، اور یہ اس لیے کہ شاید تکذیب اُس

چیز کی ہو جائے جو اصلی آسمانی کتاب میں سے محفوظ ہے یا تصدیق اُس چیز کی ہو جائے جس کی حقیقت اہل کتاب بھول چکے ہیں یا جس میں انھوں نے تحریف و تبدیل کر دی ہے۔

۱۰۔ قرآن میں ایسی باتیں بھی ہیں جو نئے اور پرانے دونوں عہدناموں کے خلاف ہیں اور آج تک معلوم نہیں ہوا کہ کسی ایک عیسائی یا یہودی کا بھی وہ خیال ہو جو قرآن نے پیش کیا ہے۔ مثلاً قرآن نے کتاب خروج کی مخالفت کی ہے۔ توراۃ کہتی ہے کہ حضرت موسیٰ کو بیٹا بنانے والی، فرعون کی لڑکی تھی، مگر قرآن کہتا ہے کہ وہ فرعون کی بیوی تھی۔ یا یہ کہ توراۃ میں لکھا ہے کہ جس بچھڑے کی بنی اسرائیل نے پوجا کی تھی، اس کا تعلق ہارون علیہ السلام سے ہے، لیکن قرآن نے اُسے سامری کی طرف منسوب کیا ہے اور ہارون کی اُس سے بیزاری ثابت کی ہے۔

بلکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اُس سب سے کہیں بڑھ چڑھ کر چیز لائے ہیں جو آسمانی کتابوں میں موجود ہے۔ عام اِس سے کہ اُن کی صحت ثابت ہو یا نہ ہو جیسا کہ عنقریب ہم بیان کر دیں گے۔

اسے بہتان تراشو، ٹھہرو۔ تم وہ کہتے ہو جسے خود بھی نہیں جانتے۔ قرآنی وحی تمھارے زعم سے کہیں بلند ہے، اور تمھارے تصوّر و تصویر سے کہیں بڑی ہے۔ محمدؐ تمھارے مزعوم کسی علم سے کہیں کم، لیکن روح القدس

کے ذریعہ کلام اللہ قبول کرنے کے لیے تمھارے وہم سے کہیں زیادہ مستند تھے!

چونکہ قرآن کی وحی، تمام پیغمبروں کی محفوظ تعلیمات سے زیادہ اعلیٰ و اکمل ہے، کیونکہ وہ سب کی "خاتم" اور اُن کی خاص اور وقتی شریعتوں کو مکمل کرنے والی ہے، اِس لیے اُسے کم از کم یونانی فلسفی سولن کے قانون سے زیادہ مکمل ہونا چاہیے، جس سے ہمارے زمانہ کے ایک مصری ملحد نے محمد صلی اللہ کو تشبیہہ دی ہے، حالانکہ دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے: ایک اَن پڑھ ہے جو اَن پڑھوں میں بڑھا پلا ہے اور ایک فیلسوف ہے جس نے حکمت و قانون و سلطنت و سیاست کی قوم میں پرورش پائی ہے اور قوم و سلطنت کے ہر معاملہ میں دخیل رہا ہے[1]۔

---

(۱) سولن، یونان کے سات فلسفیوں میں سے ایک ہے۔ میلادِ مسیح سے سات صدی پہلے گزرا ہے۔ اُس کی ماں، آخری شاہ ایتھنز، بستراتوس کی رشتہ دار تھی۔ سولن، مالداروں اور جنگی آدمیوں میں سے تھا۔ اپنے ملک میں بعض انتظامی اور جنگی عہدوں پر مامور رہا ہے ۵۹۴ ق م وہ تمام پارٹیوں کی طرف سے قوم کا سردار منتخب کیا گیا اور اُسے اختیار دیا گیا کہ ملک کے نظم و نسق اور قوانین میں جو ترمیم چاہے کر دے۔ چنانچہ اُس نے سابق نظام میں تبدیلی کی اور اسی سے ایک نظام بنایا جسے حکومت اور قوم نے دس برس کے لیے منظور کر لیا۔ اِس سے ظاہر ہوا کہ سولن، دانائی اور تہذیب کی سب سے بڑی قوم کا قانون بنانے والا تھا۔ اُس کی پوزیشن اپنی قوم میں یہ تھی کہ فیلسوف، حاکم، سپہ سالار، اور سردار تھا۔ ایسے شخص پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو قیاس کرنا کہاں تک روا ہے جو امی تھے، جنہوں نے کبھی کوئی ایک سطر بھی نہیں پڑھی۔ کوئی کتاب نہیں (باقی صفحہ ۱۲۸ پر)

محمدؐ میں نبوت کی قابلیت

شروع زندگی سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت اور نبوت کے لیے آپ کی من جانب اللہ طیاری کے بارے میں تحقیقی بات یہ ہے کہ خدا نے آپ کو فطرت کے لحاظ سے کامل پیدا کیا تھا تاکہ دین فطرت کے ساتھ آپ کو مبعوث کرے۔ عقل ہیولانی کے لحاظ سے بھی کامل الاستعداد بنایا تھا تاکہ عقلی اور علمی نظر رکھنے والے دین کے ساتھ آپ کو بھیجے۔ اعلیٰ اخلاق سے مکمل کر دیا تھا تاکہ عمدہ اخلاق کی تکمیل کا آپ سے کام لے۔ خدا نے بت پرستی اور بت پرستوں کی تمام بیہودگیوں سے آپ کو بچپن ہی سے بیزار اور خلوت پسند بنا دیا تھا تاکہ ان لوگوں کی نفس پروریوں شہوت پرستیوں، وحشیانہ بدکاریوں خونریزیوں، کمزوروں پر اُن کی دست درازیوں، پست خواہشوں، حرام خوریوں سے آپ دور رہیں، اصلاح نفوس کا خدائی نسخہ بتا سکیں، اور پاکیزگی کا نمونہ بن جائیں۔ خدا نے آپ کو انسانیت کا بہترین نمونہ بنا دیا تھا

(باقی صفحہ ۱۲۱ کا)

دیکھی۔ کسی انتظامی یا سیاسی عہدے پر مامور نہیں رہے، لیکن اس کے باوجود جو کچھ آپ نے دنیا کے سامنے پیش کیا، وہ نہ کوئی مقامی قانون تھا نہ کسی اور قانون کی ترمیم شدہ شکل تھی، بلکہ وہ عالمگیر اصلاح تھی تاکہ تمام انسانوں کی اُن کے عقائد، آداب، احکام، اور جنگ وغیرہ میں اصلاح کر دے۔ غور کر دیہ محمد مسلمان خود اپنے دین اور نبی کے خلاف کیسے بے بنیاد شبہے پیدا کرتے ہیں!

تاکہ آپ اُس کی اعلیٰ شریعت کو نافذ کر سکیں۔ آپ کی پاکبازی کا یہ حال تھا کہ جوانی کے پورے پچیس سال اپنی بیوی، خدیجہؓ کے ساتھ گزار دیے جو اپنی شادی کے آخری پندرہ برسوں میں بالکل بوڑھی اور اولاد پیدا کرنے کی قابلیت سے محروم ہو چکی تھیں۔ خدیجہؓ نے پینسٹھ برس کی عمر میں انتقال کیا، لیکن اِس کے باوجود آپ کو اِس قدر محبوب تھیں کہ اُنہیں عمر بھر یاد کرتے اور بعد کی تمام بیویوں پر فضیلت دیتے رہے، حتیٰ کہ عائشہؓ پر بھی جو آپ کے ساتھی اور دوست، صدیقؓ کی صاحبزادی تھیں۔ نہایت حسین، کم سن، ذہین، اور آپ کی طرف سے تبلیغ کی بہترین صلاحیت رکھتی تھیں۔ آپ عمر بھر خونریزی کو ناپسند کرتے رہے اگرچہ حق ہی کے لیے کیوں نہ ہو۔ آپ حد درجہ بہادر تھے۔ دشمنانِ خدا کی زیادتیوں سے مجبور ہو کر آپ اپنے اصحاب کی اُن کے مقابلہ میں سپہ سالاری کیا کرتے تھے، لیکن اِس کے باوجود آپ نے اپنے ہاتھ سے بجز ایک آدمی کے کبھی کسی کو قتل نہیں کیا۔ یہ شخص، اُبَیّ بن خلف تھا جو خود آپ کی جان لینے پر تُلا ہوا تھا، چنانچہ سر سے پاؤں تک خود و ذرع میں غرق ہو کر حملہ آور ہوا اور آپ مجبور ہوئے کہ اُس پر وار کریں، چنانچہ اُس کے خود اور ذرع کے درمیان خالی جگہ پر آپ نے ضرب لگائی اور اُس کا کام تمام ہو گیا۔ زندگی بھر آپ کا یہ حال رہا کہ گو مشرکوں اور یہودیوں سے بہت

کچھ مال غنیمت حاصل ہوتا تھا، مگر آپ ہمیشہ نہایت ہی سادہ زندگی پسند کرتے رہے، حالانکہ آپ کی شریعت نے طیّبات سے آسودہ ہونے کی اجازت دی ہے، اور دین داری کی بنا پر اُنہیں چھوڑ دینے کی ممانعت کر دی ہے۔ آپ اپنے کپڑوں میں خود پیوند لگاتے تھے، اپنی جوتی خود گانٹھتے تھے، اگرچہ آپ کے دین نے زینت و آرائش کی اجازت دی ہے اور ہر عید کے موقعہ پر اسے برتنے کا حکم دیا ہے۔ آپ کو جو کچھ بھی مل جاتا، کھا لیتے۔ کبھی کسی کھانے کی مذمت نہ کرتے۔ البتہ صاف میٹھا پانی پیا کرتے تھے۔

اپنی پیامبری کے لیے خدا نے آپ کی ذاتی استعداد مکمل کر دی تھی نہ کہ کسبی" تاکہ آپ پیغمبروں کے دین کو مکمل کر کے ایک ایسا قانون جاری کر دیں جو قیامت تک تمام انسانوں کی اصلاح کے لیے کافی اور ضامن ہو۔ خدا نے آپ کو سب پر حجت بنا کے بھیجا، اور یہ اس طرح کہ اپنی قوم کے اکثر لوگوں کی طرح آپ بھی اُمّی تھے۔ نہ اپنے ہم قوم اَن پڑھ عربوں سے انسانوں کا کوئی علم سیکھا تھا نہ اہل کتاب سے، حتیٰ کہ خدا نے آپ کو اُن چیزوں کے اہتمام سے بھی باز رکھا تھا جن پر آپ کی قوم کو فخر تھا، جیسے زبان کی فصاحت، بیان کی قوت، شاعری، خطابت، باہم مباہات رشک و رقابت۔ عربوں کا دستور تھا کہ موسم حج کے میلوں خصوصاً عکاظ

میں دور دور سے آکر اکٹھے ہوتے اور فصاحت و بلاغت و مہارت کا اظہار کیا کرتے تھے۔ اس چیز نے عربوں کی زبان کو بڑی ترقی دی، اور اُن کی شاعری میں دانائی پیدا ہوگئی۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ آپ نہ اِن تقریبوں میں اُن کے ساتھ شریک ہوتے تھے، نہ اِن کی باتوں کا ذکر اذکار کرتے تھے۔ نبوت کے بعد آپ نے کچھ اوپر سو شعر، امیہ بن ابی الصلت کے سنے اور فرمایا "قریب تھا کہ اسلام لے آتا"، اور فرمایا "اس کا شعر تو ایمان لے آیا مگر وہ خود کافر ہی رہا" اور فرمایا "کوئی کوئی بیان، جادو ہے، اور کوئی کوئی شعر دانائی ہے"، (مالک، احمد، بخاری، ابوداؤد، ترمذی من حدیث ابن عمر)

ہم نے کہا کہ نبوت کے لیے آپ کی قابلیت سراسر فطری تھی اور اس میں آپ کے کسب و کوشش کو ذرا دخل نہ تھا، نہ علم کو، نہ زبان کو، نہ ذہن کی جدوجہد کو۔ امیہ بن ابی الصلت کی طرح آپ کی نسبت روایت نہیں کیا گیا کہ پیغمبر ہو جانے کی امید یا آرزو رکھتے تھے۔ البتہ حضرت خدیجہ کے بارے میں روایت کیا گیا ہے کہ جب انہوں نے اپنے غلام، میسرہ کی زبانی آپ کی امانت کا، خوبیوں کا، کرامتوں کا، اور بحیرا راہب کی آپ کے حق میں گفتگو کا حال سنا، تو انہیں امید ہوگئی کہ شاید آپ ہی وہ نبی ہوں جس کا انتظار اور چرچا ہو رہا ہے، لیکن یہ روائتیں بھی صحت کے اُس درجہ

تک نہیں پہنچتیں جس درجہ کی آغازِ وحی والی حدیث ہے، جسے ہم اوپر لکھ آئے ہیں۔ ممکن ہے کہا جائے کہ حضرت خدیجہؓ کو آپ کے پیغمبر ہونے کا ضرور یقین تھا ورنہ وہ فرشتہ سے آپ کے ڈر جانے پر قسم کھا کر نہ کہتیں کہ خدا آپ کو رسوا نہیں کرے گا۔ جواب یہ ہے کہ خود حضرت خدیجہ کے باقی الفاظ سے ظاہر ہے کہ انہوں نے قسم اِس لیے کھائی تھی کہ آپ کی خوبیاں جانتی تھیں، چنانچہ اُن کا انہوں نے حوالہ بھی دے دیا، مگر ساتھ ہی ضرورت سمجھی کہ اپنے چچیرے بھائی، ورقہ بن نوفل سے بھی آپ کے بارے میں دریافت کرلیں۔

رہ گئی سال وحی میں غارِ حراء کے اندر آپ کی خلوت وعبادت تو بلاشبہہ یہ آپ کا کسبی فعل تھا اور اُس فطری استعداد کو نیز اُس منفی استعداد کو قوت بخشنے والا تھا جس نے آپ کو مشرکوں سے اور اُن کے پوجا پاٹ اور عادتوں سے دور کر رکھا تھا، لیکن یہ فعل اِس غرض سے ہرگز نہ تھا کہ نبوت کے لیے اپنے آپ کو طیار کریں، کیونکہ اگر واقعہ یہی ہوتا تو فرشتہ کو دیکھ لینے کے بعد آپ سمجھ جاتے کہ آرزو پوری ہوگئی ہے اور اِس سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہ ہوتی۔ غار میں آپ کی گوشہ نشینی اور عبادت کی اصلی وجہ یہ تھی کہ لوگوں کی بدحالی سے آپ بہت متوحش تھے اور اُس سے بھاگ کر اللہ کی یاد سے اُنس حاصل کرتے تھے، جیسا کہ ہمارے استاذ امام نے سورۂ ضحیٰ کی آیت "ووجدک ضالا فہدیٰ" کی تفسیر میں تفصیل سے بیان

کر دیا ہے۔ اسی بات کو خود اللہ تعالیٰ نے سورۂ شوریٰ میں اس طرح صاف کر دیا ہے:

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا، مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ۔ صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَلَآ اِلَى اللّٰهِ تَصِيْرُ الْاُمُوْرُ (۵۱ ر ۵۲)	اسی طرح ہم نے اے پیغمبر اپنے حکم سے تجھ پر یہ قرآن بھیجا، تو نہیں جانتا تھا کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کیا، لیکن ہم نے اس قرآن کو نور بنا دیا ہے جس سے ہم اپنے بندوں میں سے جسے چاہیں ہدایت بخشدیں، اور تو بے شک سیدھی راہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے، اللہ کی راہ کی طرف جو مالک ہے اُس سب کا جو آسمانوں میں اور زمین میں ہے، ہاں، بے شک سب کا مرجع اللہ ہی طرف ہے۔

استاذ امام نے رسالۂ توحید میں بھی مختصر مگر مفید انداز سے یہی گفتگو کی ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

"عام دستور ہے کہ آپ کا جیسا یتیم و نقیر بچہ جو کچھ دیکھتا ہے، عمر بھر کے لیے اُس کے دل میں جم جاتا ہے، اور اپنی سوسائٹی میں جو کچھ سنتا ہے خصوصاً اپنے رشتہ داروں سے، تو اُس کا اثر اُس کے دماغ پر بہت ہی گہرا پڑتا ہے، خاص کر ایسی حالت میں کہ نہ کوئی کتاب اُس کی رہنمائی

کے لیے ہو، نہ کوئی استاد اُسے سبق دیتا ہو، نہ کوئی مضبوط قوت اُس کی پشت پناہ بنی ہو۔ اگر آپ کے معاملہ میں بھی یہ عام دستور جاری ہوا ہوتا تو آپ بھی ضرور اپنے ہم قوموں کے عقیدے پر ہوتے۔ اُنہی کی روش اختیار کرتے، یہاں تک کہ جب سنِ شعور کو پہنچ جاتے اور عقل و تدبّر کا مادہ پیدا ہو جاتا، تو اُن کی مخالفت کرتے اگر آپ کی سمجھ میں اُن کی گمرہی آ جاتی، جیسا کہ اُن اِکّا دُکّا آدمیوں[1] نے کیا جو آپ کے زمانہ میں تھے۔ لیکن واقعہ اس طرح پیش نہیں آیا بلکہ ہوا یہ کہ شروع ہی سے بت پرستی آپ کو ناپسند تھی۔ حسنِ صورت کے ساتھ آپ کا عقیدہ بھی شروع ہی سے پاک تھا، اور یہ جو قرآن مجید میں ہے کہ وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ توحید سے پہلے آپ بت پرستی پر تھے یا مذموم اور گمراہ تھے۔ جو کوئی یہ خیال کرتا ہے، بہتان باندھتا ہے۔ لیکن یہ ایک طرح کی حیرانی اور ذہنی پریشانی ہوتی ہے جو اخلاص والوں کے دلوں کو لاحق ہو جاتی ہے۔ وہ پریشان ہوتے ہیں کہ کس طرح اُس سچائی کو گمراہوں تک پہنچا دیں جسے خود پا چکے ہیں۔ اللہ نے آپ کو اپنی رسالت کے لیے چن کر اُس طرف رہنمائی کر دی جسے آپ کی بصیرت تلاش کر رہی تھی اور اپنی مخلوق میں سے آپ ہی کو پسند کیا کہ اُس کی شریعت کو پھیلائیں۔"

---

(۱) جیسا کہ اُمیّہ بن ابی الصلت اور عمرو بن نفیل۔

میں کہتا ہوں کہ نبوت ورسالت کے لیے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی استعداد یہی تھی کہ اللہ نے آپ کی شریف روح کو ایک ایسا صاف آئینہ بنا دیا تھا جس میں دنیا کی دینی رسمیں، موروثی آداب، کسبی عادتیں منعکس نہیں ہوتی تھیں۔ چنانچہ اس آئینہ میں وحی الٰہی اپنے تمام معانی کے ساتھ جلوہ گر ہو گئی، تاکہ اللہ کے اُس مطلق دین کی تجدید ہو جائے جسے دیگر وہ اپنے پیامبروں کو اُن کی قوموں میں خصوصیت کے ساتھ بھیجتا تھا اور جو اُن کی حالت وقابلیت کے مطابق ہوا کرتا تھا، مگر اُس ذات برحق نے اپنے آخری پیغمبر کو تمام انسانیت کے لیے ہمیشہ کے واسطے بھیجا، جس کے بعد کسی اور وحی کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ آپ کی سلیم فطرت اور شریف روح، اور جو اعلیٰ معارف اُس پر نازل ہوئے، اور اللہ عزوجل کا جو نور اُس پر جلوہ گر ہوا، جس کا حال میں سورۂ شوریٰ کے اواخر کو تلاوت کر کے اے پڑھنے والے تجھ پر ظاہر کر چکا ہوں — ضرب المثل بن گیا ہے، وہ سورۂ نور کی یہ آیت کریمہ ہے:

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ	اللہ، نور ہے آسمانوں کا اور زمین کا۔ اُس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے طاق میں چراغ دھرا ہے اور چراغ شیشے کے اندر ہے، شیشہ ایسا ہے جیسے چمکتا ہوا تارہ، تیل جلتا ہے مبارک زیتونی

شَجَرَةٍ مُّبَارَكَةٍ، زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ	درخت کا، جو نہ شرقی ہے نہ غربی۔ لو لگے بغیر بھی
وَّلَا غَرْبِيَّةٍ، يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ	اُس کا تیل روشن ہو جانے کے قریب ہے، روشنی
وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ، نُوْرٌ عَلٰى	پر روشنی! اللہ جسے چاہتا ہے اپنے نور کی طرف
نُوْرٍ، يَهْدِى اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ	ہدایت بخش دیتا ہے۔ اللہ لوگوں کو کہاوتیں
يَّشَآءُ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ	سناتا ہے اور اللہ کو ہر چیز کا علم حاصل
لِلنَّاسِ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (۳۵)	ہے۔

پس محمدی معارف کی قندیل، ایک ایسے زیتون سے جلتی ہے جو نہ شرقی ہے نہ غربی، نہ یہودی ہے نہ نصرانی، بلکہ الٰہی علوی ہے!

ہم سمجھتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی استعداد ذاتی اور وحی نفسی کے بارے میں لوگوں نے جو کچھ کہا ہے، اِتنا بیان اُس کی تردید کے لیے کافی ہے۔ اس کے بعد وہ چیز آتی ہے جو زیادہ زبردست ہے اور جس سے اِن لوگوں کے ہوائی قلعے جڑ سے اکھڑ جاتے ہیں۔ یعنی خود وحی کے بارے میں اِن لوگوں کی بکواس کی تردید ہے وہ وحی جو آپ کی نبوت کی لازوال نشانی، ہمیشہ اونچی رہنے والی حجت، یعنی قرآن عظیم ہے!

اللہ کی سب سے بڑی نشانی — قرآن عظیم

قرآن کریم، قرآن حکیم، قرآن مجید، کتاب عزیز جس کے پاس "باطل نہ
آگے سے آتا ہے نہ پیچھے سے، وہ حکیم وحمید خدا کی طرف سے تنزیل ہے"
یہ کتاب ہے، نہ کتابوں کی طرح۔ یہ نشانی ہے، نہ نشانیوں کی طرح
معجزہ ہے، نہ معجزوں کی طرح۔ نور ہے، نہ انوار کی طرح۔ سر ہے، نہ اسرار
کی طرح۔ کلام ہے، نہ سب کلاموں کی طرح، یہ اللہ حیؐ وقیوؐم کا کلام ہے
جس سے روح القدس جبرئیلِ امین علیہ السلام کا اس کے سوا کوئی تعلق نہیں
کہ انہوں نے اُسے اُس کے عربی لفظوں کے ساتھ اُفقِ اعلیٰ کے آسمان سے
لاکر اس زمین پر پہنچا دیا، اور جس سے محمد رسول اللہ وخاتم النبیین صلوات اللہ
وسلامہ علیہ وعلیٰ آلہ کا تعلق اس کے سوا کچھ نہیں کہ آپ نے اُسے لوگوں تک
پہنچا دیا کہ اُس سے ہدایت حاصل کریں۔ پس یہ قرآن اپنے لفظ، ترتیب
اسلوب، علوم، ہدایت ہر لحاظ سے تمام مخلوق کے لیے معجزہ ہے۔ خود
محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی قدرت سے باہر تھا کہ اپنی کوشش، معلومات،
فصاحت، بلاغت کے زور سے اس قرآن کی جیسی کوئی سورت پیش
کرسکیں۔ آپ کا جو کچھ علم تھا، جو کچھ بلاغت تھی، وہ سب اسی قرآن کی بدولت

تھی، بلکہ قرآن میں صریح آیتیں موجود ہیں جن میں آپ پر بعض اجتہادوں کی وجہ سے عتاب ہوا ہے، جیسا کہ بدر کے قیدیوں کو فدیہ لیکر چھوڑ دینے کا اجتہاد (دیکھو تفسیر جلد ۱ صفحہ ۸۳، ۴۹۴، ۴۷۲)

سورۂ بقرہ کی جس آیت میں چیلنج کیا گیا ہے (۲: ۲۳) اُس کی تفسیر میں لفظی و معنوی اعجاز کو میں اجمال واختصار کے ساتھ بیان کرچکا ہوں یہاں میں قرآنی علوم پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں جو انسانوں کی اصلاح کا ذریعہ ہیں۔ لیکن جگہ کی کمی کے باعث صرف اسی قدر گفتگو کرونگا جس سے معلوم ہوجائے کہ تاریخ نے انبیاء و حکماء اور مُقَنّنوں اور سیاسیوں کے جتنے بھی علوم محفوظ رکھے ہیں، قرآنی علوم اُن سب سے کہیں اعلیٰ و برتر ہیں۔

چنانچہ جس شخص کا بھی یہ ایمان ہے کہ اِس دنیا کا کوئی علیم حکیم رحیم، صاحب ارادہ، با اختیار پروردگا ہے، اُسے لازمی طور پر یہ ایمان بھی لانا ہوگا کہ یہ قرآن بغیر کسی شک وشبہہ کے اُسی پروردگار کی وحی ہے جو اُس نے اپنے سب سے آخری پیغمبر پر ازراہ رحم نازل کی تاکہ انسان اسس کی رہبری سے اپنی فطرت کی تکمیل، اپنے نفوس کی پاکیزگی، مفاسد سے اپنی سوسائٹی کی اصلاح کرسکیں، بنابریں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی تمام انسانوں پر لازمی طور سے فرض ہوجاتی ہے، جیسا کہ خدا نے فرمایا:

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي | اے پیغمبر، کہدیجئے کہ اے لوگو، میں تم سب کی

رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا الَّذِىْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ

(۷: ۱۵۸)

طرف اللہ کا پیامبر ہوں، اُس اللہ کا جس کی ملکیت میں آسمان و زمین ہیں۔ اُس ایک اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہی جِلاتا اور مارتا ہے، لہٰذا ایمان لاؤ اللہ پر، اور اُس نبیِ اُمّی رسول پر جو اللہ پر اور اُس کے کلمات پر ایمان رکھتا ہے۔ تم اُس کی پیروی کرو تاکہ ہدایت پا جاؤ۔

اور جو کوئی اِس علم و حکمت والے پروردگار کا قائل نہیں ہے، اُسے بھی ضرور ماننا پڑے گا کہ اِس دنیا میں جتنے کچھ ہدایت یاب اور ہدایت بخشنے والے عقلاء پیدا ہوئے ہیں، محمد اُن سب سے زیادہ کامل، افضل، عالم، اور دانا تھے۔ اِن منکروں سے عقل کا یہی تقاضہ ہو گا کہ محمد کو تمام انسانوں کا بے قید و شرط سردار اور پیروی کا سب سے بڑھ کر حقدار تسلیم کر لیں اور اِس نام سے آپ کو یاد کریں "انسانوں کے آقا اور اُن کے حکیمِ اعظم"۔

ہم جانتے ہیں کہ بعض منصف مزاج غیر مسلم جو سیرت محمدی کے ساتھ قرآن بھی کچھ نہ کچھ سمجھتے ہیں، اِس حقیقت کا تقریری و تحریری اعتراف کر رہے ہیں۔ اِنہی میں ایک مشہور انگریز پروفیسر مولر بھی ہے، اور اِنہی میں وہ فلسفی شامی ڈاکٹر بھی ہے جس نے اگرچہ رومن کیتھولک مذہب میں

تربیت پائی، لیکن رسالہ "المنار" میں بعض محمدی مناقب دیکھ کر ہیں ایک خط میں لکھا "آپ محمد کو نبی کی حیثیت سے دیکھتے اور عظیم سمجھتے ہیں، مگر میں محمد کو بحیثیت آدمی کے دیکھتا اور اعظم سمجھتا ہوں!" اس کے بعد اُس نے اپنے چند اشعار درج کیے ہیں جن میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اور قرآن کی محکم آیات کی تعریف کی ہے جو ترقی کو رسم ورواج کی زنجیروں سے جکڑنے سے منع کرتیں اور اپنی دانائی وا ثر سے انسانوں کی اصلاح کرتی ہیں آخری شعر یہ ہیں:

ببیانہ اسربیٰ علی اھل النھیٰ ولسیفہ انحیٰ علی الھامات

(اپنے بیان سے تمام دانشمندوں سے بڑھ گیا اور اپنی تلوار سے سروں پر متوجہ ہوا)

من دونہ الابطال فی کل الوریٰ من سابق اوحاضر اوآت

(دنیا میں آج تک جتنے سورما اور بڑے آدمی گزرے ہیں، سب اس سے کم ہیں)

تمام قوموں میں اِس حقیقت کے ماننے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے، لیکن تمام جہانوں کے چلانے والے پروردگار کے منکروں کی تعداد بہت کم ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اِن لوگوں پر کھلی حجت ہیں، کیونکہ آپ کی پرورش، تربیت، آپ کی جبلّی سچائی، پھر ادھیڑ ہو جانے پر آپ کا یہ علوم لانا جو ہر زمانہ میں تمام انسانوں کے جملہ معاملات کی اصلاح کرنے والے ہیں، بشرطیکہ انسان اُنہیں سمجھیں، اُن سے رہنمائی حاصل کریں،

اور اُنہیں وحی الٰہی یقین کریں۔ اپنی اِنہی خصوصیتوں کی وجہ سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم خود خالق وحکیم پروردگار کے وجود کی حجت و برہان بن گئے ہیں، بلکہ طبیعی وعقلی حجتوں کا بھی مجموعہ ہیں۔

اب میں اِن اصلاحی علوم کی چند بنیادیں پیش کرتا ہوں، لیکن اِس سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختصر تمہید میں قرآن کے اسلوب، اور اُس کے بنیادی علوم کو نہایت ہی حیرت انگیز ڈھنگ سے متفرق سورتوں میں پراگندہ کر دینے کی حکمت پر بھی گفتگو کر لی جائے۔ یہ چیز میں پہلے بھی بیان کر چکا ہوں، مگر یہاں خود قرآنی اسلوب کی پیروی کر کے اِن مطالب کو فوائد کے اضافہ اور توضیح کے ساتھ دہراتا ہوں۔

قرآن کا خاص اسلوب، اُس کی حکمت، اور اُس کا اعجاز

اگر قرآن کے عقائد کو، یعنی اللہ پر، اُس کی صفات پر، اُس کے ملائکہ پر، اُس کی کتابوں پر، یوم آخرت پر، ثواب وعذاب پر، جنت ودوزخ پر ایمان کو، اور اگر عبادات، طہارت، نماز، زکاۃ، روزہ، حج دعا، ذکر کو، فقہ کی کتابوں کی طرح قرآن کی چند سورتوں میں جمع کر دیا جاتا اور اگر آداب، حکمتیں، واجب ومستحب نیکیاں، پھر برائیاں اور حرام و مکروہ اعمال، نیز اُن کے مناسب حال ترغیب وترہیب، وعظ وپند، خوف ورجا پیدا کرنے والی نصیحتیں، کتب اخلاق کی طرح چند دوسری

سورتوں میں درج کر دی جاتیں۔ اسی طرح قرآن کے قوانین، شخصی، سیاسی، جنگی، شہری احکام و تعزیرات، کتب قانون کے طریقہ پر یکجا کر دی جاتیں۔ پیغمبروں کے قصے، اُن کی عبرتیں، اور قوانین قدرت کو، تاریخی کتابوں کے طریقہ پر ایک ساتھ مرتب کر دیا جاتا، اگر یہ سب چیزیں اور قرآن کے دوسرے مقاصد اسی طرح علحدہ علحدہ مرتب ہوتے جیسے توراۃ کی کتابیں مرتب کی گئی ہیں جن کے مرتب کرنے والے کو کوئی نہیں جانتا، یا جس طرح فقہ، قانون، یا دوسرے علوم کی کتابیں ترتیب دی گئی ہیں، تو ایسا کرنے سے قرآن اپنے ایک اہم ترین مقصد کو کھو بیٹھتا جو اول درجہ کا مقصد ہے، اور وہ مقصد یہ ہے کہ خود اُس کی تلاوت بھی عبادت کا ذریعہ بنے، اور اُس کی چند سورتوں کا حافظ بھی ایمان، فضائل احکام اور بہت سی نصیحتوں کو حفظ کر لے سکے جو تمام سورتوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اگر مذکورہ بالا طریقہ پر قرآن کی ترتیب ہوتی، تو اُس کی ہر سورت میں ایک ہی موضوع بحث ہوتا۔ بعض سورتوں میں طلاق یا حیض ہی کے احکام ہوتے، اور تلاوت کرنے والا اُس سے ایک دو چار مرتبہ بعد ضرور اکتا جاتا۔ لیکن موجودہ ترتیب یہ ہے کہ اُس کی ہر سورۃ حتیٰ کہ چھوٹی سے چھوٹی سورۃ میں بھی ہدایت کے کئی کئی مسائل آ گئے ہیں، مثلاً سورۂ فیل اور سورۂ قریش ہی کو دیکھ لو (یہ دونوں باہم وابستہ ہیں حتیٰ کہ اپنے

اعراب میں بھی) ان میں دو تاریخی واقعے بیان کیے گیے ہیں اور ان واقعوں کو مشرک قریشیوں کے خلاف حجت بنا دیا گیا ہے تاکہ وہ اُس اللہ کی توحید وعبادت پر آمادہ ہوجائیں جس نے خانۂ کعبہ کی حفاظت کر کے اُن پر احسان کیا ہے، وہ کعبہ جس پر اُن کی عزت، فخر، بزرگی، تجارت، زندگی کا مدار ہے ــــــ اگر یہ ترتیب نہ ہوتی تو قرآن اپنے اعجاز کی ایک اہم صنف سے محروم ہوجاتا۔

اللہ رب العالمین اور علیم وحکیم خدا کے اتارے ہوئے اِس قرآن کی ترتیب واسلوب میں بے شمار فوائد ہیں۔ تمام مقاصد ومطالب باہم ملا دیے گیے ہیں۔ مختلف مناسبتوں سے چھوٹی بڑی سورتوں میں پھیلا دیے گیے ہیں۔ بلیغ عبارتوں میں دُہرا دیے گیے ہیں جو دل کو موہ لینے والی، جذبات کو حرکت میں لانے والی، اور تلاوت میں دلوں کو اُکتانے سے باز رکھنے والی ہیں۔ پھر قرآن کی تلاوت بھی ترتیل کے ساتھ رکھی گئی ہے۔ اُس کے نغمے بھی خاص ہیں۔ آیتوں کے فواصل ایسے بوقلموں اور طرح طرح کے نغموں کے متحمل ہیں جن سے قلب میں خشوع پیدا ہوتا، پروردگار کی خشیت بڑھتی، اُس کی رضواں ورحمت کی اُمید بندھتی۔ اُس کی ناراضی سے ڈر پیدا ہوتا، اور اُس کی سنتوں سے ایسی ایسی عبرتیں حاصل ہوتی ہیں کہ کسی انسانی کلام میں، چاہے نظم ہو یا نثر،

خطابت ہو یا شعر، اُن کی نظیر مل نہیں سکتی۔ اپنے اِس بلند اندازِ بیان، اِس درجہ حسین ترتیب، اور بے مثل بلاغت کی وجہ سے قرآن ایسا ہوگیا ہے جیسا کہ کہا گیا ہے "اِس قرآن کی جدّت نہ کبھی پرانی ہوگی نہ بار بار دُہرانے سے اُس کی آب و تاب میں کمی آئیگی۔" اِس کی حکمت اور اِس کی غرض خود واقعات سے معلوم ہو جائیگی جو پیش آچکے ہیں، اور جن کی مختصر تفصیل حسب ذیل ہے:۔

وہ انقلاب جو قرآن نے پیدا کیا

قرآن، ایک کتاب ہے جو ایک ایسے آدمی پر نازل ہوئی جس نے سچی انسانی فطرت پر نشو و نما پائی تھی جس کی عقل، سلیم تھی۔ جس کا دل صاف تھا۔ اخلاق پاک تھے۔ نہ دینی رسموں نے اُس پر قبضہ کیا تھا، نہ دنیوی خواہشوں کا اُس پر تسلّط تھا۔ یہ کتاب اِس لیے نازل ہوئی کہ عرب میں پھر تمام دنیا میں ایسا زبردست انقلاب برپا کر دے جو عالم انسانیت کو شرک و بت پرستی کی تمام گندگیوں سے پاک کر دے جنہوں نے انسان کو اُس کے اُفقِ اعلیٰ سے نیچے گرا دیا ہے حتیٰ کہ وہ اپنے سے بھی کم تر مخلوق کی پرستش کرنے لگا ہے۔ اور چرچ کی اُن تمام بدعتوں اور جھوٹی مذہبی پابندیوں کا قلع قمع کر ڈالے جنہوں نے انسان کی عقل بگاڑ دی اور اُس کی آزادی چھین لی ہے، جنہوں نے پیغمبروں کی توحید کو شرک

بنا دیا ہے۔ اُن کے حق کو باطل کے قالب میں ڈھال دیا ہے، اور اُن کی ہدایت کو گمرہی بنا دیا ہے۔ اور ظالم پادشاہوں اور جابر وقاہر سرداروں کے استبداد کو بھی جڑ سے اکھاڑ پھینکے جس نے انسان کی مردانگی ضایع کر ڈالی ہے، خودداری برباد کر ڈالی ہے، ارادہ چھین لیا ہے۔ غرضکہ قرآن اِس لیے آیا کہ انسانی عقل اور انسانی ارادے کو تمام جھوٹی پابندیوں سے آزاد کر دے جو ذلت ومسکنت میں مبتلا کرنے والی ہیں، تاکہ اِس کتاب سے ہدایت حاصل کرنے والا ہر آدمی آزاد وخوددار بن جائے، اپنے پروردگار کا بلاشرکت غیرے بندہ ہو جائے، اور اپنی مادّی ومعنوی قوتوں کو اپنی ذات اور اپنی نوع کی تکمیل میں خرچ کر سکے۔

اِس قسم کا انسانی انقلاب صرف قرآن ہی کے اِس اصول پر برپا ہوسکتا ہے کہ

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ۔	خدا کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت نہ بدلے۔

اب غور کرنا چاہیے کہ قومیں اپنے عقائد، اخلاق، اور خصائل از خود کیسے بدل سکتی ہیں جو موروثی عبادتوں اور راسخ عادتوں نے اُن میں پختہ کر دی ہیں؟

کیا یہ تبدیلی اِس طرح ممکن ہے کہ ایک مصلح اٹھے اور ایک

خشک تعلیمی کتاب لکھ کر لوگوں سے کہدے کہ تم سب گمراہ و فاسد ہو۔ گمراہ کن اور مفسد ہو۔ ادھر آؤ، اِس کتاب کی پیروی کرو، ہدایت پاؤگے، تمھاری اصلاح ہو جائیگی ؟ یا وہ کوئی قانون نامہ طیار کر کے اُس کے دیباچہ میں لکھ دے کہ اِس قانون کو نافذ کر دو، تمھارے حقوق محفوظ ہو جائینگے اور تمھاری قوم و ملک کو عزت و اقتدار حاصل ہو جائے گا ؟ یہ کیونکر ممکن ہے جبکہ فاسد و مفسد لوگوں نے خود اپنے پیغمبروں کی کتابوں میں بھی بدنیتی سے تصرّف کر دیا ہے اور اپنے مصلح داناؤں کے قوانین پس پشت ڈال دیے ہیں (جیسا کہ بعد کے مسلمانوں نے بھی کیا ہے) قانون تو باقاعدہ منظم و طاقتور حکومتوں کے لیے بنتے ہیں جو انہیں نافذ کرنے کی قدرت رکھتی ہیں، لیکن ایسی صورت حال، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو کہاں میسّر تھی جو اگرچہ حجت و برہان کے ساتھ آئے تھے، مگر تن تنہا تھے۔ نہ کوئی قوت رکھتے تھے نہ اپنی قوم میں سے کوئی مددگار ؟ لیکن یہ واقعہ ہے کہ آپ سب سے زیادہ عدل پرور اصول لائے تھے جن کی بنیادوں پر آپ کی قوم مناسب حالات میں اپنی سلطنت کے قوانیں بنا سکتی تھی جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا۔

نہیں، ہرگز نہیں، یہ کایا پلٹ صرف اُسی طرح ممکن تھی جس طرح پیش آئی۔ یہ صرف قرآن ہی کا عربی قوم پر گہرا اثر تھا جو تمام بدوی اور

متمدّن قوموں میں ظہور اسلام کی سب سے زیادہ فطری صلاحیت رکھتی تھی، جیسا کہ ہم بہ تفصیل اپنی کتاب "خلاصۂ سیرت محمدی" میں بیان کر چکے ہیں اور جیسا کہ آیندہ بھی اشارہ کریں گے۔

اور یہ اس لیے کہ آدمی کی طبیعت کچھ اس طرح کی واقع ہوئی ہے کہ خواہشوں اور رسم ورواج کے مقابلہ میں وہ حق پر صرف یہ بتا دینے سے استوار نہیں ہو جاتا کہ یہ نیکی ہے، اسی پر چلو۔ یہ بدی ہے، اس سے بچو۔ یہ حق ہے، اس کی حمایت کرو۔ یہ باطل ہے، اسے توڑ دو۔ ہاں بعض افراد ایسے ضرور نکل آتے ہیں، مگر جماعتیں اور قومیں ایسی نہیں ہوتیں۔ دلوں میں حق اور نیکی کے راسخ ہونے، اور عمل میں اس کے آثار ظاہر ہونے میں سنت الٰہی یہی ہے کہ حق اور نیکی کا ایمان ایسی صورت اختیار کرے گویا خود ضمیر کی آواز ہے اور قلب پر حاکم بن جائے۔ یہ آواز اتنی طاقتور ہو جائے کہ اپنی مخالف ہر خواہش، ترہیب، ترغیب، تکلیف، امید پر ہمیشہ بھاری رہے۔ یہ چیز بچوں میں علمی عملی تربیت سے اور والدین، رشتہ داروں اور ماحول کے نمونہ سے پیدا ہو سکتی ہے۔

لیکن عمر رسیدہ لوگوں میں حقِّ مطلق اور عام نیکی کے ایمان کو ضمیر کی آواز صرف اُسی طور سے بنایا جا سکتا ہے جس طور سے قرآن نازل ہوا ہے، کہ اُس نے آتے ہی نوجوانوں اور بوڑھوں کی طبیعتوں میں

اخلاق میں، عادات میں کُلّی انقلاب پیدا کر دیا، علم وعمل دونوں میں اُن کا رخ بالکل بدل دیا، اور اس حیرت انگیزی کے ساتھ کہ اُس کی نظیر انسانوں میں کبھی دیکھی نہیں گئی۔ اس طرح قرآن جہاں اپنی زبان اور اسلوب کے لحاظ سے معجزہ ہے، اپنے اثر کے لحاظ سے بھی معجزہ بن گیا، کیونکہ اُس نے انسانی سوسائٹی کی ایسی کایاپلٹ دی جو بالکل خارق عادت ہے۔

مثال کے لیے، پیغمبروں کی اولاد، بنی اسرائیل کو لے لو۔ انہوں نے مصر میں موسیٰ علیہ السلام کی کتنی نشانیاں دیکھیں، صحراء سیناء میں سرگردانی کرتے ہوئے کتنے معجزے مشاہدہ کیے، اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ خود خدا اُن کی نگہبانی کر رہا ہے۔ خود اپنے کانوں سے اللہ کی آواز سنی جو آگ کے شعلوں سے آرہی تھی ــــ جیسا کہ توراۃ میں لکھا ہے، مگر ہم مسلمانوں کے ہاں بجز حضرت موسیٰ کے کسی اور سے خدا کی ہم کلامی ثابت نہیں ــــ لیکن اس کے باوجود وہ اثر اُن کے دلوں سے دور نہ ہوا جو مصری بت پرستی، وہاں کے خرافات، وہاں کی کمینگی اور اخلاق کا اُن میں سرایت کر چکا تھا۔ اُنہوں نے موسیٰ کو بہت ستایا۔ بڑی بڑی تکلیفیں دیں۔ ہر حکم میں اُن سے ضد کی، حتیٰ کہ جب وہ اپنے پروردگار سے مناجات کرنے گیے تو انہوں نے سونے کے بچھڑے کو

پوجنا شروع کر دیا۔ خود خدا نے توراۃ میں انہیں موٹی اور کڑی گردن والی قوم بتایا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بہت غبی، ضدی، سخت دل، اور سرکش تھے۔ اُن کی حالت برابر یہی رہی یہاں تک کہ چالیس برس بعد وہ پوری نسل ختم ہو گئی اور نئی نسل اُن لوگوں کی آگئی جو مصر سے خروج کے وقت بچے تھے یا جو خود صحرا میں پیدا ہوئے تھے۔ یہ لوگ توحید و شریعت کو سمجھ سکے۔ اُس پر عمل کر سکے۔ اُس کے لیے جہاد کر سکے۔ مگر یہ سب موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد ہوا۔

کہاں یہ سرکش بنی اسرائیل اور کہاں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب جنہوں نے قرآن سننے، پڑھنے، اور سمجھنے سے تربیت حاصل کی، جن میں ایمان پختہ ہو گیا، جنہوں نے اپنے سچے دین کی راہ میں بڑے ہی صبر کے ساتھ مشرکوں کے مظالم برداشت کیے، پھر ہجرت کے بعد اُن سے اور اُن کے مددگار، اہل کتاب (یہودیوں) سے جہاد کیا، اور عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہی میں دونوں گروہوں کے کفر سے حجاز اور جزیرۃ العرب کو پاک کر دیا۔ محمدی بعثت کی پوری مدت، بیس سال ہے، یعنی یہودیوں کے زمانۂ بادیہ پیمائی کی آدھی مدت۔ اس میں سے آدھا زمانہ، مکہ والوں کی دعوت و تبلیغ میں گزر گیا۔ باقی دس برس کے اندر ہی عربی انقلاب، اور تشریع و تنفیذ و جہاد سب کچھ پیش آیا ہے۔

پھر غور کرو کہ یہ اوّلین مسلمان، کس طرح بے پناہ سیلاب کی طرح جزیرۃ العرب کے ہر گوشہ سے باہر نکلے۔ قیصر و کسریٰ کی سلطنتیں الٹ ڈالیں جو اُس وقت دنیا میں سب سے بڑی تھیں۔ شرک اور ظلم کا ان ملکوں سے قلع قمع کر ڈالا۔ توحید، حق، انصاف کو پھیلا دیا۔ قومیں جوق جوق دین الٰہی میں داخل ہونے لگیں، جبر و تشدّد سے نہیں بلکہ ان لوگوں کی ہدایت سے متاثر ہو کر۔ دین کے ساتھ انہوں نے عربی زبان بھی سیکھی، اور آدھی صدی کے اندر اندر اپنے اُستادوں کے ساتھ مل کر آدھا کرۂ زمین فتح کر ڈالا۔ یہ لوگ رحم و عدل میں ضرب المثل ہو گئے اور علماء اجتماعیات اور قائدین امم کی حیرت کا موجب بن گئے۔

کہاں وہ قوم جسے خود خدا نے موسیٰؑ اور کڑی گردن والی قوم بتایا ہے اور کہاں محمدؐ کے پیرو جن کا حال خود رب العالمین نے یوں بیان فرمایا ہے:۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّاۗءُ عَلَي الْكُفَّارِ رُحَمَاۗءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا۔	محمد رسول اللہ اور جو لوگ اُن کے ساتھ ہیں، کفار پر سخت اور باہم ہمدرد ہیں۔ تم انہیں رکوع اور سجود میں پاؤ گے، اللہ کے فضل و رضوان کی جستجو میں لگے رہتے ہیں۔

چنانچہ عمر بن خطاب امیر المومنین جو شروع میں بہت سخت مزاج اور سنگ دل تھے، اسلام کی ہدایت سے ایسے ہو گئے کہ رات کو اپنی بیوی کے ساتھ ایک فقیر عورت کے لیے کھانا پکاتے تھے جسے بچہ ہوا تھا۔ عورت کا شوہر بھی سامنے کھڑا تھا، مگر مدد نہیں کرتا تھا۔ اُسے معلوم نہ تھا کہ خود امیر المومنین بیٹھے کھانا پکا رہے ہیں!

بے شک یہ کایا پلٹ صرف قرآن کے اثر سے ہوئی تھی جو اُس اسلوبِ بیان کا نتیجہ تھا جسے ہم مصحف (قرآن کی جلد) میں دیکھتے ہیں۔ اِسی قرآن سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم مشرکوں پر جہاد کرتے تھے جیسا کہ خدا نے حکم دیا تھا:

فَلَا تُطِعِ الْكَافِرِينَ وَجَاهِدْهُم بِهِ جِهَادًا كَبِيرًا (۲۵ : ۵۲)	کافروں کی اطاعت نہ کرو بلکہ قرآن کے ذریعہ اُن پر بڑا جہاد کرو۔

اِسی قرآن سے آپ نے مومنین کو تربیت دی اور اُنہیں پاک کیا۔ پھر اِسی قرآن کی رہنمائی اور اُس کے مبلّغ صلی اللہ علیہ وسلم کے نمونہ سے صحابہؓ نے قوموں کی تربیت کی اور اُنہیں مہذب بنا دیا۔ آج بھی جو شخص اُسی طرح قرآن پڑھے، جس طرح وہ لوگ پڑھتے تھے، تو اُس سے ہدایت پائے گا، ٹھیک اُسی طرح جس طرح اُنہوں

نے ہدایت پائی تھی، حالانکہ نفسی، لغوی استعداد اور زمانہ میں جو اختلاف ہوگیا ہے، محتاجِ بیان نہیں۔ اگر قرآن، علمی اور قانونی کتابوں کے انداز پر ہوتا، تو ہرگز یہ اثر پیدا نہیں کرسکتا تھا جس نے عربوں کی کایا پلٹ دی اور انہوں نے عجمی قوموں میں انقلاب پیدا کر دیا۔ اس وقت کے مسلمان ویسے تھے جیسا کہ خود خدا نے فرمایا ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ، وَلَوْ آمَنَ أَهْلُ الْكِتَابِ لَكَانَ خَيْرًا لَهُمْ، مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُونَ وَأَكْثَرُهُمُ الْفَاسِقُونَ (۳: ۱۱۰)	اے مسلمانو، تم بہترین امت ہو جو لوگوں کی ہدایت کیلئے اٹھائی گئی ہے، تم نیکی کا حکم دیتے ہو برائی سے منع کرتے ہو، اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔ اگر اہل کتاب ایمان لے آئیں تو ان کے حق میں اچھا ہے۔ ان میں سے کچھ ہی مومن ہیں اور اکثر فسق میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

اِن اوّلین مسلمانوں کو قوموں کی سیاست و انتظامات کا کچھ بھی علم نہ تھا۔ اُن کے سامنے صرف قرآن تھا اور اُس کے اوّلین مُبلّغ و مُنفّذ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ تھا۔ مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ اگر واپس آسکتی ہے تو صرف اُسی وقت جب وہ قرآن کی ہدایت پر واپس آ جائیں گے، اُس کے انقلاب کو از سرِ نو جاری کریں گے۔ اللہ کی لعنت ہو اُن لوگوں پر جو یہ کہکر مسلمانوں کو قرآن

سے باز رکھتے ہیں کہ ہمارے مشایخ کی کتابوں نے تمھیں قرآن پر اور اُس کے شارح علیہ السلام کی سنت پر عمل سے بے نیاز کر دیا ہے، حالانکہ یہ کتابیں ہر اُس چیز سے خالی ہیں جو ایمان کو زندہ، ہمت کو بلند، روح کو پاک، اور دلوں میں عمل کا ولولہ پیدا کرتی ہے۔

عربوں میں قرآن کا اثر دو قسم کا تھا

عربوں میں قرآن نے دو قسم کا اثر و انقلاب عظیم پیدا کیا تھا: اول یہ کہ اُس نے اُنہیں اسلام کی طرف کھینچا۔ دوسرے یہ کہ اُنہیں پاک کیا، اور جہل و فساد کو بدل کر اُس کی جگہ نیکیاں پیدا کر دیں، یہاں تک کہ اِس سے وہ اصلاح رونما ہوئی جو تمام جہان کے لیے عام ہو گئی۔ یہاں گنجایش کے بموجب تفصیل دی جاتی ہے:

ہم بارہا بتا چکے ہیں کہ خدا نے قوم عرب خصوصاً قریش اور اُن کے پڑوسیوں کو اِس عام انسانی اصلاح کے لیے طیار کر رکھا تھا جس کا وہ فیصلہ فرما چکا تھا، اور یہ اس لیے کہ یہ لوگ سب قوموں سے زیادہ سلیم فطرت رکھتے تھے۔ سب سے زیادہ ترقی یافتہ زبان کے مالک تھے۔ اپنے عقل و ارادہ میں سب سے زیادہ خود مختار رہتے، کیونکہ وہاں نہ استبداد پسند پادشاہ موجود تھے، نہ روحانی اقتدار رکھنے والے دینی پیشوا، جو اُن کے عقائد و خیالات سے کھیلتے اور اپنی خواہشوں پر

اُنہیں قربان کر سکتے۔

چنانچہ جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم، حق کی طرف بلانے والے اس قرآن کو لیکر مبعوث ہوئے تو وہ لوگ آپ کی دعوت قبول کر لینے کی سب سے زیادہ فطری استعداد رکھتے تھے، لیکن سرداران قریش اپنی تونگری، جھوٹی بڑائی، شہوت پرستی، اور عیش پسندی میں عجمی پادشاہوں سے ملتے جلتے تھے، پھر چونکہ بیت اللہ الحرام کے مجاور تھے، وہ بیت اللہ جس کی تعظیم سے عربوں کے دل زمانۂ ابراہیمؑ و اسماعیلؑ سے لبریز تھے، اس لیے اُن میں دوسری قوموں کے دینی پیشواؤں کا سا ایک مذہبی اقتدار بھی پیدا ہو گیا تھا ـــــ ان لوگوں نے دیکھا کہ یہ دین ـــ اسلام ـــــ اُنہیں اُن کی اِس پشتہا پشت کی بزرگی ـــــ سے محروم، اور شاید نہی دستوں اور غلاموں کو اُن پر فوقیت دیدے گا۔ پھر یہ دین اُنہیں اور اُن کے مایہ ناز بڑھوں پر کفر، جہل، ظلم، فسق کا حکم لگاتا اور اُنہیں چوپایوں سے مشابہت دیتا ہے ـــــ لہذا اُنہوں نے اپنی تمام طاقتیں اور اپنا پورا اقتدار اس بات کے لیے وقف کر دیا کہ محمدؐ کو اُن کی دعوت سے روکیں، اگرچہ یہ مقصد اسی طرح حاصل ہو کہ محمدؐ کو اپنا پادشاہ اور اپنا سب سے زیادہ تونگر آدمی ہی کیوں نہ بنا لیں۔ سرداران قریش نے اپنی یہ تجویز جب آپ کے چچا ابو طالب

کے ذریعہ پیش کی تو آپ نے جواب میں نہایت ہی بلند لفظ فرمائے۔ کہا "میرے پیارے چچا، اگر یہ لوگ سورج کو میرے دائیں ہاتھ پر اور چاند کو میرے بائیں ہاتھ پر اتار کر رکھ دیں تو بھی میں اِس معاملہ کو چھوڑنے والا نہیں یہاں تک کہ خدا اسے غالب کر دے یا میں اِسی راہ میں مر جاؤں!"

یہ جواب سن کر یہ لوگ نا امید ہو گئے اور فیصلہ کر لیا کہ زور وقوت سے آپ کی دعوت کو روکیں گے۔ بازاروں، میلوں، اور خانہ کعبہ میں لوگوں کو آپ تک پہنچنے نہ دیں گے۔ آپ کی دعوت پر لبیک کہنے والوں پر ظلم کریں گے، اِلاّ یہ کہ کسی کا کوئی طاقتور حامی موجود ہو اور یہ اُس کے ڈر سے اُسے ستا نہ سکیں۔

متکبّر سرداران قریش سب سے زیادہ اِس حقیقت سے واقف تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سچے ہیں۔ چنانچہ خدا فرماتا ہے:

فَإِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُونَكَ وَلَٰكِنَّ الظَّالِمِينَ بِآيَاتِ اللَّهِ يَجْحَدُونَ	اے پیغمبر، وہ آپ کو نہیں جھٹلاتے ہیں بلکہ ظالم، آیات الٰہی کا جان بوجھکر انکار کرتے ہیں۔

لیکن اِن لوگوں نے محض اپنی سرداری اور اپنی خواہشوں کے خیال سے حق سے سرکشی کی اور تکبر کی راہ سے اُسے چھوڑ دینا چاہا۔

حالانکہ عربوں میں سب سے زیادہ اِنہی کو قرآن کا پیغام قبول کرنا تھا۔

وَجَحَدُوا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنفُسُهُمْ ظُلْمًا وَعُلُوًّا۔	اُنہوں نے اللہ کی آیتوں کا ظلم و سرکشی کی راہ سے انکار کیا حالانکہ اُن کے دلوں میں اُن کا یقین پیدا ہو چکا ہے۔

اور یہ بالکل فرعون وقارون و ہامان کی طرح۔

مشرکین عرب پر قرآن کا اثر

ہم نے کہا ہے کہ عربوں پر قرآن کا اثر دو قسم کا تھا؛ مشرکوں پر اُس کا اثر، اور مومنوں پر اُس کا اثر۔ پہلا اثر، قرآن کی بلاغت اور اُس کی ترتیب و اسلوب کی حیرت انگیزی کا نتیجہ تھا جو سب کو مجبور کرتی تھی کہ اُس کی دعوت کو سمجھیں اور اُس پر ایمان لائیں، کیونکہ جو کوئی بھی اُسے سمجھے گا. اُس کی خوبی کا ضرور قائل ہو جائے گا۔ تمام عربوں کی سمجھ یکساں نہ تھی۔ وہ قرآن کو اپنی اپنی سمجھ اور بلاغت اور اعلیٰ مطالب کے فہم میں اپنے مختلف درجوں ہی کے مطابق سمجھ سکتے تھے۔

قرآن کا یہی وہ بے پناہ اثر تھا جس نے ولید بن مُغیرہ مخزومی کو مجبور کیا کہ ابوجہل سے اقرار کرے کہ قرآن ایک ایسا حق ہے جو غالب رہنے والا ہے اور اُس پر کوئی اور چیز غالب نہیں ہو سکتی، اور یہ کہ قرآن ہر دوسری چیز کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دینے والا ہے۔ یہ بات اُس کی عقل کے

نور اور ضمیر کی گہرائیوں سے نکلی تھی اور جب ابو جہل نے بہت مجبور کیا تو وہ اپنے اِس اعتراف کے خلاف جو کچھ کہہ سکا، وہ بہت ہی سوچ بچار کا نتیجہ تھا۔ ضمیر کے خلاف تھا۔ بڑی دماغی کاوش کی پیداوار تھا، جیسا کہ صفحہ ۱۲۲ میں مذکور ہو چکا۔

قرآن کا یہی وہ عجیب اثر تھا کہ قریش کے سرکش و منکر سردار، ایک طرف سب کو قرآن سننے سے منع کرتے تھے اور دوسری طرف خود اپنا یہ حال تھا کہ راتوں کو چھپ چھپ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان کے پاس جاتے تھے تاکہ آپ کی تلاوت سنیں، پھر واپسی میں جب ایک دوسرے کو دیکھ لیتے تھے تو آپس میں برا بھلا کہتے تھے کہ کیوں قرآن سننے گیے!

قرآن کا یہی وہ اثر تھا جس کی وجہ سے سرداران قریش نے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو منع کر دیا تھا کہ رات میں مسجد حرام کے اندر نماز پڑھیں یا قرآن تلاوت کریں، کیونکہ آپ کی تلاوت اور نماز میں آپ کا گریہ، لوگوں کو اسلام کی طرف کھینچتا تھا۔ قریشی سرداروں نے اپنی اس ممانعت کا سبب یہ بتایا کہ حضرت صدیق اُن کی عورتوں اور بچوں کو گمراہی میں مبتلا کر رہے ہیں، اور یہ کہ اُنہیں ڈر ہے کہیں یہ عورتیں اور بچے انہیں اسلام کے معاملہ میں بے بس و مغلوب کر ڈالیں۔ ان لوگوں نے حضرت

صدیق پر اتنی سختی کی کہ آپ نے ہجرت کی ٹھان لی، چنانچہ مکہ سے نکل کھڑے ہوئے، مگر راستہ میں ابنُ الدَّغنہ سے ملاقات ہو گئی جو اپنے قبیلہ کا سردار تھا۔ اُس نے ہجرت کا سبب پوچھا۔ آپ نے تمام ماجرا کہہ دیا۔ یہ شخص حضرت ابوبکر کو اور اُن کی خوبیوں کو ہمیشہ سے جانتا تھا۔ اُس نے اُنہیں اپنی پناہ میں لے لیا اور مکہ میں لوٹا لایا۔ مکہ میں واپس آنے کے بعد آپ نے پھر تلاوت شروع کر دی اور عورتوں اور نوجوانوں نے آکر اُسے سننا شروع کر دیا۔ یہ دیکھکر قریش نے ابن دغنہ کو مجبور کیا کہ حضرت ابوبکر پر دباؤ ڈالے کہ قرآن بلند آواز سے نہ پڑھیں اور اگر نہ مانیں تو اُنہیں پناہ سے خارج کر دے۔ حضرت ابوبکر کو جب یہ معلوم ہوا تو انہوں نے اُس کی پناہ کا وعدہ خود ہی واپس کر دیا کہ اللہ کی پناہ کافی ہے۔ اس واقعہ کو بخاری نے باب الہجرت میں روایت کیا ہے اور ہم نے بہ تفصیل آیت غار کی تفسیر میں درج کر دیا ہے (صفحہ ۳۶۴ جلد ۱۰)

قرآن کا یہی اثر دیکھکر قریشی سردار، طاقت کے زور سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خانہ کعبہ میں، میلوں میں، مجمعوں میں تلاوت سے روکتے اور آپس میں ایک دوسرے کو ایسا ہی کرنے پر اکسایا کرتے تھے، جیسا کہ قرآن میں مذکور ہے:۔

وَقَالَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَا | کافروں نے کہا اس قرآن کو نہ سنو

تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ۔	اور اِس کے مقابلے میں شور وغل کرو تاکہ تمھیں غلبہ حاصل ہو جائے۔

ایک فرانسیسی فیلسوف نے اِس بات کی اہمیت کا اندازہ کیا ہے اور عیسائی پادریوں کا یہ قول نقل کر کے کہ محمدؐ نے موسیٰ وعیسیٰ جیسے معجزے نہیں دکھائے، لکھا ہے "محمدؐ قرآن بڑے ہی خشوع اور آہ وزاری کے ساتھ تلاوت کرتے تھے اور اُن کی اِس تلاوت کا سننے والوں پر وہ اثر ہوتا تھا کہ پچھلے پیغمبروں کے تمام معجزوں کا بھی نہیں ہوا تھا۔ لوگ آپ کی تلاوت سنتے ہی ایمان کی طرف کھنچ آتے تھے،، میں کہتا ہوں کہ اگر قرآن، قانونی اور فنی کتابوں کی طرح ہوتا، تو اُس کا وہ اثر ہرگز نہ ہوتا جو موجودہ الہٰی اسلوب کا ہو چکا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قوم سے صرف اِس قدر چاہتے تھے کہ قرآن سنا کر پروردگار کا پیغام لوگوں تک پہنچا دیں۔ چنانچہ خدا نے آپ کو مخاطب کر کے فرمایا ہے:

قُلْ اَيُّ شَيْءٍ اَكْبَرُ شَهَادَةً؟ قُلِ اللّٰهُ شَهِيْدٌۢ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ	اے پیغمبر، پوچھو کہ سب بڑی گواہی کون ہے؟ کہہ دو کہ اللہ تمھارے اور میرے مابین گواہ ہے اور یہ قرآن مجھ پر وحی کیا گیا ہے کہ اِس کے ذریعہ تمھیں اور اُن

(۶ : ۱۹) | سب کو خبردار کر دوں جن تک وہ پہنچے۔

اور سورۂ نحل کے آخر میں فرمایا:

اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ رَبَّ هٰذِهِ الْبَلْدَةِ الَّتِيْ حَرَّمَهَا وَلَهٗ كُلُّ شَيْءٍ وَّ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ وَاَنْ اَتْلُوَا الْقُرْاٰنَ، فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ ضَلَّ فَقُلْ اِنَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ، وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ سَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ فَتَعْرِفُوْنَهَا وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ۔ (۲۷ : ۹۱ و ۹۲ و ۹۳)	مجھے اسی بات کا حکم دیا گیا ہے کہ اس شہر کے پروردگار کی پرستش کروں جسے اُس نے حرمت بخشی ہے اور ہر چیز اُسی پروردگار کی ہے، اور مجھے حکم ملا ہے کہ فرمانبرداروں میں سے ہو جاؤں، اور یہ کہ اس قرآن کی تلاوت کروں، پس جو کوئی ہدایت حاصل کرے تو اپنے ہی لیے ہدایت حاصل کرے گا، اور جو گمراہ بن جائے تو کہہ دو اے پیغمبر کہ میں تو بس خبردار کر دینے والا ہوں۔ اور کہو کہ تمام ستائش اللہ کے لیے ہے جو عنقریب تمھیں اپنی نشانیاں دکھائیگا اور تم انہیں پہچان جاؤگے۔ تیرا پروردگار ان لوگوں کے کرتوت سے غافل نہیں ہے۔

قریش کے سردار سب سے زیادہ جانتے تھے کہ لوگوں کو اسلام کی طرف کتنی کشش ہے، کیونکہ وہ اس کشش کو خود اپنے دلوں میں محسوس

کرتے تھے۔ پھر یہ بھی جانتے تھے کہ انکار و مخالفت کا جو سامان اُن کے پاس مہیّا ہے، دوسرے عربوں کے پاس نہیں ہے، چنانچہ آپ کے چچا ابو لہب نے اُن سے شروع ہی میں کہہ دیا تھا "اِس شخص کا تدارک کرو قبل اِس کے کہ عرب اِس کے جھنڈے تلے جمع ہو جائیں"، اور اُنہوں نے یہی کیا۔ پھر جب انہوں نے دیکھا کہ آپ بڑی ثابت قدمی سے اپنی دعوت پھیلا رہے ہیں اور ہر طرح کی سختیاں برداشت کرتے چلے جاتے ہیں تو آپ کو اور آپ پر ایمان لانے والوں کو زیادہ سے زیادہ تکلیفیں دینا شروع کر دیں، اور جب یہ تمام تشدّد بھی کارگر نہ ہوا تو آپ کو قتل کر ڈالنے کا فیصلہ کر لیا۔ بیچارے مسلمانوں کو بار بار ہجرت پر مجبور کیا۔ اِسی قدر نہیں بلکہ اُن سے اُن کے دار ہجرت اور اطراف میں جنگ بھی شروع کر دی، مگر خدا کی نصرت ہمیشہ اپنے پیغمبر ہی کے ساتھ رہی یہاں تک کہ کفار قریش مجبور ہو گئے کہ ۶ھ میں حُدَیبیہ کا صلحنامہ تحریر کریں۔ اِس معاہدہ کی سب سے اہم دفعہ یہ تھی کہ مؤمنین کو اجازت ہو گی کہ مشرکین سے ملیں جلیں۔ اِس شرط کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن کی اشاعت ہونے لگی اور مشرک جوق جوق دین الٰہی میں داخل ہونے لگے۔ امن و امان کے چار سال میں اسلام نے اُس سے کہیں زیادہ ترقی کی جتنی ابتدائی سولہ سال میں کی تھی۔

مومنوں پر قرآن کا اثر

ہجرت سے پہلے جو شخص اسلام میں داخل ہوتا تھا، اُسے قرآن سکھا دیا جاتا تھا، تاکہ اُس کی تلاوت سے عبادت کا ثواب پائے، اور نماز بتائی جاتی تھی۔ مکہ میں نماز کے سوا دوسرے ارکان اسلام فرض نہیں ہوئے تھے، چنانچہ مسلمان اپنی نمازوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرتے ہوئے قرآن تلاوت کرتے تھے۔ خود آپ پر شروع اسلام ہی سے خدا نے تہجّد کی نماز فرض کردی تھی، چنانچہ آغاز سورۂ مُزّمّل میں فرماتا ہے:

يَا اَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ قُمِ اللَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا، نِصْفَهٗ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا، اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيْلًا۔	اے کپڑوں میں لپٹنے والے، رات کو قیام کیا کر مگر تھوڑی رات، یعنی آدھی رات یا اس سے کچھ کم کردے، یا اس سے کچھ بڑھادے، اور قرآن خوب صاف صاف پڑھا کر۔

اور اسی سورۃ کے آخر میں ارشاد ہوا ہے:

اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ اللَّيْلِ وَ نِصْفَهٗ وَ ثُلُثَهٗ وَ طَائِفَةٌ	تیرا پروردگار جانتا ہے کہ تو اور تیرے ساتھیوں میں سے کچھ لوگ دو تہائی رات اور آدھی رات اور ایک تہائی رات

مِنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ وَاللّٰهُ يُقَدِّرُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ۔

کے قریب قیام کیا کرتے ہیں۔ رات اور دن کا پورا اندازہ اللہ ہی کرتا ہے۔ اُسے معلوم ہے کہ تم اِسے ضبط میں نہ لا سکو گے لہٰذا اُس نے تم پر عنایت کی ہے، سو تم اُتنا قرآن پڑھو جتنا آسانی سے پڑھ سکتے ہو۔

صحابۂ کرام کی نسبت مروی ہے کہ راتوں کو اُن کے گھروں سے تلاوتِ قرآن کے سبب ویسی ہی بھنبھناہٹ سی سنائی دیتی ہے جیسی شہد کی مکھیوں کی ہوتی ہے۔ بعض صحابہ نے عبادت و تلاوت میں اِتنا مبالغہ کر دیا تھا کہ رات بھر کھڑے نماز پڑھنے لگے یہاں تک کہ اُن کی عورتوں کو شکایت کرنا پڑی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اُنہیں ایسا کرنے سے منع کر دیا۔ خود آپ ہر رات تیرہ رکعتیں پڑھتے تھے جن میں ایک وتر ہوتی تھی اور باقی تمام دو دو رکعتیں ہوتی تھیں۔ آپ کی نمازیں بھی بہت دراز ہوا کرتی تھیں حتیٰ کہ کھڑے کھڑے قدم مبارک ورم کر آئے تھے۔

اِس پر خدا نے آپ کو تسلّی دینے کے لیے یہ آیت نازل کی:

طٰهٰ مَا اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى۔

اے پیغمبر، ہم نے تجھ پر قرآن اِس لیے نہیں اُتارا کہ تکلیف میں ہو جائے۔

پس صحابہ کی یہ تربیت جس نے جاہلیت کے تمام مفاسد اُن سے دور کر دیے تھے، جس نے اُنہیں پاک کر دیا تھا، جس نے تاریخ انسانی میں بے نظیر روحانی و اجتماعی انقلاب پیدا کر دیا تھا، تو یہ تربیت دراصل نماز میں اور نماز سے باہر قرآن کی بکثرت تلاوت اور اُس میں غور و فکر ہی کا نتیجہ تھا۔ حالت یہ تھی کہ بعض بعض صحابہ رات رات بھر کھڑے ایک ہی آیت کو پڑھا کرتے اور اُس کے مطالب پر غور کرتے رہتے۔ وہ لیٹ جانے پر بھی قرآن پڑھا کرتے تھے جیسا کہ خود قرآن میں ہے:

اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِہِمْ۔

سب سے بہتر ذکر الٰہی یہ ہے کہ اُس کی کتاب کی تلاوت کی جائے جس میں اُس کے اسماء حسنیٰ، مقدس صفات، احکام، حکمتیں، قوانین اور کائنات کے نظم میں اُس کے افعال بیان کیے گئے ہیں۔ اگر قرآن، قانون اور علوم و فنون کی کتابوں کی طرح ہوتا تو نہ طبیعتوں پر اُس کا یہ اثر ہو سکتا، نہ عادتوں کو اس طرح بدل سکتا، بلکہ اُس کی تلاوت سے دل اُکتا جاتے اور اُسے چھوڑ دیتے۔ پس قرآن کا یہ اسلوب جسے ہم بتا چکے ہیں، اُس کے لغوی اعجاز اور اُس کے روحانی اثر میں بہت بلند مقام رکھتا ہے۔ جس کسی کو اس میں شک ہو، اُسے چاہیے کہ پہلے اُس کی کسی ایک سورۃ کے مسائل دیکھے پھر اُنہیں یا ویسے ہی مسائل کو اُسی سورۃ

کے پیرایہ میں یا کسی ایسی سورۃ کے پیرایہ میں لکھے جس میں ایک ہی بات کئی طرح بیان کی گئی ہے، مثلاً پیغمبروں کے حالات سے عبرت حاصل کرنا جیسا کہ مفصّلات (مثلاً الذّاریات، القمر، الحاقۃ) میں موجود ہے، یا اُن سے پہلی سورتوں میں (مثلاً المؤمنون، الشعراء، النمل) یا جو اُن سے بڑی ہیں (جیسے الاعراف اور الھود) یہ سب کرچکنے کے بعد دیکھے کہ کس مضحکہ خیز ناکامی سے اُسے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

موجودہ زمانہ کے بعض علماء اجتماع نے بتایا ہے کہ دینی، سیاسی اور اجتماعی دعوتوں کے بار بار اعادہ و تکرار سے ہی قوموں میں جوش پیدا ہوتا ہے۔ وہ اُن میں منہمک ہوجاتی ہیں، اُن کے لیے جانیں قربان کرنے لگتی ہیں۔ یہ راز نہ محمدؐ جانتے تھے نہ اُن کے زمانہ کا کوئی اور آدمی، لیکن خدا قوموں کا مزاج اُن تمام حکماء و علماء سے زیادہ جانتا ہے جو اِس وقت موجود ہیں یا آیندہ زمانوں میں موجود ہونگے۔ قرآن اِسی خدا کا کلام ہے۔ اُس میں جو کچھ بھی تکرار ہے، وہ اِسی لیے ہے کہ ذہنوں میں انقلاب پیدا کرے، اور عقائد و اخلاق کو بدل کر بہتر بنادے۔ قرآن نے جو انداز اختیار کیا ہے اُس کے بغیر اصلاحی انقلاب ممکن ہی نہ تھا جیسا کہ آیندہ تفصیل سے معلوم ہوجائیگا۔

قرآن کے مقاصد اور اُن کی تکرار

انسانی افراد اور جماعتوں اور قوموں کی اصلاح کرنے، اُنہیں

منّ شعور میں داخل کرنے، اُن کی انسانی اخوت و وحدت کو قائم کر کے اُن کی عقلوں کو بلند، اور دلوں کو پاک کرنے کے لیے قرآن کے بعض مقاصد ایسے ہیں کہ اُنہیں ایک دو یا چند مرتبہ بیان کر دینا کافی تھا۔ بعض ایسے ہیں کہ اُنہیں بار بار دہرانے کی ضرورت تھی تاکہ دل کی گہرائیوں سے موروثی خیالات، رسم و رواج، اور بُری عادتوں کی جڑیں نکال دیں، اور اُن کی جگہ نیکی کی تخم ریزی کریں اور نیکی کے پودوں کو پرورش کریں تاکہ وہ پھولیں اور پھلیں۔ بعض مقاصد ایسے ہیں کہ انہیں پونے کا پورا تبا دینا چاہیے۔ بعض ایسے ہیں کہ اُن کی تکمیل بتدریج ہی ہو سکتی ہے۔ بعض ایسے ہیں کہ مستقبل ہی میں عملی صورت پا سکتے ہیں لہذا اُن کے لیے چند عام اصول وضع کر دیے گیے ہیں۔ اور بعض ایسے ہیں کہ اُن کے لیے صرف اشارہ و کنایہ ہی کافی تھا۔

قرآن، صرف تعلیم ہی کی کتاب نہیں ہے بلکہ تعلیم کے ساتھ عملی تربیت کی بھی کتاب ہے۔ لہذا اُس کے لیے مناسب نہ تھا کہ ہر مسئلہ کو ایک مرتبہ پوری وضاحت کے ساتھ بیان کر دے، جیسا کہ علوم و فنون اور قوانین کی کتابوں میں کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اِسی چیز کو بعثت محمدی کے سلسلہ میں فرمادیا ہے۔

ھُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ اللہ ہی نے اَن پڑھوں میں خود اُنہی میں

رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ آیَاتِهٖ وَیُزَکِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَةَ۔	سے ایک رسول بھیجا ہے جو اُن کے سامنے اُس کی آیتیں پڑھتا ہے، اُنہیں پاک کرتا، اور کتاب و حکمت سکھاتا ہے۔

ہم یہاں قرآنی مقاصد کی بنیادیں بیان کرتے ہیں، کیونکہ ہم نے اِس کا وعدہ کیا تھا جب بتایا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ اپنے ساتھ لائے ہیں وہ اُس سب سے اعلیٰ و اکمل ہے جو آپ سے پہلے انبیاء و حکماء وحکّام لا چکے ہیں، لہٰذا یہ اِس بات کی دلیل ہے کہ قرآن، خدا ہی کی طرف سے ہے نہ کہ آپ کی شخصی استعداد کا نتیجہ۔ ہم اِن قرآنی مقاصد کو چند قسموں پر تقسیم کیے دیتے ہیں، جن میں سے ہر ایک میں قرآن کی حکمت بیان کر دیں گے۔ ہم یہاں اختصار سے کام لینے پر مجبور ہیں۔ تفصیل کی نسبت ہمارا وعدہ ہے کہ اگر خدا نے چاہا تو قرآن کے تمام مقاصد علحدہ ابواب میں بیان کریں گے اور ہر باب میں دکھائیں گے کہ اِس مقصد کی انسان کو کتنی ضرورت ہے، اور یہ کہ قرآن نے اِس مقصد کو پورا کر دیا ہے۔ یہ سب ہم آیاتِ قرآنی ہی سے ثابت کر دیں گے۔

قرآن کا پہلا مقصد

دین کے ارکان ثلاثہ کی اصلاح

دین کی وہ تین بنیادی اصلیں جنہیں لے کر تمام پیغمبر آئے اور جن پر انسان کی سعادت کا دار و مدار ہے، اس آیت کریمہ میں مذکور ہیں:

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰی وَالصّٰبِئِیْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ (۲: ۶۲)	جو لوگ ایمان لائے اور جو یہودی بنے اور نصاریٰ اور صابئین (ان میں سے) جو اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے اور عمل صالح انجام دیتا ہے، تو ایسے لوگوں کا ثواب اُن کے پروردگار کے پاس ہے، اور اِن کے لیے نہ کوئی خوف ہوگا نہ وہ غم کریں گے۔

پہلی اصل: ایمان باللہ

دین کی پہلی اور سب سے بڑی اصل ــــــ اللہ تعالیٰ پر ایمان ہے۔ اس بارے میں تمام قومیں گمراہ ہو چکی ہیں، حتیٰ کہ وہ بھی جو پیغمبروں کے زمانہ و ہدایت سے بہت قریب ہیں۔ چنانچہ یہودیوں نے

اپنی گمرہی سے خدا کو انسان جیسا بنا دیا ہے جو تھک جاتا ہے اور انسان
کے پیدا کرنے پر نادم ہوتا ہے، کیونکہ اُسے معلوم نہ تھا کہ انسان خود اُسی
کا سا ہو گا یا "دیوتاؤں جیسا" ہو گا! نیز یہودی کہتے ہیں کہ خدا، انسان
کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے، حتیٰ کہ اُس نے اسرائیل سے کشتی لڑی
اور اسرائیل کی گرفت سے اُس وقت تک نکل نہ سکا جب تک
اُسے برکت نہ دیدی! پھر یہودیوں نے بعل اور دوسرے بتوں کی
پرستش بھی کی ہے۔ اسی طرح عیسائیوں نے قسطنطین کے زمانہ سے
پرانی بت پرستی زندہ کر دی ہے۔ دنیا میں شرک کا طوفان پھیلا
دیا ہے، یہاں تک کہ عیسائیوں کے گرجے، پرانی بت پرستی کے مندروں
کی طرح تصویروں اور بتوں سے لبریز ہو گیے ہیں، حالانکہ عیسائیوں
کا تثلیث، صلیب، اور فدیہ کا عقیدہ، ہندوؤں سے ماخوذ ہے جو
اُنہی کا جیسا اٹالوٹ رکھتے ہیں۔ عیسائی اپنے اِس عقیدہ کو ایک خیالی
اور نامعقول فلسفہ سے ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں، بڑے بڑے
بادشاہ اُسے رواج دیتے رہے ہیں۔ اِس کی راہ میں لاکھوں کروروں
روپیہ صرف کیا جاتا ہے۔ بچوں کی اِسی پر پرورش ہوتی ہے اور اُن
کے ناسمجھ دلوں میں اُسے اِس طرح بٹھا دیا جاتا ہے کہ بعد میں اُن پر
کوئی دلیل و حجت اثر نہیں کرتی۔

بت پرستی کے یہ مضبوط قلعے جو ذہنوں اور دلوں میں بنا دیے گیے ہیں، اُنہیں توڑنے کے لیے یہ کافی نہیں ہو سکتا تھا کہ توحید الٰہی کی ایک یا کئی دلیلیں دیدی جائیں، بلکہ ضروری تھا کہ تمام شبہات کو ایک ایک کر کے توڑا جاتا۔ عقلی، علمی، خطابی دلیلوں کو مختلف عبارتوں میں شرح و بسط سے بیان کیا جاتا۔ مثالیں دی جاتیں، اور طرح طرح سے سمجھایا جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں جس مسئلے کو سب سے زیادہ دُہرایا گیا ہے، وہ یہی مسئلۂ توحید ہے۔ بار بار زور دیا گیا ہے کہ صرف اُسی ذاتِ حق کی پرستش کرنی چاہیے، اور یہ کہ اُس کے سوا جو کچھ ہے، اگرچہ کوئی بھی ہو، اُس ذاتِ برحق کے مقابلہ میں نہ نفع پہنچانے کی قدرت رکھتا ہے نہ نقصان کی، بلکہ خود اپنے آپ کو بھی کوئی نفع نقصان پہنچا نہیں سکتا، مگر ہاں اُن اسباب کے ذریعہ جن میں تمام مخلوقات شریک ہیں جیسا کہ ہم بارہا بتا چکے ہیں۔ قرآن میں توحیدِ ربوبیت کو، یعنی اس بات کو کہ صرف خدا ہی خالق ہے، وہی سب کچھ کرتا ہے، وہی ساری دنیا کو چلاتا ہے، وہی قانون بناتا ہے، تو اسے قرآن نے اس لیے بار بار بیان نہیں کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت میں شرک کرنے والے بہت لوگ تھے، بلکہ اِس کی وجہ یہ ہے کہ توحیدِ ربوبیت کو یاد دلا کر شرکِ عبادت کو بے بنیاد ثابت کر دیا جائے۔ شرکِ عبادت یہ ہے کہ غیر اللہ کو اس

لیے پکارا جائے کہ اُس کے ذریعہ خدا سے تقرب حاصل کیا جائے یا سفارش و شفاعت کرائی جائے۔ سب سے بڑا، سب سے گہرا، اور کمزور عقلوں میں زیادہ پایا جانے والا شرک یہی ہے کہ آدمی اپنی کوئی تکلیف دور کرنے یا نفع حاصل کرنے کے لیے قدرتی اسباب سے کام نہ لے اور خدا کو چھوڑ کر کسی اور کی طرف متوجہ ہو جائے۔ قرآن میں دعا کا ذکر ستّر مرتبہ بلکہ اس سے کہیں زیادہ آیا ہے، کیونکہ دعا ہی عبادت کی روح اور مغز ہے، بلکہ دعا ہی عبادت اور سراسر دینِ فطرت ہے۔ اِس کے سوا جتنی عبادتیں ہیں، وہ حُکم کے ذریعہ قائم کی ہوئی ہیں۔

قرآن میں دعا کی بعض آیتیں ایسی ہیں جن میں خدا نے دعا مانگنے کا حکم دیا ہے۔ بعض میں غیر اللہ سے دعا مانگنے کی بالکل ممانعت کر دی ہے۔ بعض میں شرک کے بطلان یا توحید کے ثبوت کی دلیلیں ہیں۔ بعض میں مثالیں ہیں جو دونوں صورتوں کو مناسب حال موثر رنگ میں پیش کرتی ہیں۔ بعض میں بتایا گیا ہے کہ غیر اللہ کی دعا نہ مفید ہے نہ مقبول، اور یہ کہ آدمی جس ماسوا کو پکارتا ہے، اُسی کا بندہ بن جاتا ہے، اور یہ کہ افضل اور نیک بندے مثلاً فرشتے اور پیغمبر صرف خدا ہی کو پکارتے اور اُس کی طرف وسیلہ ڈھونڈھتے ہیں۔ اُس کی رحمت کی آرزو رکھتے ہیں۔ اُس کے عذاب سے ڈرتے ہیں، اور یہ کہ قیامت کے دن وہ اُن سب

لوگوں کے شرک سے بیزاری ظاہر کریں گے جو خدا کو چھوڑ کر یا اُس کے ساتھ انہیں پکارا کرتے ہیں۔ اسی طرح کی اور بہت سی باتیں ہیں جن کا ذکر طوالت کا موجب ہے۔

قرآن میں ایمان الٰہی سے متعلق بہت سی آیتیں ہیں جو توحید کی پرورش کرتی، معرفت الٰہی کے مختلف بلند درجوں پر موحّدوں کو پہنچاتی، محبت الٰہی کا جوش وجذبہ پیدا کرتی، اور تنزیہ و تقدیس و تسبیح کا ولولہ پیدا کرتی ہیں۔ ان آیتوں میں خدا کے اسماء حسنیٰ کو مختلف شرعی احکام حتیٰ کہ طہارت، عورت، میراث، اور مالیات کے احکام کے ساتھ ملا کر ذکر کیا گیا ہے۔ کائنات کی تخلیق و تدبیر کی حکمتوں، اور نوامیس فطرت کو اُن کے ساتھ ملا جلا دیا گیا ہے۔ رحمت، علم، حکمت، قدرت، مشیئت، حلم، عفو، مغفرت، محبت، رضا وغیرہ وغیرہ کے مناسب ہر اسم الٰہی کو رکھا گیا ہے۔ اُسی ذات حق پر توکل کرنے، صرف اُسی سے ڈرنے، صرف اُسی کی مہربانی سے آس لگانے کا حکم دیا گیا ہے۔ غرضکہ نہایت ہی عجیب ترتیب رکھی گئی ہے۔ غور کرو، اعلیٰ روحوں کو خدا کے کمالِ مطلق اور اُس میں فنا ہو جانے کے لیے کس کس مؤثر طریقوں سے جذب کیا گیا ہے۔ سورۂ حشر کی آخری آیتیں دیکھنے کے بعد سورۂ حدید کے آغاز

پہ نظر ڈالئے:

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ۔	تسبیح کی ہر اُس نے جو آسمانوں میں اور زمین میں ہے۔ اللہ عزت و حکمت والا ہے۔ وہ اول ہے۔ آخر ہے۔ ظاہر ہے۔ باطن ہے۔ اور ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔

عارف ولیوں اور ربانی اماموں نے کثرتِ ذکر و تلاوتِ کتاب سے تربیت حاصل کرنے کے بعد معرفت الٰہی اور اسرار کائنات پر اپنی کتابیں ایسی ہی آیتوں سے مطالب اخذ کرکے لکھی ہیں۔

یہ تکرارِ مطالب، جس نے قرآن کے معجز اسلوب کو دلوں کے لیے ایسا مقبول بنا دیا ہے کہ کوئی اُس سے اُکتاتا نہیں، تو اسی کے ذریعہ خدا نے عرب کی عقلیں اور دل، شرک کی گندگی اور بت پرستی کے خرافات سے پاک کر دیے تھے۔ اعلیٰ اخلاق اور بلند خصلتیں پیدا کر دی تھیں صرف عرب ہی نہیں بلکہ غیر عربوں کا بھی یہی حال ہوا جب وہ اللہ پر ایمان لائے۔ کتاب اللہ کی زبان اچھی طرح سمجھنے لگے۔ اُس کی تلاوت میں لگے رہے۔ اُس کی آیتوں پر غور کرتے رہے۔ لیکن جب امت میں قرآن کی زبان کا جہل پھوٹا۔ اُس میں غور کرنا کم ہو گیا۔ مسلمانوں نے اپنے عقیدے سمجھنے میں علم کلام کی کتابوں پر بھروسہ کر لیا، تو توحید کمزور پڑ گئی، اور ہ مسلمانوں نے اعتقاد، عمل، تاویل، اور کج بحثیوں میں پچھلی قوموں کی پوری

پوری پیروی شروع کر دی۔ پھر یہ ہوا کہ علم کے مدّعی، توحید کی بکثرت آیتوں کی اپنے پیدا کردہ شبہوں اور خواہشوں کے مطابق تاویل کرنے لگے جیسا کہ معلوم اور مشاہدہ ہے۔

ساتھ ہی بعض متکلموں اور صوفیوں نے توحید میں مبالغہ سے کام لیا، یہاں تک کہ بعض نے مسبّبات میں اسباب کے اثر ہی سے انکار کر دیا۔ بعض وحدۃ الوجود کے قائل ہو گئے، اور اِس سب کا خاتمہ اس پر ہوا کہ جبر کی بدعت نکل آئی جس نے اپنے قائلوں کو بالکل ہی گمراہ کر ڈالا۔ اِس گروہ کے متقدمین وہی کہتے تھے جس کی طرف اُن کی عقل یا نفسی ریاضت اور اُس سے پیدا ہونے والے وجدانی شعور کی رہنمائی ہوتی تھی۔ لیکن اِن کے بعد وہ مقلّد آئے جو نہ قرآن میں کوئی حصہ رکھتے تھے، نہ عقل میں، نہ وُجدان میں، بلکہ سراسر عوام الناس کے پیچھے چلنے والے تھے اور اپنے ہی جیسے جاہل مصنفوں کے ہذیان سے عوام کے لیے طرح طرح کی تاویلیں گڑھا کرتے تھے، حالانکہ اگر انہوں نے توحید و تنزیہ کی سب سے چھوٹی سورۃ ــــــ سورۂ اخلاص ــــــ ہی کو کماحقہ سمجھ لیا ہوتا، تو ہرگز شرک کی رسائی اُن کے دلوں تک نہ ہو سکتی۔

مسلمین اوّلین کی یہی توحید الٰہی، یہی معرفت و محبت الٰہی، اور خدا پر اُن کا یہی توکّل تھا جس نے اُن کے دل پاک کر دیے تھے۔

اُن کی ہمتیں بلند کر دی تھیں۔ خودداری، بہادری، حق و انصاف پر استواری کے جوہر پیدا کر کے اُنہیں مکمّل بنا دیا تھا۔ پھر یہی چیز تھی جس سے اُن کے لیے ممکن ہوا کہ ملک فتح کریں۔ قوموں پر حکمرانی کریں۔ کاہنوں، راہبوں، پروہتوں، روحی و عقلی پیشواؤں، اور ظالم بادشاہوں کے ظلم و استبداد سے انسانوں کو آزاد کر دیں۔ تہذیب کی بنیادیں استوار کریں۔ مردہ علوم و فنون کو زندہ کر کے ترقی دیں۔ اِن تمام باتوں میں اُنہیں ایسی کامیابی حاصل ہوئی جیسی بلکہ جس کے لگ بھگ بھی کسی اور قوم کو حاصل نہیں ہوئی تھی۔ اسی بنا پر مشہور اجتماعی مورخ ڈاکٹر گوسٹاف لیبان نے کہا ہے" ہر ترقی پذیر قوم میں فنون کا مَلکہ تین نسلوں ہی میں جا کر پورا ہوا ہے: پہلی نسل میں تقلید ہوتی ہے۔ دوسری میں تقلید و اجتہاد ملے جلے ہوتے ہیں۔ تیسری نسل سراسر اجتہاد اور استقلال فکری کی ہوتی ہے ـــــ لیکن صرف عرب اِس قاعدے سے مستثنیٰ ہیں، اُن میں فنون کا ملکہ اُسی پہلی نسل ہی میں پورا ہو گیا تھا جس میں اُنہیں فنون سے لگاؤ پیدا ہوا"

میں کہتا ہوں کہ اس کا سبب، قرآن ہے جس نے اُن میں عقلی خودمختاری پیدا کر دی تھی۔ تقلید کو اُن کی نگاہ میں حقیر بنا دیا تھا، اور اُن کے دلوں میں یہ ولولہ پیدا کر دیا تھا کہ دین و دنیا دونوں کے معاملات

میں انسانوں کی رہنمائی کریں۔ لیکن اسلامی خلافت اور عربی بیداری کے زوال اور اقتدار حکومت، عجمیوں کے ہاتھ میں چلے جانے کے بعد یہ سب کچھ بھی غائب ہوگیا۔ یہ عجمی وہ تھے جن کے پاس اسلام میں سے صرف تقلیدی مظاہر تھے اور وہ قرآن کی ہدایت سے بہت دور تھے۔

دوسری اصل: عقیدۂ قیامت اور جزاء وسزا

دین کا دوسرا رکن، یوم آخرت پر ایمان اعمال پر حساب اور جزاء وسزا کا یقین ہے۔ تمام بت پرست عرب اس عقیدے کے سختی سے منکر تھے، حالانکہ اس عقیدے کے بغیر نہ اللہ پر ایمان کامل ہو سکتا ہے نہ قوم میں عمل صالح انجام دینے، بدیوں اور شرارتوں سے بچنے، ظلم وسرکشی سے دور رہنے کا جذبہ پیدا ہو سکتا ہے۔

اہل کتاب اور دوسری قومیں جو آسمانی کتابیں اور دینی وشہری قوانین رکھتی ہیں، مگر اُن کی کتابیں گم ہوگئیں، یا اُن میں تحریف کردی گئی یا اُن پر بت پرستی نے قبضہ کر لیا، تو یہ قومیں اِس زندگی کے بعد بھی ایک زندگی کی اور وہاں اعمال پر جزاء وسزا کی قائل ہیں، لیکن اُن کے اِس ایمان میں بہت فساد پڑ گیا ہے، کیونکہ اُس کی بنیاد ایسی بدعتوں پر رکھی گئی ہے جن سے اُس کا اصلاحی فائدہ دور ہوگیا ہے اور جن کا سرچشمہ ہندو وغیرہ پرانی بت پرست قوموں کے عقائد میں ملتا ہے۔

چنانچہ عیسائیوں میں فدیہ ہوجانے والے نجات دہندہ کا اعتقاد پیدا ہوگیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ نجات دینے والا خود فدیہ بن کر انسانوں کو اُن کے گناہوں کی سزا سے بچالے گا۔ مسیحی ثالوث کا یہ دوسرا اقنوم ہے جو بعینہٖ اقنوم اوّل بھی ہے اور اقنوم سوم بھی۔ پھر یہ تینوں اقانیم باہم ایک ہی ہیں۔ ہر ایک الگ بھی ہے اور بالکل ایک بھی ہے۔ مسیح کے فدیہ ہونے وغیرہ کی نسبت عیسائی بالکل وہی کہتے ہیں جو ہندو اپنے ثالوث کے بارے میں کہتے ہیں۔ الفاظ اور معانی، دونوں کے ہاں یکساں ہیں جیسا کہ بیان ہوچکا۔ فرق صرف ناموں کا ہے۔ ان کے ہاں مسیح ہے اور وہاں کوئی دوسرا نام ہے۔

رہ گیے یہودی تو اُن کا پورا دین، قوم اسرائیل کے لیے خاص ہے اُن کا دعویٰ ہے کہ دنیا و آخرت میں خدا تمام قوموں کے مقابلہ میں قوم اسرائیل ہی کی طرفداری کرے گا۔ اسی لیے وہ خدا کا نام "خدائے اسرائیل" رکھتے ہیں، گویا وہ صرف اُنہی کا پروردگار ہے۔ ربُّ العالمین نہیں ہے۔ اِن کا دین، روحانیت سے زیادہ مادّیت سے قریب ہے۔ دین کے اِس رکن کی خرابی دراصل نتیجہ ہے پہلے رکن کی خرابی کا یعنی اِن لوگوں کا نہ اللہ تعالیٰ پر صحیح ایمان ہے نہ اُس کی صحیح معرفت ہی اُنہیں حاصل ہے، لہٰذا دین کے اِن دونوں رکنوں کی اصلاح کی ضرورت ہے۔

قرآن یہ اصلاح لیکر آیا ہے۔ سزا و جزاء کے عقیدے میں اُس نے پیغمبروں کے دین کو اُس کی معقول اصلیت پر استوار کر دیا ہے۔ وہ اصلیت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو یہ اعزاز بخشا ہے کہ اُس کی خوش نصیبی و بدبختی کو خود اُسی کے ایمان و عمل پر موقوف کر دیا ہے۔ ایمان و عمل، انسان کا اپنا ذاتی فعل ہے، کسی دوسرے کو اُس میں دخل نہیں ہے۔ کفر پر اور گناہوں پر جو سزا ملے گی وہ تمام مخلوقات میں اللہ کے مساوی عدل کے ساتھ ہوگی۔ یہ نہیں ہوگا کہ ایک قوم کو دوسری قوم پر کوئی ترجیح دیجائیگی۔ اِسی طرح ایمان اور نیکیوں پر جو ثواب ملے گا، وہ بھی انصاف کے ساتھ ہوگا۔ نیکی کا پھل اچھا ہی ہوگا۔ ایک نیکی کا ثواب دس گنا ملے گا اور خدا چاہیگا تو اُس میں اور بھی اضافہ کر دیگا۔

اِس پورے معاملہ کی بنیاد اِس آیت قرآنی میں موجود ہے:

وَنَفْسٍ وَمَا سَوّٰاهَا۔ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰاهَا قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰاهَا، وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰاهَا (۹۱: ۸)	قسم ہے نفس کی اور جیسا اُسے ٹھیک بنایا ہے، پھر اُسے بُرے اور بھلے کی سمجھ دیدی۔ جس نے اُسے سنوارا، کامیاب ہوا جس نے اُسے خراب کیا، نامراد ہوگیا۔

یعنی خدا نے اِس نفس کو پیدا کیا ہے، عقل و شعور بخش کر اُسے مکمل کر دیا ہے، پھر فطرت و جبلّت کے الہام کے ذریعہ اُس میں دونوں

قابلیتیں پیدا کر دی ہیں ؛ فجور کی بھی جو اُسے برباد و ناپاک کرنے والا ہے۔ تقویٰ کی بھی جو اُسے نجات دینے اور بلند کرنے والا ہے۔ اِن دونوں صورتوں کے اختیار کرنے میں نفس کو آزادی حاصل ہے۔ اُسے اختیار ہے کہ اپنے خیال و خواہش سے جسے چاہے ترجیح دے۔ پھر خدا نے انسان کو عقل اور دین کی نعمتیں بخشی ہیں جو ہمیشہ حق اور بھلائی کی باطل و شر کے مقابلہ میں سفارش کرتی ہیں۔ پس ایمان، مکارم اخلاق، اور محاسن اعمال کے ذریعہ نفس جس قدر پاک ہوگا، اُسی قدر اُسے دنیا و آخرت میں ترقی ملے گی۔ لیکن اگر وہ اِس کے برعکس روش اختیار کرے گا، تو نتیجہ بھی برعکس نکلے گا۔ بنابریں جزاء و سزا درحقیقت نفس و بدن کے عمل کا قدرتی نتیجہ ہی ہے جو نفس کو پاک کر یگا یا گندہ کر ڈالے گا۔ یہی وہ حق ہے جس کا اقرار ہر وہ شخص کریگا جو انسان کی حقیقت اور خدا کی حکمت سے واقف ہے۔ مذاہب کی تعلیمات میں سے یہ بھی ایک چیز ہے جس کی قرآن نے اصلاح کر دی ہے۔

یہ جان لینے کے بعد کہ عرب کے مشرک، عقیدۂ قیامت اور سزا و جزاء کے کتنے سخت منکر تھے، اِس بارے میں اہل کتاب اور تمام ملتوں کا ایمان کتنا بگڑ چکا تھا، اور یہ کہ اِس عقیدے سے ایمان الٰہی کی تکمیل ہوتی ہے، اور یہ کہ اِسی کے پیش نظر ہونے سے آدمی، باطل سے، شر سے،

ظلم و سرکشی سے باز رہتا، اور حق، نیکی، اور بھلائی کی راہ پر استوار ہوتا ہے ـــــ یہ سب ذہن نشین کر لینے کے بعد معلوم ہوجاتا ہے کہ یہ عقیدہ کسی بڑی قوم میں پختہ اور موثر ہو ہی نہیں سکتا تھا جب تک قرآن میں اُسے بار بار دہرایا نہ جاتا، اور ایسے عجیب انداز میں جو بہترین انداز بیان ہے، بیان نہ کیا جاتا جو دلائل و براہین سے لبریز ہے، حد درجہ دل کش و دل نشیں ہے، جس سے طبیعتیں کبھی اُکتا نہیں سکتیں۔

تمام دینوں میں قیامت اور جزاء و سزا کا عقیدہ، دوسرا رکن ہے اور پہلے رکن یعنی ایمان باللہ کے لیے لازمی ہے، وہ اللہ جو تمام صفاتِ کمال سے متصّف ہے، اپنے احکام و افعال میں کھیل کرنے سے مُبَرّا ہے۔ اسی لیے قرآن کی اِس عقیدے کے ثبوت میں سب سے بڑی دلیلیں یہ ہیں:

أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثًا وَأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُونَ۔	کیا تم نے یہ خیال کر رکھا ہے کہ ہم نے تمہیں یونہی کھیلنے کو پیدا کیا ہے اور تمھیں ہمارے پاس لوٹ نہیں آنا ہے۔

اور:

أَيَحْسَبُ الْإِنسَانُ أَن يُتْرَكَ سُدًى، أَلَمْ يَكُ نُطْفَةً	کیا انسان سمجھتا ہے کہ اُسے یونہی چھوڑ رکھا جائیگا۔ کیا وہ ٹپکنے والی منی کی ایک بوند نہ

مِنْ مَنِیٍّ یُّمْنٰی، ثُمَّ کَانَ عَلَقَۃً فَخَلَقَ فَسَوّٰی، فَجَعَلَ مِنْہُ الزَّوْجَیْنِ الذَّکَرَ وَالْاُنْثٰی، اَلَیْسَ ذٰلِکَ بِقَادِرٍ عَلٰۤی اَنْ یُّحْیِیَ الْمَوْتٰی؟

تھا، پھر پھٹکی ہوا، پھر خدا نے اُسے پیدا کیا اور پورا آدمی بنا دیا۔ پھر اُس سے جوڑا بنایا نر اور مادہ، کیا ایسا خدا اِس بات کی قدرت نہیں رکھتا کہ مردے زندہ کر دے؟

جو کوئی ایمان کے اِس رکن سے انکار کرتا ہے، تو لازم آتا ہے کہ مخلوقات میں پروردگار کی حکمت و عدل سے، انسان کو احسنِ تقویم میں پیدا کرنے کے احسان سے، انسان کو اِس زمین کی مخلوقات پر فضیلت دینے کے واقعہ سے بھی انکار کر جائے۔ اِسی قدر نہیں بلکہ خود اپنے حواس و قویٰ و عقل سے جہل کا اقرار کرے، اور اِس بات سے بھی جاہل ہونا مان لے کہ خدا نے اُسے اپنی حکمت سے ایک ایسے علم کے لیے مستعد پیدا کیا ہے جس کی کوئی حد نہیں ہے، اور جو اِس امر کی دلیل ہے کہ وہ ایک ایسی زندگی کے لیے پیدا کیا گیا ہے جو کبھی ختم ہونے والی نہیں ہے ــــــ اِس تمام انکار اور اِس جہل سے یہ بھی لازم آئے گا کہ انسان خود اپنے نفس کی بھی تحقیر کرے۔ یقین کرے کہ وہ کسی بڑی مصلحت سے نہیں بلکہ یونہی بے فائدہ پیدا کر دیا گیا ہے، اور یہ کہ زمین پر اُس کی زندگی بس اِسی عمر کے دائرے سے محدود رہے جو فکر، مصیبت، ظلم، سرکشی، گناہ سے لبریز ہے، اور یہ کہ کسی کو اُس کے عمل کا کوئی پھل نہیں ملے گا،

نہ ظالم کو اُس سے ظلم کی سزا دی جائیگی، نہ منصف کو اُس کے انصاف کا کوئی صلہ ملے گا، بلکہ سب کے کام یونہی بے فائدہ چلے جائیں گے، حالانکہ اِس طرح کا خیال کسی ٹھیک دماغ میں آ نہیں سکتا۔ چونکہ اِس دنیا میں ہر آدمی کو اُس کے عمل کا پھل لازمی طور پر نہیں ملتا، اِس لیے آخرت میں جو بدلہ دیا جائیگا، وہ عام انصاف کا سب سے بڑا مظاہرہ ہوگا۔

قیامت اور اعمال کے بدلے کے بارے میں عیسائیوں کا جو عقیدہ ہے۔ قرآن اُس کے خلاف کہتا ہے۔ قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ آخرت کی زندگی میں بھی انسان ویسا ہی ہوگا جیسا دنیا کی زندگی میں تھا، مگر ہاں پاک نفس، بلند روح رکھنے والے، زیادہ مکمل روح اور زیادہ مکمل جسم رکھیں گے، کیونکہ وہ دنیا میں اپنے آپ کو پاک کر چکے ہیں، لیکن خبیث نفس، اور پست روح رکھنے والے وہاں اور بھی زیادہ پست اور خبیث ہو جائینگے، کیونکہ وہ اپنے نفسوں کو دنیا میں گندہ کر چکے ہیں۔ قدیم مصریوں اور دوسری پرانی قوموں کی روایات سے ثابت ہے کہ پرانے دینوں نے بھی روح و جسم کے ساتھ دوسری زندگی کی تعلیم دی ہے۔

اگر صرف روحوں کا حشر ہو، تو ملکوتِ الٰہی میں سے یہ اچھی اور معزز مخلوق (انسان) کم ہو جائیگی جو روح اور جسم دونوں سے مرکب ہے اور روحی لذتوں اور جسمانی لذتوں، دونوں سے لطف اندوز ہوتی ہے، روح و جسم کے بنانے میں اللہ کی حکمتوں اور رازوں کو پوری کرنے والی

ہے، اور یہ اس طرح کہ اللہ نے حیوان و نباتات کو روحانی لذتوں سے محروم رکھا ہے اور فرشتوں کو جسمانی لذتوں سے۔ فلسفی نظریے رکھنے والے، صرف روحانی قیامت پر اس لیے زور دیتے ہیں کہ جسمانی لذتوں کو حقیر بتاتے اور اُنہیں حیوانیت قرار دیتے ہیں، حالانکہ اُن میں سے اکثر اِنہی لذتوں پر ریجھے پڑے ہیں۔ انسان کے حق میں یہ چیز اُسی وقت نقص ہے جب وہ جسمانی لذتوں ہی پر اپنی عقل و قوی وقف کردے اور علم و عرفان کی روحی و عقلی لذتوں سے بالکل کنارہ کش ہو جائے۔ یہ افراط و تفریط، ہندوؤں سے لی گئی ہے جو جسم کی تحقیر اور اُسے تکلیف دینے میں بہت غلو سے کام لیتے ہیں۔ اِس بارے میں بھی عیسائی زاہدوں نے ہندوؤں کی اُسی طرح پیروی کی ہے جس طرح صلیب، فدیہ، اور تثلیث کے معاملے میں اُن کے نقش قدم پر چل چکے ہیں، حالانکہ خود ہی مسیح علیہ السلام کی نسبت یہ بھی روایت کرتے ہیں کہ آپ نے عید فسح کے موقعہ پر اپنے شاگردوں کے ساتھ شراب پی اور اُن سے یہ کہکر رخصت چاہی "میں تم سے کہتا ہوں کہ انگور کا یہ شیرہ پھر کبھی نہ پیونگا، اُس دن تک کہ تمہارے ساتھ اپنے باپ کی بادشاہت میں نیا پیئوں"۔ (متی ۲۶ : ۲۹) یہودی اِس نفس کشی میں عیسائیوں سے برعکس روش رکھتے تھے، مگر اسلام نے اعتدال کی راہ پیش کی۔ انسان کو اُس کے

تمام حقوق بخش دیے، اور اُس سے اُن تمام چیزوں کا مطالبہ کیا جن
سے وہ اپنی انسانیت میں کامل ہو سکتا ہے۔

اِس مسئلہ کے تمام علمی و دینی پہلوؤں پر اور اُس سے متعلق
تمام شبہات پر ہم بڑی شرح و بسط سے سورۂ انعام کی تفسیر میں گفتگو
کر چکے ہیں جو قرآنی سورتوں میں ایمان باللہ، توحید، حشر، رسالت، اور
تمام شبہات کی تردید میں سب سے زیادہ جامع سورۃ ہے (صفحہ ۷۰-۴
۱۸۴ جلد ۸ تفسیر)

آخرت کی زندگی کے بارے میں قرآنی آیتوں اور نبوی حدیثوں
سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہاں روحانی قوتیں، جسموں پر غالب و حاوی ہونگی
اور اِس طرح مختلف لطیف صورتیں اختیار کر لینے کی قدرت رکھیں گے
تھوڑے وقت میں لمبی لمبی مسافتیں طے کر سکیں گے، اور جنّتیوں اور
دوزخیوں میں گفتگو بھی ہو سکے گی ــــــ ہمارے زمانہ میں انسان نے
علم کیمیا، بجلی کے خواص، مختلف صنعتوں، اور مشینوں میں جو ترقی کی ہے،
اُس نے اُن سب باتوں کو انسانی حواس سے قریب کر دیا ہے، حالانکہ
مادہ پرست دہریے پہلے ان کا انکار کیا کرتے تھے۔ مثلاً قرآن میں ہے:

وَنَادَىٰ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ أَصْحَابَ النَّارِ أَن قَدْ وَجَدْنَا	جنت والوں نے دوزخ والوں سے پکار کر کہا کہ ہمارے پروردگار نے ہم سے

مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا فَهَلْ وَجَدْتُّمْ مَّا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا؟ قَالُوْا نَعَمْ فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌ بَيْنَهُمْ اَنْ لَّعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ (۷:۴۴)	جو وعدہ کیا تھا ہم نے اُسے سچا پایا، کیا تم نے بھی اپنے پروردگار کا وعدہ سچا پایا؟ انہوں نے جواب دیا، ہاں! پھر اُن کے مابین پکارنیوالا پکارا کہ ظالموں پر اللہ کی لعنت ہوا

اِس قسم کی آیتوں کو یہ ملحد، محمد صلوات اللہ وسلامہ علیہ کے تخیلات قرار دیا کرتے تھے ــــــ لیکن آج حالت یہ ہے کہ ٹیلیفون کے ذریعہ مصر میں بیٹھکر ہم یورپ کے پایہ تختوں سے بات چیت کرتے ہیں۔ ریڈیو کے ذریعہ اُن کی تقریریں اور گانے سنتے ہیں۔ اور عنقریب ٹیلی ویژن کے ذریعہ گفتگو کے ساتھ اُنہیں دیکھنے بھی لگیں گے۔

فرنگی اور غیر فرنگی علما ارواح نے بھی صوفیوں کی طرح یہ طے کرلیا ہے کہ انسانی روحیں کائناتی مادّہ کو کام میں لاکر طرح طرح کے جسموں میں متشکل ہوسکتی ہیں۔ یہ مسائل ہم اپنی تفسیر میں شرح و بسط کے ساتھ لکھ چکے ہیں، اور یہاں اُنہیں اجمالاً اُن لوگوں کی تردید میں درج کرتے ہیں جو کہتے ہیں کہ قرآن، یہود و نصاریٰ کی کتابوں سے ماخوذ اور خود محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عقل اور روحی الہامات کی پیداوار ہے۔

یہاں یہ بتا دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قرآن میں دنیا کی بربادی اور قیامت کے بارے میں جو کچھ وارد ہوا ہے، وہ نہ اہل کتاب

کے ہاں موجود ہے نہ دوسروں کے ہاں، اور نہ یہ ممکن ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے اپنی ذہانت یا عقل سے، معلوم کر لیا ہو۔ قرآن نے اس بارے میں جو کچھ کہا ہے، اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک قارعہ ــ بظاہر یہ کوئی ستارہ ہے ــ زمین سے ٹکرا جائیگا۔ زمین کو ہلا کر پاش پاش کر ڈالے گا، اور وہ خاک ہو کر فضا میں پھیل جائیگی۔ تب اس چیز میں خلل پڑ جائیگا جسے علماء "جاذبیت" کہتے ہیں، اور ستارے بکھر جائینگے الخ یہ بات اُس وقت کے نہ علماء کون کے ذہن میں آسکتی تھی نہ علماء دین کے، لہٰذا ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے شہر کے کسی آدمی سے یا اپنے سفر میں سنی ہو۔ نیز یہ بھی گمان نہیں کیا جا سکتا کہ آپ نے اپنی رائے و عقل سے کہی ہو۔ بنا بریں یہ پیشین گوئی بھی قرآن کی اُن باتوں میں سے ہے جو وحی نفسی کے قائلوں کی قطعی تردید کر رہی ہیں۔ موجودہ زمانہ کے کئی علماء ہیئت نے بھی یہی کہا ہے کہ قرآن کے بتائے ہوئے اس سبب سے دنیا کی بربادی، علمی نظریوں سے قریب ترین ہے۔

تیسرا رکن، عمل صالح

پیغمبروں کے مقاصد بعثت کا تیسرا رکن، عمل صالح ہے، اور قرآن کی بکثرت سورتوں میں اُسے بار بار دہرایا گیا ہے تاکہ انسانوں نے اس میں جو خرابی پیدا کر دی ہے، دور ہو جائے۔ لوگوں نے نیکی کو بھی

تقلیدی کام بنا دیا ہے اور اِس طرح وہ نہ نفس کو پاک کرتی ہے نہ اجتماعی معاملات کی اصلاح کر سکتی ہے۔ لیکن عمل صالح کو توحید الٰہی اور اُس کی تقدیس سے کم دہرایا گیا ہے، کیونکہ توحید ہی اصل ہے اور باقی سب چیزیں اُس کے پیچھے ہیں۔ اگر دلوں میں اثر پیدا کرنے کے لیے اِس تکرار و اعادہ کی ضرورت نہ ہوتی تو سورۂ العصر اِس قدر چھوٹی ہونے کے باوجود علمی عملی اصلاح کے لیے اُسی طرح کافی تھی جس طرح سورۂ اخلاص اولین اعتقادی اصل کے لیے کافی تھی۔ یہ دونوں سورتیں ایک ایک سطر میں لکھی جا سکتی ہیں، لہذا قرآن کے ایجاز و ہدایت کے معجزوں میں سے ہیں۔

عمل صالح، ایمان باللہ کے لوازم میں درجہ اول رکھتا ہے، کیونکہ معرفت الٰہی کے ساتھ یہ بھی جان لیا جاتا ہے کہ وہ ذاتِ اعلیٰ، حمد، شکر، عبادت محبت، تعظیم کی مستحق ہے۔ نیز جزاء و سزا پر ایمان کے لوازم سے بھی یہی ہے کہ آدمی، سزا کے خوف اور ثواب کی امید پر نیک کام کرے۔

اعمال صالحہ میں عبادتیں بھی داخل ہیں جن کے ذریعہ تقرُّب الٰہی ہوتا ہے، اور نیکی کے وہ جملہ کام بھی داخل ہیں جن سے انسانوں کی اصلاح ہوتی ہے، مثلاً والدین سے اچھا برتاؤ۔ رشتہ کا خیال، یتیموں اور مسکینوں کا پاس۔ اِس بارے میں چند اصول سورۂ اسراء کی جامع وصیتوں میں موجود ہیں، اور حسب ذیل ہیں:

وَقَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا
إِلَّا إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا ۚ
إِمَّا يَبْلُغَنَّ عِندَكَ الْكِبَرَ أَحَدُ
هُمَا أَوْ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُل لَّهُمَا
أُفٍّ وَلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُل لَّهُمَا
قَوْلًا كَرِيمًا ۔ وَاخْفِضْ لَهُمَا
جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَ
قُل رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي
صَغِيرًا ۔ رَبُّكُمْ أَعْلَمُ بِمَا فِي
نُفُوسِكُمْ ۚ إِن تَكُونُوا صَالِحِينَ
فَإِنَّهُ كَانَ لِلْأَوَّابِينَ غَفُورًا
وَآتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ وَالْمِسْكِينَ
وَابْنَ السَّبِيلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا
إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا
إِخْوَانَ الشَّيْطَانِ ۖ وَكَانَ الشَّيْطَانُ
لِرَبِّهِ كَفُورًا ۔ وَإِمَّا تُعْرِضَنَّ
عَنْهُمُ ابْتِغَاءَ رَحْمَةٍ مِّن

اور پروردگار کا فیصلہ ہے کہ اُس کے سوا
کسی کی عبادت نہ کرو، اور والدین کے ساتھ
اچھا برتاؤ کرو، اور جب اُن میں سے کوئی
ایک یا دونوں تمھارے آگے بوڑھے ہوجائیں
تو اُنہیں نہ سخت بات کہو نہ جھڑکو (بلکہ)
مہربانی کی بات کہو۔ محبت سے اُن کے آگے
جھک جاؤ اور کہو خدایا اِن دونوں پر اُسی
طرح رحم کر جس طرح اِنہوں نے چھٹپن میں
مجھے پالا ہے۔ تمھارا پروردگار خوب جانتا
ہے کہ تمھارے دلوں میں کیا ہے، اگر تم نیکوکار
بنو تو وہ توبہ کرنے والوں کے حق میں بہت
بخشش کرنیوالا ہے۔ اور رشتہ دار کو اُس
کا حق دو، اور مسکین و مسافر کی مدد کرو،
(لیکن) اسراف نہ کرو۔ اسراف کرنیوالے
شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان
اپنے پروردگار کا ناشکرا ہے۔ اور اگر کبھی
رحمت خداوندی کی امید میں اُن سے

رَبِّكَ تَرْجُوهَا فَقُلْ لَهُمْ قَوْلًا
مَيْسُورًا۔ وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ
مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا
تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ
مَلُومًا مَحْسُورًا۔ إِنَّ رَبَّكَ
يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ
وَيَقْدِرُ، إِنَّهُ كَانَ بِعِبَادِهِ
خَبِيرًا بَصِيرًا۔ وَلَا تَقْتُلُوا
أَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ إِمْلَاقٍ
نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَإِيَّاكُمْ، إِنَّ
قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْأً كَبِيرًا۔ وَلَا
تَقْرَبُوا الزِّنَا، إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً
وَسَاءَ سَبِيلًا۔ وَلَا تَقْتُلُوا
النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا
بِالْحَقِّ، وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُومًا
فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهِ سُلْطَانًا
فَلَا يُسْرِفْ فِي الْقَتْلِ، إِنَّهُ

تغافل کرو، تو بھی اُن سے اچھی بات کہو
اور اپنا ہاتھ اپنی گردن سے نہ بالکل باندھ لو
اور نہ اُسے بالکل ہی چھوڑ دو (یعنی نہ بالکل
بخیل بنو نہ مسرف) کہ ملامت کھائے اور
ہارے ہوئے بنکر بیٹھنا پڑے تمہارا پروردگار
جس کے لیے چاہتا ہے۔ رزق پھیلا دیتا
ہے اور کم کردیتا ہے، وہ اپنے بندوں کی
خوب خبر اور پرکھ رکھتا ہے۔ اور اپنی اولاد کو
غربت کے ڈر سے قتل نہ کرو۔ ہم اُنہیں اور
تمھیں رزق دیتے ہیں۔ انہیں قتل کرنا بڑی
غلطی ہے۔ اور بدکاری کے قریب نہ جاؤ،
یہ بے حیائی اور بری راہ ہے۔ اور ناجائز طریقہ
پر کوئی ایسی جان نہ لو جسے مارنا خدا نے حرام قرار
دیا ہے۔ اور جو کوئی مظلوم کو قتل کرے تو ہم
نے مقتول کے وارث کو زور بخش دیا، مگر وہ
خونریزی میں اسراف نہ کرے (کیونکہ) اُسے
مدد ملی ہوئی ہے۔ اور اچھائی کے علاوہ کسی

كَانَ مَنْصُوْرًا۔ وَلَا تَقْرَبُوْا
مَالَ الْيَتِيْمِ إِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ
حَتّٰى يَبْلُغَ أَشُدَّهٗ، وَأَوْفُوْا
بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا۔ وَأَوْفُوا
الْكَيْلَ إِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ
الْمُسْتَقِيْمِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّأَحْسَنُ
تَأْوِيْلًا۔ وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ
بِهٖ عِلْمٌ، إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَا
لْفُؤَادَ كُلُّ أُولٰئِكَ كَانَ عَنْهُ
مَسْئُوْلًا۔ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ
مَرَحًا، إِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ
الْأَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا۔ كُلُّ
ذٰلِكَ مِمَّا أَوْحٰى إِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ
وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ إِلٰهًا آخَرَ فَتُلْقٰى فِيْ
جَهَنَّمَ مَلُوْمًا مَدْحُوْرًا (۱۷-۲۳-۳۹)

اور طرح یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ
یہاں تک کہ وہ جوان ہو جائے۔ اور عہد
پورا کرو، کیونکہ عہد کی بابت بازپرس کی جائیگی
اور جب ناپو، تو ناپ پوری کرو۔ اور سیدھی
ترازو سے تولو، یہ تمھارے لیے بہتر ہے اور
اُس بات کے پیچھے نہ پڑو جس کی تمھیں خبر
نہیں ہے، کیونکہ کان، آنکھ، اور دل سب
سے اِس کے بارے میں بازپرس ہوگی، اور
اِترا کر زمین پر نہ چلو، کیونکہ تم نہ زمین کو پھاڑ
سکوگے نہ اونچے ہو کر پہاڑوں تک پہونچ
سکوگے۔ یہ سب چیزیں تمھارے پروردگار
کی نظر میں بہت ہی بری ہیں۔ یہ ہے وہ حکمت
جو اللہ کی طرف سے اے پیغمبر تم پر وحی کی گئی
ہے، اور خدا کے ساتھ کسی اور کو معبود نہ بناؤ
ورنہ دوزخ میں ملامتی ہو کر ڈالے جاؤگے۔

یہ وصیتیں، توراۃ کے احکام عشرہ سے زیادہ جامع اور بلند ہیں۔

نیز سورۂ انعام کی اِن آیات کو دیکھو:

قُلْ تَعَالَوْا أَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ أَلَّا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ مِنْ إِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ ذَٰلِكُمْ وَصَّاكُمْ بِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ۔ وَلَا تَقْرَبُوا مَالَ الْيَتِيمِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ حَتَّىٰ يَبْلُغَ أَشُدَّهُ وَأَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا وَإِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ وَبِعَهْدِ اللَّهِ أَوْفُوا ذَٰلِكُمْ وَصَّاكُمْ بِهِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ (۶: ۱۵۱، ۱۵۲)

اے پیغمبر، کہہ دیجیے کہ آؤ میں تمھیں سناؤں کہ تمھارے پروردگار نے تم پر کیا حرام کیا ہے: یہ کہ اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ، اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو، اور اپنی اولاد کو غربت کے ڈر سے قتل نہ کرو کیونکہ ہم ہی تمھیں اور انہیں رزق دیتے ہیں، اور ناحق کسی ایسی جان کو نہ مارو جسے خدا نے مارنا حرام قرار دیا ہے۔ یہ ہے وہ جس کی اُس نے تمھیں وصیت کی ہے تاکہ تم سمجھو۔ اور یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ۔ لیکن اچھائی کے ساتھ یہاں تک کہ وہ جوان ہو جائے۔ ناپ تول ٹھیک ٹھیک کرو۔ ہم کسی پر اُس کی قوت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتے۔ اور جب تم بات کہو تو انصاف سے کہو، اگرچہ اپنے رشتہ دار ہی کے بارے میں کیوں نہ ہو، اور اللہ کے عہد کو پورا کرو۔ یہ ہے وہ جس کی اُس نے تمھیں وصیت کی ہے تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔

اسی قسم کی بے شمار آیتیں موجود ہیں جن میں اعلیٰ اخلاق اور نیکیاں اختیار کرنے کی ترغیب دی گئی ہے اور برائیوں اور گناہوں سے منع کیا گیا ہے جو جسم، مال، آبرو، عقل، اور دین سب کے لیے مضر ہیں، اور جن کا سب سے بڑا سبب، خواہش کی پیروی اور وسوسۂ شیطان کی اطاعت ہے۔ اس کے برعکس، تقویٰ ہے۔ تقویٰ ایک جامع لفظ ہے، جس میں ہر وہ بات داخل ہے جو نفس کو ناپاک ہونے سے بچاتی اور دنیا و آخرت میں اُسے برباد ہونے سے محفوظ رکھتی ہے، اسی لیے یہ لفظ (تقویٰ) دینی، خانگی، جنگی، غرضکہ تمام معاملوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اس سب کی تفصیل ہم اپنی تفسیر (صفحہ ۴۸۶ جلد ۹) میں کر چکے ہیں اور یہاں قرآن سے مثالیں دیکر طوالت کی ضرورت نہیں سمجھتے۔

اعمال صالحہ کی طرف رہنمائی میں قرآن کا دستور یہ ہے کہ وہ اعمال صالحہ کے اصول اور بنیادیں بیان کر دیتا ہے اور اجمالاً اُنہیں بار بار یاد دلاتا رہتا ہے۔ قرآن نے عبادات میں سب سے زیادہ نماز اور زکاۃ پر زور دیا ہے، کیونکہ نماز سب سے زیادہ بلند روحانی و اجتماعی عبادت ہے، اور زکاۃ سب سے بڑی مالی و اجتماعی عبادت ہے۔ ان دونوں عبادتوں کا حکم بہت سی آیتوں میں بار بار دیا گیا ہے اور دونوں کے اہم فوائد بیان کر دیے گئے۔ مثلاً فرمایا:

إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ وَلَذِكْرُ اللَّهِ أَكْبَرُ۔

نماز، بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے، اور بے شک اللہ کا ذکر سب سے بڑھکر ہے۔

اور فرمایا:

إِنَّ الْإِنسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا إِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوعًا وَإِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوعًا إِلَّا الْمُصَلِّينَ الَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ وَالَّذِينَ فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُومٌ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ وَالَّذِينَ يُصَدِّقُونَ بِيَوْمِ الدِّينِ وَالَّذِينَ هُم مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِم مُّشْفِقُونَ إِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَأْمُونٍ وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ إِلَّا عَلَىٰ أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ فَمَنِ ابْتَغَىٰ وَرَاءَ ذَٰلِكَ

انسان کم ہمت پیدا کیا گیا ہے جب اُسے تکلیف لاحق ہوتی ہے تو بہت ڈر جاتا ہے۔ جب بھلائی حاصل ہوتی ہے تو بخل کرنے لگتا ہے، بجز نمازیوں کے جو اپنی نماز کے پابند ہیں جنکے مال میں سائل کا اور محروم کا مقرر حق ہوتا ہے، جو روز آخرت پر یقین رکھتے ہیں، جو اپنے پروردگار کے عذاب سے ڈرتے ہیں، بے شک پروردگار کا عذاب بےخوفی کی چیز نہیں۔ جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ بجز اپنی بیویوں اور شرعی کنیزوں کے جن میں اُن پر ملامت نہیں ہے، اس کے علاوہ بھی جو لوگ کچھ چاہتے ہیں تو وہ زیادتی کرتے ہیں، اور جو اپنی امانتوں کی اور عہد کی پابندی

فَاُولٰئِکَ ھُمُ الْعَادُوْنَ وَالَّذِیْنَ ھُمْ لِاَمَانَاتِھِمْ وَعَھْدِھِمْ رَاعُوْنَ، وَالَّذِیْنَ ھُمْ بِشَھَادَاتِھِمْ قَائِمُوْنَ، وَالَّذِیْنَ ھُمْ عَلٰی صَلَاتِھِمْ یُحَافِظُوْنَ، اُولٰئِکَ فِیْ جَنّٰتٍ مُّکْرَمُوْنَ

کرتے ہیں، اور جو اپنی شہادتیں پوری ا[illegible] کرتے ہیں، اور جو اپنی نماز کی حفاظت کرتے ہیں، تو یہ لوگ عزت والی جنتو[ں] میں رہیں گے۔

اور فرمایا:

خُذْ مِنْ اَمْوَالِھِمْ صَدَقَةً تُطَھِّرُھُمْ وَتُزَکِّیْھِمْ بِھَا۔

اے پیغمبر ان کے مال میں سے صدقہ [لے] کر کے اس ذریعہ انہیں پاک اور ستھرا بنا[ؤ]

قرآن میں نماز، زکوٰۃ، روزہ، اور حج کے وہ ارکان و آداب دہرا[ئے] نہیں گیے ہیں جو عملی ہیں اور رسول کی پیروی سے اخذ کیے جاتے ہیں۔ قر[آن] نے اس بارے میں صرف وہی باتیں دہرائی ہیں جن سے کوئی خاص فا[ئدہ] مترتب ہو سکتا تھا۔ چنانچہ قرآن میں روزے کے احکام صرف ایک جگ[ہ] کیے گیے ہیں۔ ہر نماز میں رکعتوں کی اور رکوع و سجود کی تعداد نہیں بتائ[ی] ہے۔ نہ ہر مال میں زکوٰۃ کا نصاب درج کیا گیا ہے، کیونکہ یہ سب با[تیں] رسولؐ سے معلوم ہو جاتی ہیں اور عمل میں آکر محفوظ رہتی ہیں۔ پھر ا[ن کے] بیان سے نہ نفس کا تزکیہ ہوتا ہے نہ ایمان کا تغذیہ۔

انجیل پر قرآن کی برتری

میں یہاں صرف دو خوبیوں کو لکھتا ہوں جن کی بابت عیسائیوں کا دعویٰ ہے کہ اُن کی انجیل میں موجود ہیں اور اسلام کی تعلیم سے افضل واکمل ہیں:

۱۔ مسیح نے کہا ہے "اپنے دشمنوں سے بھی محبت کرو۔ اپنے لعنت کرنے والوں کے حق میں بھی دعا مانگو۔ جو تم سے برائی کرے، اُس سے بھلائی کرو۔ جو تمھارے دائیں گال پر طمانچہ مارے، اُس کے سامنے اپنا بایاں گال بھی پیش کر دو"

حالانکہ بداہتہً معلوم ہے کہ اِس قسم کے احکام کی تعمیل، ذلیلوں اور غلاموں کے سوا دوسروں کے لیے بہت ہی مشکل ہے، بلکہ یہ چیز بہت بڑے فساد کا موجب بن سکتی ہے، اور یہ اس طرح کہ زبردستوں کو کمزوروں پر ظلم کرنے کا پورا موقعہ مل جائیگا۔ پھر دیکھو کہ اِن احکام کی نافرمانی میں سب سے آگے وہی ہیں جو اپنے آپ کو عیسائی کہتے ہیں۔

اِس قسم کے احکام، عالمگیر دین فطرت میں وارد نہیں ہو سکتے تھے، کیونکہ اُن پر عمل ممکن نہیں۔ اِسی لیے خدا فرماتا ہے لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا (خدا کسی پر اُس کی قوت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا) لیکن ہاں اِس بارے میں، قرآن نے یہ کیا ہے کہ انصاف، نیکی، اور مصلحت

کو باہم جمع کر دیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ عَلَى اللّٰهِ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ۔ وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهِ فَأُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ إِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ أُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيْمٌ۔ وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ إِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْأُمُوْرِ (۴۲:۴۰ تا ۴۳)	برائی کا بدلہ برائی ہے، اگر جو شخص معاف کردے اور اصلاح کرے تو اس کا ثواب خدا کے ذمہ ہے۔ خدا ظالموں کو پسند نہیں کرتا ظلم ہونے کے بعد اگر کوئی اپنا بدلہ لے تو اس پر الزام نہیں ہے۔ الزام تو صرف ان لوگوں پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے اور ناحق دنیا میں سرکشی اختیار کرتے ہیں۔ ان لوگوں کو دردناک عذاب دیا جائیگا، اور جو شخص صبر کرے اور معاف کر دے تو بے شک بڑی ہمت کی بات ہے۔

ظاہر ہے زیادتی کے موقع پر عفو و درگزر وہی کر سکتا ہے جو بدلہ لینے کی قدرت رکھتا ہے۔ وہ معاف کرکے درحقیقت اپنی برتری ثابت کرتا ہے، اور اس طرح عداوت کے بدلے دوستی و محبت پیدا کر لیتا ہے، اسی لیے خدا نے فرمایا ہے:

وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ	نیکی اور بدی برابر نہیں۔ ہر برتاؤ کا جواب بہترین طریقہ پر دو، نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہارا

فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَکَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ۔ وَمَا یُلَقّٰهَآ اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا وَمَا یُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ (الم: ۳۴ و ۳۵)	دشمن بھی ایسا ہو جائے گا جیسے ناتے والا دوست۔ یہ بات اُنہی کو ملتی ہے جو صبر کا مادّہ رکھتے ہیں اور اُنہی کو ملتی ہے جو بڑے نصیبہ ور ہیں۔

دیکھو، قرآن نے کس طرح انصاف و نیکی کے مراتب کمال بیان کر دیے ہیں اور مصلحت و عقل کے مطابق کس خوبی سے اِسے واضح کر دیا ہے۔ کیا یہ افضل ترین پیغمبر و رہنما کی زبان سے ظاہر ہونیوالی اعلیٰ اصلاح اِس بات کی دلیل نہیں ہے کہ وہ اللہ کی وحی ہے جس کے ذریعہ اُس نے اپنے دین کو کامل کر دیا ہے؟ یقیناً واقعہ یہی ہے۔ ہم اِس کی گواہی دیتے ہیں، اور اِس سے انکار وہی کر سکتا ہے جو بے وقوف اور جاہل ہے!

۲۔ دوسری بات جس پر عیسائیوں کو بڑا ناز ہے، وہ دنیا سے بیزاری، اور اُس سے دور رہنے میں مسیح علیہ السلام کا مبالغہ ہے، حتیٰ کہ مسیح نے سوئی کے ناکے سے اونٹ کا گذر جانا اِس سے زیادہ آسان بتایا ہے کہ مالدار آدمی، جنت میں داخل ہو سکے۔

ہم کہتے ہیں کہ یہ تعلیم اور اِس سے پہلے کی تعلیم ایک وقتی اصلاح تھی۔ یہودیوں نے دولت کی پرستش میں بہت غلو کر رکھا تھا، جس سے

اُن کے اخلاق بگڑ گئے تھے اور دنیا کے مقابلہ میں دین کو ہیچ سمجھنے لگے تھے
غلو کا مقابلہ وقتی غلو ہی سے ہو سکتا ہے۔ اس طرح رومن سلطنت نے
یہودیوں کی آزادی چھین لی تھی، ظلم و سرکشی میں بہت آگے نکل گئی تھی،
لہٰذا حضرت مسیح نے اِن دونوں فسادوں کے مقابلہ میں اُن کا توڑ پیش کر دیا
جو عارضی تھا۔

لیکن اسلام، تمام انسانوں کا عالمگیر دین ہے۔ اُس میں تو وہی حکم
دیا جائے گا جس میں جملہ انسانوں کے دین اور دنیا کی مصلحت ہے۔ اس
بارے میں اُس نے مال کے ایسے استعمال کی مذمت کی ہے جو مضر ہو،
جیسے اسراف یا سرکشی کی راہ میں اُسے خرچ کیا جائے، یا ناجائز طریقہ پر
اُسے کھایا جائے، یا اُس میں جو حقوق فرض کر دیے گئے ہیں، انہیں روکا
جائے، یا غریبوں اور حاجتمندوں سے اُسے باز رکھا جائے ——— لیکن
جائز طریقہ پر اُسے حاصل کرنے اور جائز طریقہ پر خرچ کرنے کی تعریف کی گئی
ہے۔ اللہ کی راہ میں خرچ کرنا اور اُس سے قوم کو فائدہ پہنچانا، بہترین نیکی
قرار دیا گیا ہے، کیونکہ مال ہی کے ذریعہ قوم اپنی اصلیت اور آزادی کو محفوظ
رکھ سکتی ہے ——— یہی وہ باتیں ہیں جن سے خدا نے اپنے دین کی تکمیل کی
ہے، اور اُنہیں اپنے آخری رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اتاری ہوئی کتاب
میں وحی کیا ہے۔

ظاہر ہے قرآن کے ذریعہ آسمانی کتابوں کی یہ اصلاح، جن پر کروروں آدمی ایمان رکھتے ہیں، نہ کسی اَن پڑھ سے ممکن ہوسکتی تھی نہ تعلیم یافتہ سے۔ صرف آسمانی کتابوں ہی کی نہیں بلکہ قرآن نے حکیموں اور فلسفیوں کی کتابوں کی بھی اصلاح کر دی ہے۔ اب غور کرو کہ عقل، قرآن کو اللہ عزّوجل کی وحی قرار دیتی ہے یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مَن گھڑت ایجاد؟

فلسفیوں کا ذکر آگیا ہے، اس لیے کہتا ہوں کہ اُن کے بعض مقلدوں نے نیکیوں پر اور دین کی ٹھہرائی ہوئی بھلائیوں پر ایک شبہہ وارد کیا ہے، اگرچہ یہ شبہہ صرف زبان ہی سے ظاہر کرتے ہیں اور اُن کے دل و دماغ اُس کی حقیقت تک پہنچنے سے قاصر ہیں۔

یہ لوگ کہتے ہیں کہ نیکی صرف اِس وجہ سے کرنی چاہیے کہ نیکی ہے۔ اُن کے خیال میں یہ بہت بڑی بُرائی ہے کہ نیکی، آخرت کے ثواب کی امید یا عذاب کے خوف سے کی جائے۔ اِس کا مطلب یہ ہوا ـــــ اگر وہ اِس مطلب کو سمجھتے ہوں ـــــ کہ اسلام کی تعلیم کے مطابق نیکی کرکے آدمی کا یہ امید باندھنا کہ اعلیٰ کمال کے مالک، اللہ کی خوشنودی حاصل ہوگی اور اُس ذات برتر کے جوار میں مقام حاصل ہوگا تو یہ امید باندھنا نقص و عیب ہے۔ اور یہ کہ آدمی، کامل اِس طرح ہوسکتا ہے کہ اپنی فطرت سے دور ہو جائے اور نیکی صرف اِس لیے کرے کہ دوسروں کو نفع پہنچائے،

مگر اپنے نفس کو اس نفع سے اور رضوان الہی سے محروم رکھے ! لیکن وہ کون ہے جو اس قسم کی نیکی کی سرحدیں مقرر کرسکے اور انسانوں کو اس پر آمادہ کر سکے ؟

بہرحال اس گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ دین کے تینوں بنیادی ارکان تمام قدیم قوموں سے مروی ہیں، اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ تمام دینوں کا سرچشمہ ایک ہی ہے، اور وہ سرچشمہ، وحی الہی اور انبیاء کی ہدایت ہے، اور یہ کہ ان تمام دینوں میں چونکہ بت پرستی کی بدعتوں سے فساد پیدا ہوگیا تھا، اس لیے محمد اُمیؐ، اللہ کے پاس سے اس قرآن کو لیکر آئے، اور اُس تمام فساد کو دور کر دیا جس نے دین الہی کو انسانوں کی خوش نصیبی اور بھلائی سے دور کر رکھا تھا۔ توحید کو شرک سے آلودہ کر دیا تھا۔ خدا کو مخلوق کی طرح بنا دیا تھا۔ اعمال کی سزا و جزاء کا دار و مدار حق و انصاف پر نہیں، بلکہ طرفداری اور فدیہ پر کر دیا تھا۔ عبادتوں کو تقلید کی راہ سے لہو و لعب بنا دیا تھا، جن سے نہ نفس کو پاکیزگی حاصل ہوتی تھی، نہ وہ عقل ہی کی ترازو میں پوری اترتی تھیں۔ برخلاف اس کے اسلام کی لائی ہوئی عبادتیں اور اُس کے آداب، تمام کے تمام معقول اور انسانی فطرت کی تکمیل کرنے والے ہیں۔

اب ہم بتاتے ہیں کہ نبوت اور پیغمبروں کے فرائض کے بارے

میں انسانوں کو جو گمراہی اور جہالت لاحق ہو گئی تھی، اُسے قرآن نے کس طرح بیان اور صاف کر دیا ہے۔ اس کے بعد ہم بتائیں گے کہ قرآن میں انسانوں کی دائمی اور عام اصلاح کے کون اصول بتائے گیے ہیں جو اس بات کا قطعی ثبوت ہیں کہ قرآن، اللہ ہی کی طرف سے ہے نہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم و معارف کا نتیجہ جیسا کہ بعض گمراہوں نے سمجھ رکھا ہے۔

قرآن کا دوسرا مقصد

نبوت، رسالت، اور پیغمبروں کے فرائض

عرب، وحی و رسالت کے منکر تھے۔ بلاشبہ دین حنیفی کے جو چند ماننے والے حجاز وغیرہ میں اور وہ عرب جو یہودیت یا عیسائیت قبول کر چکے تھے، اس کے قائل ضرور تھے، مگر اُن کی تعداد بہت کم تھی۔

مشرکین عرب کا وحی کے بارے میں شبہہ یہ تھا کہ اُن کے خیال میں یہ بات کسی طرح نہ آتی تھی کہ تمام آدمیوں کے مقابلہ میں چند لوگوں کو خدا پیغمبری کی فضیلت بخش سکتا ہے، حالانکہ اُن کے زعم میں تمام انسان بشری صفتوں میں برابر ہیں۔

یہودیوں کا خیال بھی عرب بت پرستوں سے قریب تھا۔ یہودی کہتے تھے کہ خدا اپنی پیغمبری کے لیے اپنے جس بندے کو چاہے،

منتخب نہیں کر سکتا، بلکہ یہ منصب ہمیشہ کے لیے بنی اسرائیل ہی کے لیے خاص کر دیا گیا ہے، گویا باقی انسان اُس رحمت و فضل کے مستحق ہی نہ تھے جو خدا نے اپنی پیغمبری کے ذریعہ یہودیوں کو بخش رکھی تھی۔ لیکن نفس نبوت کے قائل ہونے کے باوجود یہ لوگ، انبیاء کو خدا کے مقابلہ میں بھی جھوٹ، دھوکے، اور فریب سے بھی آلودہ بتاتے تھے! کہتے تھے خدا نے پیغمبروں سے کشتی لڑی اور پیغمبروں نے کبیرہ گناہ بھی کیے، جیسا کہ اِس بحث کے پہلے حصہ میں ہم بیان کر چکے ہیں۔

یہودیوں کی طرح عیسائیوں کا بھی یہی خیال تھا اور آج تک ہے کہ نبوت صرف بنی اسرائیل میں محدود ہے۔ پھر اُنہوں نے پیغمبروں کے علاوہ مسیحؑ کے حواریوں اور دوسرے لوگوں کو بھی معصوم قرار دیا اور اُن کی بھی پرستش کرنے لگے۔ ساتھ ہی اُن کا بیان یہ بھی ہے کہ مسیحؑ کے بعض خاص الخاص حواریوں تک نے مصیبت کے وقت مسیحؑ سے انکار کیا اور بعضوں نے اُنہیں دشمنوں کے حوالہ کر دیا۔ خود مسیح علیہ السلام کی بابت کہتے ہیں کہ آپ نے اپنے حواریوں سے پیشین گوئی کر دی تھی کہ "تم سب آج رات مجھ سے مُکر جاؤ گے"۔

پھر یہودیوں اور عیسائیوں، دونوں نے اپنے احبار و رہبان اور پیشواؤں کو اللہ تعالیٰ سے ہٹ کر پروردگار بنا لیا تھا، اور یہ اِس

طرح کہ اُنہیں دینی تشریع، یعنی عبادتیں مقرر کرنے اور اپنے دل سے حلال وحرام کا فیصلہ کرنے کا حق دیدیا تھا (دیکھو تفسیر جلد۔ اصفحہ ۲۶۳) حالانکہ یہ سب اللہ سے کفر ہے۔ اُس کے انصاف سے انکار ہے۔ اُس کی رحمت وفضل کی عالمگیری سے روگردانی ہے۔ نوعِ انسان کے لیے فساد کا سرچشمہ ہے۔ چند آدمیوں کی غلامی میں تمام آدمیوں کو دیدینے کا سبب ہے۔

مگر خدا نے اپنے خاتم النبیین پر کتاب نازل فرما کر اس تمام فساد کا ازالہ کر دیا، اور یہ اعلان کر دیا کہ تمام قوموں میں اُس نے اپنے پیغمبر بھیجے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ فَمِنْهُم مَّنْ هَدَى اللَّهُ وَمِنْهُم مَّنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلَالَةُ (۱۶: ۳۶)	ہم نے ہر قوم میں رسول بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے بچو۔ ان میں سے بعض کو خدا نے ہدایت بخشی اور بعض گمراہی کا شکار ہو گیے۔

اور فرمایا:

إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ بِالْحَقِّ بَشِيرًا وَنَذِيرًا وَإِن مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ (۳۵: ۲۴)	اے پیغمبر، ہم نے آپ کو بشیر ونذیر بنا کر حق کے ساتھ بھیجا ہے، کوئی قوم نہیں جس میں کوئی ڈرانیوالا گزر نہ چکا ہو۔

اور انسان کی اِس طرح عزت افزائی کی کہ دینی تشریع کا حق صرف اللہ ہی کے لیے خاص بتایا اور کہہ دیا کہ پیغمبروں کا کام صرف اِس قدر ہے کہ اُس کا پیام پہنچاتے ہیں، مگر قوموں پر حکمراں نہیں ہیں، اور یہ کہ پیغمبروں کی اطاعت، خدا کی اطاعت کے بعد ہے۔ اس طرح قرآن نے دینی قانون سازی کے حق سے محروم کر کے پیغمبروں کی ربوبیت کا خاتمہ کر دیا اور اُن کی پرستش کے ساتھ دوسروں کی پرستش کا بھی قلع قمع کر ڈالا۔ اِس طرح قرآن کی بدولت انسان، روحانی اور عقلی غلامی سے آزاد ہو گیا جس کا شکار متمدن قومیں خصوصاً عیسائی ہو چکے تھے۔

چونکہ اس بارے میں تمام قومیں اور ملتیں گمراہ ہو چکی تھیں، اِس لیے اِس اصلاح کو بھی بہت سی سورتوں میں بار بار دہرایا گیا ہے اور صاف لفظوں میں فرما دیا گیا ہے کہ پیغمبر بھی سب آدمیوں کی طرح آدمی ہی ہیں، مگر ہاں اُن پر وحی نازل ہوتی ہے، اور یہ کہ اُن کا کام صرف اِس قدر ہے کہ خدا کا پیغام، انسانوں کو پہنچا دیتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے خاتم النبیین اور تمام پیغمبروں کے دین کو مکمل کرنے والے پیغمبر کو مخاطب کر کے فرمایا ہے:

قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ أَنَّمَا إِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ فَمَنْ	اے پیغمبر کہہ دیجئے کہ میں بھی تمھارا ہی جیسا ایک آدمی ہوں (البتہ) مجھ پر وحی آتی ہے

كَانَ يَرْجُوا لِقَاءَ رَبِّهِ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَدًا (۱۸: ۱۱۰)	کہ تمھارا خدا ایک ہی خدا ہے۔ پس جو شخص اپنے پروردگار سے ملنا چاہتا ہے، اُسے چاہیے کہ نیک عمل انجام دے اور اپنے پروردگار کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔

اور اسی طرح سورۃ کے وسط میں تمام پیغمبروں کی نسبت فرمایا:

وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِينَ إِلَّا مُبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ (۶۵)	ہم نہیں بھیجتے رسول مگر بشارت دینے والے اور ڈرانے والے۔

اِسی طرح سورۂ انعام میں ارشاد ہوا ہے:

وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِينَ إِلَّا مُبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ فَمَنْ آمَنَ وَأَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (۶: ۴۸)	ہم نہیں بھیجتے رسول مگر بشارت دینے والے اور ڈرانے والے، پس جو لوگ ایمان لائے اور اصلاح پر رہے، نہ ان کے لیے کوئی خوف ہے نہ وہ رنجیدہ ہوں گے۔

اِسی کے ہم معنیٰ بہت سی آیتیں ہیں، جن میں صاف بتا دیا گیا ہے کہ خدا نے پیغمبروں کو اس لیے بھیجا ہے کہ قول، عمل، اور تنفیذ کے ذریعہ بشارت دیں اور ڈرائیں، اور یہ کہ وہ خود اپنے آپ کو بھی نہ نفع پہنچانے کی قدرت رکھتے ہیں نہ نقصان کی، نہ ہدایت کی نہ شریعت اور سننِ الٰہی

سے روگردانی کر کے عذاب الٰہی سے بچ جانے کی۔ اس کی تشریح ہم نے آیات ذیل کی تفسیر میں بخوبی کر دی ہے:

قُلْ لَّاۤ اَمْلِكُ لِنَفْسِیْ نَفْعًا وَّ لَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ وَ لَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَیْبَ لَا سْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَیْرِ ۚۖۛ وَ مَا مَسَّنِیَ السُّوْٓءُ ۚۛ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِیْرٌ وَّ بَشِیْرٌ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ۠۔ (۷: ۱۸۷)

اے پیغمبر کہہ دیجیے کہ میں اپنی ذات کے لیے بھی نہ کسی نفع کی قدرت رکھتا ہوں نہ نقصان کی بجز اس کے جو خدا چاہے اگر میں غیب جانتا تو بہت سا نفع حاصل کر لیتا اور مجھے نقصان نہ پہنچتا میں اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایمان لانیوالوں کو ڈرانے اور بشارت دینے والا ہوں۔

عنقریب یہی مطالب اسی سورۃ کی آیت ۹۴ میں آئیں گے اور ہم اُس کی تفسیر بیان کر دیں گے۔ پھر خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اقوال، اعمال، اخلاق، عبودیت خاکساری میں یہی بات اتنی صفائی سے ظاہر کر دی ہے کہ قرآنی آیات کی "کوئی" اور تاویل کی ہی نہیں جاسکتی۔ حتیٰ کہ بعض آزاد خیال علماء فرنگ نے بھی یہ حقیقت محسوس کر لی اور کہہ دیا کہ محمدؐ نے جب دیکھا کہ عیسائیوں نے اپنے نبی کو خدا بنا کر اور اُس کی عبادت کر کے اپنے آپ کو پستی میں ڈال دیا ہے، تو محمدؐ نے صرف اسی پر اکتفاء نہیں کیا کہ اپنا لقب "رسول اللہ" قرار دیا بلکہ مسلمانوں کو یہ کہنے کا بھی حکم دیا کہ

"اشھد ان لا الٰہ الا اللہ واشھد ان محمداً عبدہ ورسولہ"
(میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اور گواہی دیتا ہوں کہ محمد اُس کے بندے اور رسول ہیں)

اسی طرح عرب بت پرستوں کا خیال تھا کہ دنیا میں نفع حاصل کرنے کے لیے اُن کے معبود، خدا کے ہاں اُن کی شفاعت یا سفارش کرتے ہیں۔ اور یہود و نصاریٰ قائل تھے کہ دنیا اور آخرت دونوں میں اُن کے پیغمبر اور پیشوا، شفاعت کرتے ہیں۔ لیکن قرآن نے اِس خیال کی تردید کر دی اور صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ شفاعت کا معاملہ سراسر اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے اور یہ کہ اُس کی اجازت کے بغیر کوئی بھی شفاعت کرنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ چنانچہ فرمایا:

يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُونَ إِلَّا لِمَنِ ارْتَضَىٰ وَهُم مِّنْ خَشْيَتِهِ مُشْفِقُونَ وَمَن يَقُلْ مِنْهُمْ إِنِّي إِلَٰهٌ مِّن دُونِهِ فَذَٰلِكَ نَجْزِيهِ جَهَنَّمَ ۚ كَذَٰلِكَ نَجْزِي الظَّالِمِينَ (۲۱: ۲۸، ۲۹)	خدا اُن کے آگے پیچھے، سب کا علم رکھتا ہے، وہ شفاعت نہیں کرینگے، مگر جس کے لیے وہ راضی ہو اور وہ اُس کی خشیت سے ڈرتے ہونگے۔ اور جو کوئی یہ کہے کہ خدا نہیں میں معبود ہوں تو ہم اُسے جہنم کی سزا دینگے لہٰذا ہم اسی طرح ظالموں کو سزا دیا کرتے ہیں۔

اس کی تفصیل ہم سورۂ بقرہ وغیرہ کی تفسیر میں بیان کر چکے ہیں۔

اور اُس میں یہ بھی وضاحت کر دی گئی ہے کہ احادیث میں جس شفاعت کو بتایا گیا ہے، وہ اُس شفاعت سے مختلف ہے جس کی قرآن میں تردید کی گئی ہے۔ اِس مسئلہ کی قرآن نے پہلے مسئلہ سے کم تکرار کی ہے، کیونکہ یہ اُسی کی ایک شاخ ہے اور اِس کا قائل کر دینا آسان ہے۔

اب تم غور کر سکتے ہو کہ قرآن نے اِس شفاعت کے معاملہ کی بھی اصلی حقیقت بیان کر دی ہے، حالانکہ اِس معاملے کی وجہ سے کروروں انسان گمراہ ہو چکے تھے اور خدا کے ساتھ ایسی چیزوں کو شریک بنانے لگے تھے جو نہ نفع پہنچا سکتی ہیں نہ نقصان۔ اب انصاف سے کہو کہ کیا یہ ہدایت، محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل کتاب کے علماء سے حاصل کی تھی؟ کیونکر تصور کیا جا سکتا ہے کہ اُنھوں نے یہ حقیقت آپ کو تو بتا دی ہو اور اپنی قوم سے مخفی رکھی ہو؟ اگر یہ نہیں تو پھر کیا یہ چیز آپ کے ذہن کی پیداوار تھی؟ اگر آپ کے ذہن کی پیداوار تھی تو اِس کے معنیٰ یہ ہوئے کہ اہل کتاب کے دعوے کے بموجب آپ کا ذہن، وحی الٰہی سے بھی برتر تھا۔ نہیں، ہرگز نہیں، بلکہ آپ کی لائی ہوئی ہدایت سراسر اللہ تعالیٰ کی وحی تھی۔

تمام پیغمبروں پر ایمان

قرآن نے بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تمام پیغمبروں پر ایمان لانا

فرض ہے اور اُن کے ایمان میں فرق کرنا جائز نہیں ہے۔ نیز تصریح کردی ہے کہ بعض پیغمبروں پر ایمان لانا اور بعض سے کفر کرنا، تمام پیغمبروں سے کفر کرنا ہے، کیونکہ سب کے سب، اللہ ہی کی طرف سے ہیں، اور سب کا فرض ایک ہی ہے یعنی خدا کا پیغام پہنچانا، لہٰذا سب کو ماننا چاہیے نہ یہ کہ ایک کو یا چند کو مانا جائے اور باقی سے انکار کیا جائے۔ چنانچہ سورۂ بقرہ کے آخر میں فرمایا:

آمَنَ الرَّسُولُ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مِنْ رَبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ كُلٌّ آمَنَ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْ رُسُلِهِ	جو کچھ پروردگار نے اتارا ہے، رسول اس پر ایمان لایا ہے اور مومن لوگ، سب ایمان لائے ہیں اللہ پر، اُس کے ملائکہ پر، اُس کی کتابوں پر، اُس کے رسولوں پر (اور کہتے ہیں کہ) ہم اُس کے رسولوں کے مابین تفریق نہیں کرتے۔

اور سورۂ نساء میں واضح طور پر فرمادیا گیا ہے کہ ایمان میں اُن کے مابین فرق کرنا، اصلی کفر ہے، اور یہ کہ بغیر کسی تفریق کے سب پر ایمان لانا اصلی اور سچا ایمان ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا ہے:

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيُرِيدُونَ أَنْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ اللَّهِ وَرُسُلِهِ	جو اللہ سے اور اُس کے رسولوں سے کفر کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اُس کے رسولوں کے مابین تفریق کریں اور کہتے ہیں کہ ہم

وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَيُرِيدُونَ أَنْ يَتَّخِذُوا بَيْنَ ذَٰلِكَ سَبِيلًا ۔ أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ حَقًّا وَأَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا مُهِينًا وَالَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَلَمْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ أُولَٰئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيهِمْ أُجُورَهُمْ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا (۴: ۱۵۰ تا ۱۵۲)

بعض پر ایمان رکھتے ہیں اور بعض سے کفر کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس کے (کفر و ایمان) بیچ کا راستہ اختیار کریں، تو یہی لوگ اصلی کافر ہیں، اور کافروں کے لیے ہم نے اہانت والا عذاب طیار کر رکھا ہے۔ جو لوگ اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے اور اُن میں سے کسی کے مابین تفریق نہیں کی، تو اُنہیں خدا عنقریب اُن کے ثواب بخشدیگا اور خدا غفور و رحیم ہے۔

اور اس کی بنیاد اِس ایمان پر ہے کہ اللہ تعالیٰ کا دین جسے دیگر اُس نے اپنے تمام پیغمبروں کو بھیجا، ایک ہی ہے، اور انسانوں کی ہدایت، اصلاح، اور دنیا و آخرت میں شادکامی کے لیے اُنہیں طیار کرنے کے مقصد میں تمام پیغمبروں کے دین ایک ہی ہیں۔ ہاں زمان و مکان کے اختلاف اور قوموں کی قابلیت کے تفاوت سے عبادتوں اور شریعتوں کی صورتیں مختلف ہوتی رہی ہیں۔ بنابریں بعض پیغمبروں پر ایمان لانا اور بعض سے انکار کرنا، خواہش کی پیروی اور دین کی حقیقت سے جہل ہے، اسی لیے اِس قسم کا ایمان معتبر نہیں، بلکہ عین کفر ہے۔

اِس حقیقتِ عادلہ کے مالک صرف مسلمان ہی ہیں نہ کہ اہلِ کتاب جو صرف اپنے باپ دادا، اسرائیلی پیغمبروں ہی کو مانتے ہیں، حالانکہ بدترین عیوب اور فواحش سے بھی اُنہیں متہم کرنے سے باز نہیں رہتے!

لیکن مسلمانوں کا ایمان یہ ہے کہ ربُّ العالمین نے تمام قوموں میں ہدایت یاب اور ہدایت کی طرف بلانے والے پیغمبر بھیجے ہیں۔ چنانچہ مسلمان تمام پیغمبروں پر اجمالاً اور قرآن نے جن کا حال بیان کیا ہے، اُن پر تفصیلاً ایمان رکھتے ہیں۔ درحقیقت وہ اسلام ہی ہے جس نے اِس عقیدے کے ذریعہ نوعِ انسانی کو اعزاز بخشا، اور اس طرح عالمگیر محبت اور انسانی اخوت کے لیے زمین ہموار کر دی ہے، جیسا کہ ہم آگے چل کر بیان کرینگے۔

بالکل صاف ظاہر ہے اور قرآن سے بھی ثابت ہے کہ پیغمبروں کے مرتبے مختلف ہیں۔ عیب کسی میں بھی نہیں ہے، لیکن اُن میں بعض کو بعض پر فضیلت حاصل ہے۔ فضیلت کا سبب یہی ہے کہ جو پیغمبر، بندوں کے لیے زیادہ مفید ہوا اور جسے خدا نے زیادہ خصوصیت بخشی، وہ دوسروں سے بلند تر ہو گیا اور معلوم ہے کہ اِس بارے میں ان کے درجے بہت زیادہ کم و بیش ہیں، چنانچہ خود خدا ارشاد فرماتا ہے:

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ مِنْهُمْ مَنْ	بعض پیغمبروں کو ہم نے بعض پر فضیلت دی ہے۔ بعض سے خدا نے کلام کیا اور بعض کے

كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجَاتٍ، وَآتَيْنَا عِيْسَى بْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنَاتِ وَاَيَّدْنَاهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ (۲:۲۵۳)	درجے بلند کر دیے، اور عیسیٰ بن مریم کو ہم نے نشانیاں دیں اور روح القدس سے اُن کی تائید کی۔

پھر عقلی و نقلی دلائل سے معلوم ہے کہ خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم، جن کے ذریعہ اللہ نے اپنا دین مکمل کیا، اور جنہیں تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا، تمام پیغمبروں سے افضل ہیں۔ اللہ نے انہیں سب سے بلند درجے بخشے ہیں، جیسا کہ ہم اِس آیت کی تفسیر میں اجمالاً بیان کر چکے ہیں اور یہاں اِس بحث میں اُس کی کم از کم تفصیل کی ہے۔

لیکن اِس فضیلت اور مقام بلند کے باوجود آپ کا یہ حال تھا کہ اپنے پیروؤں سے فرماتے تھے "پیغمبروں کو ایک دوسرے پر فضیلت نہ دو" آپ نے یہ اُس وقت فرمایا تھا جب ایک مسلمان اور ایک یہودی میں جھگڑا ہو گیا تھا۔ یہودی نے کہا "قسم اُس خدا کی جس نے موسیٰ کو تمام انسانوں میں سے بزرگی کے لیے چن لیا ہے" مسلمان اِس پر خفا ہو گیا اور یہودی کو طمانچہ مار دیا۔ یہودی نے آکر شکایت کی تو آپ اُس مسلمان پر برہم ہوئے اور یہ لفظ ارشاد کیے۔ پھر آخرت میں موسیٰ علیہ السلام کی خصوصیت بیان کر کے فرمایا "مگر میں نہیں کہتا کہ یونس بن مَتّیٰ سے کوئی زیادہ افضل ہے" یہ حدیث، بخاری اور مسلم نے روایت کی ہے۔

بخاری کی دوسری روایتوں میں ہے کہ فرمایا "پیغمبروں کو اُن کے مابین ترجیح نہ دو"، بعض روایتوں میں ہے کہ "مجھے موسیٰ پر فوقیت نہ دو"، اِس سب سے غرض یہ ہے کہ مسلمان، انبیاء علیہم السلام میں سے کسی کی تنقیص نہ کریں، اُن کے نام پر باہم زیادتی نہ کریں، اور خود اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملے میں غلو و مبالغہ سے کام نہ لیں، ورنہ خود اپنی زبان مبارک سے فرما چکے ہیں "بخدا اگر موسیٰ اِس وقت زندہ ہوتے تو اُن کے لیے بھی اِس کے سوا کچھ جائز نہ ہوتا کہ میری پیروی کریں" (ابو یعلیٰ حدیث جابرؓ)

وہ نشانیاں جن سے خدا نے پیغمبروں کی تائید کی

اِس بحث کے پہلے حصہ میں ہم پیغمبروں کی اُن نشانیوں پر گفتگو کر چکے ہیں جو عیسائیوں کی بول چال میں "عجائب" کہی جاتی ہیں اور ہمارے علماءِ کلام کی اصطلاح میں اُن کا نام "معجزات" ہے، اور خوارقِ عادت کی کئی قسموں میں سے اُنہیں ایک قسم قرار دیتے ہیں۔ یہاں ہم بتانا چاہتے ہیں کہ اِن معجزوں کے بارے میں انسانوں کو جو گمراہی لاحق ہو گئی تھی، اُس کی اسلام نے کہاں تک اصلاح کر دی ہے، اور کس طرح انسانوں کو ایمان کے اُس بلند مرتبہ پر پہنچا دیا ہے جو پختہ عقلی اور نوامیس فطرت کے علم کے شایانِ شان ہے، وہ علم جو انہیں محمد خاتم النبیین علیہ الصلاۃ والسلام کی رسالت کی بدولت ہی حاصل ہوا ہے۔

خدائی نشانیاں، دو قسم کی ہیں

خدا کی نشانیاں دو قسم کی ہیں:

۱۔ ایسی نشانیاں جو تخلیق و تکوین کی سُنّتوں کے مطابق ہیں۔

اِس طرح کی نشانیاں، سب سے زیادہ ہیں۔ سب سے زیادہ روشن ہیں۔ اللہ کے کمال قدرت، ارادے، علم، حکمت، وسیع فضل و رحمت پر سب سے زیادہ گواہی دینے والی ہیں۔

۲۔ ایسی نشانیاں جو انسانوں کے ہاں معلوم الٰہی سُنّتوں کے برخلاف واقع ہوتی ہیں۔ اُن کی تعداد کم ہوتی ہے، اور شاید اکثر لوگ اِنہی کو دیکھکر یقین کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو اپنی موجودہ مخلوقات اور آیندہ مخلوقات میں پورا پورا اختیار حاصل ہے، اور یہ کہ اُس کی قدرت و مشیئت کائناتی قوانین کے ماتحت نہیں ہے جن پر یہ پورا نظام عالم قائم ہے۔ یہ قوانین اِس کے سوا کچھ نہیں کہ اِس کی حکمت اور خلقت میں اُس کے کمال کا لازمی نتیجہ ہیں۔ لیکن کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اُس کی نامعلوم اور اَن گنت حکمتوں میں سے کسی حکمت کی وجہ سے ایسے واقعات پیش آجاتے ہیں جو معلوم و مقرّر قوانین قدرت کے خلاف ہوتے ہیں۔ اگر اس طرح کا معاملہ پیش نہ آجایا کرتا تو یہ عالم گون بھی ویسی ہی ایک مشین کی طرح ہوتا جو نہایت دقیق نظام کے بموجب چلتی ہے اگرچہ خود نہ کوئی علم رکھتی ہے نہ ارادہ،

نہ اختیار، جیسے وہ چھوٹی سی مشین (گھڑی) جس سے شب و روز کے اوقات معلوم کیے جاتے ہیں، اور جیسے جہازوں اور کارخانوں کی بڑی بڑی مشینیں خالق کے منکر، مادّی لوگ اور فلاسفہ بعینہٖ اسی خالق کو اپنی بول چال میں وجود کی علّتِ فاعلہ لکھتے ہیں اور اس نظام کائنات کو "میکانکی" نظریہ بتاتے ہیں۔ پھر وہ ہر اُس بات کو جو معلوم قوانین قدرت کے خلاف پیش آجاتی ہے، طرح طرح کی علّتوں اور سببوں کا نتیجہ بتاتے ہیں اور اس قسم کی غیر معمولی باتوں کا نام "فلتاتِ طبیعتہ" رکھتے ہیں۔ جن باتوں کا اُنہیں سبب نہیں معلوم ہے، اُنہیں اُن باتوں پر قیاس کر لیتے ہیں جن کا سبب معلوم ہو چکا ہے۔ اگرچہ یہ بے دلیل ہی کیوں نہ ہو، اور کہتے ہیں گو آج ہمیں سبب معلوم نہیں ہے، مگر کل ضرور معلوم ہو جائیگا، ہمیں نہیں تو ہماری آیندہ نسلوں پر ضرور ہی ظاہر ہو جائے گا۔

عالمِ غیب و شہادۃ میں اللہ کی سنّتیں

مگر ہم لوگ جو عالم غیب پر اور اُس کے ملائکہ پر ایمان رکھتے ہیں وہ ملائکہ جو خدا کی سب سے بڑی فوج ہیں اور جو خدا کے حکم سے عالم شہادۃ میں موثّر ہوتے اور اُسے چلاتے ہیں، تو ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ اُس عالمِ غیب کے نظام میں خدا کی سنّتیں، اُن سنّتوں سے الگ ہیں جو اِس مادّی عالم سے خاص ہیں، اور یہ کہ انسان وہ درمیانی کڑی ہے جو دونوں عالموں

کو جوڑتی ہے۔ چنانچہ اُس کا جسم اور اُس کے ضروری فرائض، عالم شہادت سے تعلق رکھتے ہیں۔ مگر اُس کی روح، عالم غیب سے تعلق رکھتی ہے۔ اور یہ کہ انسان جب تک اپنے مادّی جسم میں ہے۔ اُس کے تمام حواس مادّے ہی سے گھرے رہتے اور مادّی قوانین کے تابع ہوتے ہیں، اُس کی تمام شخصی اور جنسی ضرورتیں بھی مادّی ہی ہوتی ہیں جو اُسے غیب کے روحانی عالم سے محجوب رکھتی ہیں، حتیٰ کہ خود اُس کی اپنی روح سے بھی جو اُس کی حقیقت کی تکمیل کرنے والی ہے۔ لیکن ہاں جسم پر روح کو غلبہ و اقتدار، آخرت کی زندگی میں حاصل ہوگا۔ مگر اُن لوگوں پر مادّیت کا یہ غلبہ نہیں ہوتا جنہیں خدا اپنی پیام بری کے لیے چُن لیتا ہے اور اپنے فضل و رحمت سے اُن میں یہ صلاحیت پیدا کر دیتا ہے کہ اُس کے فرشتوں سے لگاؤ رکھ سکیں اور اُن سے علم حاصل کر سکیں، نیز خدا اپنے چُنے ہوئے بندوں پر اپنے غیب میں سے جتنا چاہتا ہے، ظاہر کر دیتا ہے تاکہ اُس کے حکم کے مطابق بندوں کو تبلیغ کریں۔

غیب کی قسمیں

غیب وہ ہے جس کا علم، آدمیوں سے غائب ہے، اور اُس کی دو قسمیں ہیں: حقیقی غیب جسے خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اضافی یا نسبتی غیب جو فطری و کسبی استعداد کی بنا پر مختلف اسباب سے بعض

لوگوں سے اوجھل ہوتا ہے اور بعض کو معلوم ہوتا ہے۔ خدا نے اپنے پیغمبروں پر جتنا غیب ظاہر کیا، اُس میں اُن کے کسب و اختیار کو دخل نہ تھا۔ یہ چیز بھی خصوصیاتِ نبوت میں سے ہے جو کسب و کوشش سے حاصل نہیں کی جا سکتیں(۱)۔

پیغمبروں کے بعد اُن کے وہ خاص پیرو ہیں جن کی آنکھوں پر سے بعض پردے اٹھا دیے جاتے ہیں اور وہ اُس عالمِ غیب کو کسی قدر دیکھ لیتے ہیں۔ وہ اُن انوار میں سے کوئی کوئی نور مشاہدہ کر لیتے ہیں جن پر اپنے پیغمبروں کی وجہ سے اُن کا ایمان، دلیل و عقل والوں سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ چنانچہ امیر المومنین علی کرّم اللہ وجہہ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا "اگر پردہ اُٹھ جائے تو بھی میرے یقین میں کچھ اضافہ نہ ہو"۔

اِن لوگوں کے بعد وہ لوگ ہیں جو فطرتِ سلیم کی وجہ سے یا قسم قسم کی ریاضتوں کے ذریعہ نفس کے علاج سے، یا اِس لیے کہ اُنہیں کوئی بیماری لاحق ہو جاتی ہے جو نفسی قویٰ کو جسم کی خواہشوں کے اہتمام سے بے پروا کر دیتی ہے، یا کوئی زبردست قوتِ ارادہ، کمزور قوتِ ارادہ کو قبضہ میں کر لیتی ہے، اور اُسے احساس سے الگ کر کے اپنی خواہش

---

(۱) اس موضوع کی مفصل تحقیق کے لیے تفسیر کی ساتویں جلد کے صفحہ ۴۲۱ و ۴۶۶ و ۴۶۹ دیکھو، اور اس کا خلاصہ تفسیر کی نویں جلد صفحہ ۵۱۴ میں موجود ہے۔

کے بموجب دوسری طرف لگا دیتی ہے۔ غرضکہ مختلف اسباب کی بنا پر بعض حالات میں اُن لوگوں کو ایسی روحانی قوت حاصل ہو جاتی ہے جس سے وہ دُور کے بعض اشخاص اور دُور کی بعض چیزوں کا ادراک کر لیتے ہیں، اور اُن کی نگاہ کے سامنے بعض واقعات، پیش آنے سے پہلے ہی آجاتے ہیں۔ وہ اُن کی خبر دیتے ہیں اور اُن کے بیان کے بموجب وہ واقع ہو جاتے ہیں۔

حقیقی اور ظاہری خوارق عادات

ایسے واقعات جو بظاہر معلوم قوانین قدرت سے باہر پیش آتے ہیں، یا جانی بوجھی عادتوں کے خلاف واقع ہوتے ہیں، بحیثیت مجموعی تمام زمانوں میں تمام قوموں سے تُواتُر کے ساتھ نقل و روایت ہوتے چلے آئے ہیں۔ یہ تمام واقعات، حقیقی خوارق عادت نہیں ہوتے۔ کیونکہ اُن میں بعض ایسے ہوتے ہیں جن کے اسباب عام لوگوں کو معلوم نہیں ہوتے۔ بعض کا تعلق ہنر سے ہوتا ہے جو سیکھا اور سکھایا جاتا ہے۔ بعض نفسی قوتوں کے زیر اثر پیش آتے ہیں یا قوی ارادے والے کمزور ارادے والوں پر اپنا اثر ڈال دیتے ہیں۔ انہی دونوں صورتوں میں بعض معاملات سے متعلق مکاشفہ ہے، مسمریزم ہے، اور بعض بیماروں کو اچھا کر دینا ہے، خصوصًا ایسے بیماروں کو جو اعتقاد و وہم پر اثر ڈالنے والی عصبی بیماریوں

میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ انہی بیماریوں میں نابینائی اور فالج کی بعض قسمیں ہیں، چنانچہ بعض لوگ صرف اِس وجہ سے اندھے ہو جاتے ہیں کہ اُن کی آنکھوں کے اعصاب بیمار ہو جاتے ہیں، گو فی نفسہ آنکھیں اچھی ہوتی ہیں۔ یا آنکھ کی پُتلی پر سفیدی عارضی طور پر چھا جاتی ہے اگرچہ خود پُتلی اپنی جگہ ٹھیک ہوتی ہے۔ لیکن اِس قسم میں وہ اندھے داخل نہیں ہیں جن کی آنکھیں بہ جاتی ہیں، جیسے وہ اندھا جسے حضرت مسیح علیہ السلام نے اللہ کے حکم سے اچھا کر دیا تھا۔

ہم نے خوارق عادت کی ظاہری صورتیں، سورۂ اعراف کی تفسیر میں سحر پر بحث کرتے ہوئے بیان کر دی ہیں۔ اور اُن مضامین میں بھی پوری تفصیل موجود ہے جو "المنار" کی جلد دوم اور جلد ششم میں کرامات، اُس کی قسموں، اور اُس کے اسباب کی بحث میں پیش کی ہے۔

ہر قوم کے وہ عوام جو تاریخ اقوام سے ناواقف ہیں اور جنہیں نہیں معلوم کہ اِس قسم کے عجیب واقعات تمام قوموں میں پیش آ چکے ہیں اور آتے رہتے ہیں، اور یہ کہ اِس سلسلہ میں علماء نے کیا کیا شعبدے دریافت کیے ہیں، تو ایسے ناواقف لوگ اِس قسم کے واقعات اپنے ہاں دیکھ کر نازسے پھول جاتے اور سمجھ لیتے ہیں کہ اُن کے سوا کسی اور قوم میں یہ باتیں موجود ہی نہیں ہیں۔ نیز اُن تمام دجّالوں اور شعبدہ بازوں کے سامنے

جھک جایا کرتے تھے جن کے ہاتھوں اِس طرح کی کوئی بات پیش آجاتی ہے۔ اِس کے بعد اُنہیں موقعہ دیدیتے ہیں کہ اُن کا مال جس طرح چاہیں لوٹیں، اُن کی آبرو جس طرح چاہیں خراب کریں، خصوصًا جب کہ اِس قسم کی چیزوں کو ولیوں کی کرامات کے طور پر قبول کر لیتے ہیں۔ لیکن جن قوموں میں تاریخ کی تعلیم عام ہوجاتی ہے اور اُن کے افراد کو اِس قسم کے واقعات کی حقیقت معلوم ہوجاتی ہے، تو وہ نہ اُن پر زیادہ یقین کرتے ہیں نہ شعبدہ بازوں کے دھوکے میں زیادہ پھنستے ہیں۔ لیکن یہ چیز آج بھی یورپ اور امریکا کے تمام ملکوں میں بہت عام ہے، اگرچہ مشرقی ملکوں خصوصًا دیہاتیوں اور وحشی زنگیوں وغیرہم سے کم ہے۔

لیکن اللہ کی حقیقی نشانیاں جنہیں ہم معجزے کہتے ہیں، اِس قسم کے شعبدوں اور سیکھے سکھلائے کاموں سے کہیں بلند و بالا ہیں اور اُن میں کسی انسان کے بھی کسب یا کوشش کو دخل نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ خدا نے اپنے پیغمبروں کی تائید جن نشانیوں سے کی، اُن میں اُن کے کسب، عمل اور اثر کا کوئی دخل نہ تھا، حتیٰ کہ اُن نشانیوں میں بھی نہیں جو خدا کے حکم کے بموجب خود اُن کی ارادی حرکت سے پیش آتی تھیں۔ کیا تم نے نہیں پڑھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کس طرح ڈر گیے تھے جب اُن کی لاٹھی، زندہ سانپ بن گئی تھی، چنانچہ بھاگ نکلے اور جب تک

خدا نے اُن کے دل سے ڈر دور نہیں کر دیا، واپس نہ ہو سکے؟ کیا تم نے قرآن میں نہیں دیکھا کہ خدا نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا ہے:
"وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی" (اے پیغمبر، تو نے تیر نہیں چلایا بلکہ خدا نے چلایا) اور کیا تم نے غور نہیں کیا کہ خدا نے آپ کو اُن لوگوں کے مقابلہ میں کیا جواب دینے کا حکم دیا ہے جو آپ سے نشانیوں کا مطالبہ کرتے تھے۔ چنانچہ فرمایا:

قُلْ سُبْحَانَ رَبِّیْ هَلْ کُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا
اے پیغمبر کہہ دیجئے کہ پاک ہے میرا پروردگار میں اس کے سوا کیا ہوں کہ انسان پیام بر ہوں۔

اور فرمایا:

قُلْ اِنَّمَا الْاٰیَاتُ عِنْدَ اللّٰہِ وغیرہ وغیرہ آیات۔
کہہ دیجیے کہ نشانیاں تو اللہ ہی کے پاس ہیں۔

عقائد اسلام کی اس محکم اصل سے جہل کی وجہ سے قبروں وغیرہ کے پجاری مدعیان علم، اس دھوکے میں پڑ گیے کہ معجزے اور کرامتیں بھی دوسرے ہنروں کی طرح کسبی چیزیں ہیں، اور یہ کہ انبیاء وصالحین جیتے جی اور مرے پیچھے جب چاہیں اُنہیں دکھا سکتے ہیں، چنانچہ اسی وہم کی بنا پر جہلاء، کو ور غلا کر بزرگوں کی قبروں پر دعا و مدد حاصل کرنے کے لیے

بلاتے ہیں۔ جب لوگوں پر کوئی مصیبت پڑتی ہے اور وہ اُسے اپنے ہنر اور کسبی طریقوں سے دور نہیں کر سکتے تو یہ قبر پرست اُنہیں قبروں پر جانے اور اُسی طرح منتیں ماننے اور نیازیں کرنے کی دعوت دیتے ہیں جس طرح مشرک اپنے بتوں کی منتیں مانا کرتے اور بھینٹیں چڑھایا کرتے ہیں۔

درحقیقت یہ لوگ خدا کے بندوں کو گمراہ کر کے حرام کی کمائی کھاتے ہیں۔ یہ اُن سے کہتے ہیں کہ خود دین الہی کا بھی حکم یہی ہے کہ اِن مرحوم بزرگوں کو اپنا حاجت روا یقین کریں، بلکہ اُن میں سے بعضوں نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ یہ بزرگ اپنی قبروں سے اپنے جسموں کے ساتھ نکل آتے ہیں اور حاجتمندوں کی حاجتیں پوری کر دیتے ہیں۔ حالانکہ اگر واقعہ یہی ہوتا تو پھر یہ خارق عادت بھی نہ ہوتا۔ بعضوں نے چھپی ہوئی کتابوں میں یہ لکھ کر اور بھی ستم ڈھایا ہے کہ فلاں قطب زندہ کرتا اور موت دیتا ہے۔ غریب کرتا اور امیر بناتا ہے۔ خوش قسمتی بخشتا اور بدبختی نازل کر دیتا ہے۔

معجزے اور کرامت میں فرق

خدا نے اپنے پیغمبروں کو معجزے صرف اِس لیے دیے تھے کہ اُن کی قوموں پر حجت ہوں۔ ہدایت قبول کرنے کی جن لوگوں میں

صلاحیت ہو، معجزے دیکھکر ہدایت قبول کریں، اور جو انہیں دیکھ لینے کے بعد بھی جان بوجھ کر سرکشی کریں، اُن پر عذاب نازل ہو جائے۔ عذاب اُسی وقت نازل ہوتا تھا جب حجت پوری ہو جاتی تھی، اور حجت انہی معجزوں کے ذریعہ پوری ہوا کرتی تھی، لہذا اُن کا ظاہر ہونا تبلیغ دعوت کی تکمیل کے لیے ضروری تھا جس کے لیے وہ بھیجے گئے تھے۔ انبیاء علیہم السلام کا دستور تھا کہ اپنی رسالت کی حجت کے سوا اور کسی خارق کے لیے خدا سے دعا نہ کرتے تھے، اِلّا یہ کہ قحط سالی میں باران رحمت یا ایسی ہی کوئی ضرورت پیش آجائے۔ خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے حضور سب پیغمبروں سے زیادہ عزیز تھے، لیکن اس کے باوجود آپ اور آپ کے اصحاب و اہل بیت، بیماریوں اور فقر و فاقہ کی مصیبتوں میں مبتلا ہوا کرتے تھے مگر اُن کے دفعیہ کے لیے آپ شاذ و نادر ہی خدا سے دعا کرتے تھے۔ ایک مرگی زدہ عورت نے دعا کی درخواست کی تو فرمایا کہ مصیبت پر صبر کرنا تیرے لیے زیادہ بہتر ہے۔ اُس نے عرض کیا، جب دورہ ہوتا ہے تو میں برہنہ ہو جایا کرتی ہوں۔ دعا کیجیے کہ برہنہ نہ ہوا کروں۔ آپ نے دعا فرمائی اور خدا نے قبول کرلی۔

کرامت کے معاملہ میں اصل یہ ہے کہ وہ پوشیدہ رہے، کیونکہ اُس کے ظاہر ہو جانے سے لوگ اکثر فتنے میں پڑ جاتے ہیں۔ اہل کرامات

اپنی کرامتوں کو کسی مجبوری ہی سے ظاہر ہونے دیتے ہیں۔ علما اور صوفیہ نے یہی کہا ہے اور عوام کے خیال کے خلاف اسی پر اُن کا اتفاق ہو چکا ہے۔

تاج سبکی نے "مقاماتِ شافعیہ" میں کرامات کے منکروں کی دلیلیں بیان کرتے ہوئے کہا ہے:

"منکر کہتے ہیں کہ اگر کرامت بھی کوئی چیز ہوتی تو معجزے سے مشابہ ہو جاتی، اور اس کے بعد معجزہ، نبوت کی دلیل نہ رہتا۔ جواب یہ ہے کہ معجزہ، نبوت کے دعوے کے ساتھ پیش آیا کرتا ہے، برخلاف اس کے کرامت، ولی کی طرف سے نبی کی پیروی میں کمال کا نتیجہ ہوا کرتی ہے۔ پھر معجزے کے لیے ضروری ہے کہ اُس کا اظہار و اعلان ہو، لیکن کرامت ہمیشہ پوشیدہ ہوتی ہے اور شاذونادر یا کسی خاص مجبوری ہی سے ظاہر کی جاتی ہے۔ نیز معجزے کے معاملے میں جائز ہے کہ تمام خوارق عادت باتوں کے ساتھ پیش آئے، مگر کرامت میں بعض خارق عادت باتیں ہی پیش آتی ہیں"

محقق صوفیوں کا فیصلہ ہے کہ کرامتیں نہ لگاتار ظاہر ہوتی ہیں نہ اُنہیں شہرت ہی دی جاتی ہے۔ شیخ محی الدین بن عربی کہتے ہیں کہ جو بات بار بار پیش آئے، کرامت نہیں ہے، کیونکہ وہ معمولی اور عادی چیز بن جاتی ہے۔ کرامت وہی ہے جو خوارق عادت میں سے ہو۔ شیخ احمد

رفاعی کہتے ہیں کہ اولیاء اللہ اپنی کراموں کو اُسی طرح چھپاتے ہیں جس طرح عورت اپنے ایّام کو چھپاتی ہے۔

کہاں یہ اقوال اور کہاں قبوری دجّالوں کا یہ دعویٰ کہ ایک ہی کرامت، زندہ اور مردہ بہت سے ولیوں کو بار بار ملتی ہے اور بار بار ظاہر ہوا کرتی ہے، اِس طرح ظاہر ہوتی ہے کہ ہر کس و ناکس اُسے جاننے لگتا ہے، بلکہ وہ ایک ایسا ہنر بن جاتی ہے جو دودھاری گائے کی طرح دولت و ثروت بھی اپنے ساتھ لے آتا ہے!

آیاتِ الٰہی کے منکر

آیات الٰہی کے منکر دو قسم کے ہیں: ایک وہ جو تمام نشانیوں کا انکار کرتے اور کسی کو بھی نہیں مانتے۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جو اِن نشانیوں میں خدا کے سوا غیر اللہ کو بھی شریک کر دیتے ہیں۔ یہ لوگ غیر اللہ میں وہ قوتیں تسلیم کرتے ہیں جو صرف خدا ہی میں ہیں اور کہتے ہیں کہ غیر اللہ سے دعا کرنی چاہیے۔ منّت ماننی چاہیے، کیونکہ اُن کے زعم میں خدا نے اِن کے ٹھہرائے ہوئے معبودوں کو اُن کی بزرگی، محبت، اور مرتبہ کی وجہ سے اِس قسم کی غیبی قوتیں بخش دی ہیں۔ اُن کے اِس دعوے کے معنیٰ یہ ہوئے کہ خود خدا نے اِن بزرگوں کو یہ اختیار دیکر اپنا شریک بنا لیا ہے۔ یہ لوگ، عبادت، شرک، تخلیق وغیرہ الفاظ بولنے سے تو

احتیاط کرتے ہیں، مگر ان الفاظ کے معانی ہی اُن کے پیشِ نظر ہوتے ہیں۔ اِس طرح یہ لوگ اللہ پر اور بزرگوں پر وہ جھوٹ بولتے ہیں جس کی تکذیب و تردید اللہ کی اتاری ہوئی کتاب، اور اللہ کے بھیجے ہوئے نبیؐ کی طرف سے صاف صاف ہو رہی ہے۔ یہ لوگ کتاب اللہ کی آیتوں کی تحریف کرتے اور اُن سے اپنے جہل کا ثبوت پیش کرتے رہتے ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں کہ خدا نے مریم علیہا السلام کو بغیر حساب کے رزق دیا تھا، حالانکہ اِس رزق میں خود مریم کے کسی فعل کو دخل نہ تھا، اور کوئی نہیں جانتا کہ یہ رزق اُن کے پاس کیسے پہنچ جاتا تھا۔ بعض روایتوں میں آیا ہے کہ یہ رزق مریم کو اِس طرح پہنچتا تھا کہ خدا نے اُس کے پہنچانے کے لیے بعض لوگوں کو مسخّر کر دیا تھا۔ اِسی طرح اِن لوگوں کا حضرت موسیٰ کی والدہ کی وحی سے استدلال بھی بے بنیاد ہے، کیونکہ اِس وحی میں خود اِس خاتون کو کوئی دخل نہ تھا، کہا گیا ہے کہ وہ بھی پیغمبر تھیں۔

یہ خرافاتی لوگ، انسانوں کے لیے اُن کے دین اور دنیا، دونوں میں اُس سے کہیں زیادہ فساد پیدا کرتے ہیں جتنا اُن لوگوں سے پیدا ہوتا ہے جو سراسر اللہ کی نشانیوں کے منکر ہیں، بلکہ اِن لوگوں کے اِس انکار کا بھی سب سے بڑا سبب اول الذکر لوگ ہی ہیں، کیونکہ اِن کا دعویٰ ہے کہ پیغمبر اور اُن کے بعد بزرگ، کائنات میں ایسا تصرّف کیا کرتے ہیں

جو قوانین قدرت کے خلاف ہے یا اُنہیں بدل ڈالنے والا ہے یا انہیں اُن کی منشا سے ہٹا ڈالنے والا ہے۔ اِسی قدر نہیں بلکہ مزید ستم یہ ڈھاتے ہیں کہ اپنے اسی باطل اعتقاد کو اللہ کا حکم اور اُس کے دین کی بنیاد بتاتے ہیں۔ اِس طرح یہ لوگ دین کی بنیاد ہی کی تکذیب کر رہے ہیں، اور اس طرح اُن کے نفتنے میں منکرین آیاتِ الہی کے دونوں گردہوں کی گمراہیاں جمع ہو گئی ہیں، اُن کی بھی جو سراسر آیات کے منکر ہیں اور اُن کی بھی جو اُن میں ماسوا اللہ کو شریک کر دیتے ہیں۔ مزید برآں اُن کا یہ قول، اللہ کی جناب میں بغیر علم کے گفتگو ہے، اُس ذات حق پر جھوٹ باندھنا ہے، کیونکہ جس چیز کو اُس نے دین نہیں قرار دیا اُسے یہ لوگ اُس کا دین بتاتے ہیں، اور معلوم ہے کہ یہ حرکت، سب سے زیادہ سخت کفر ہے، کیونکہ اِس سے باطل اعتقاد پیدا ہوتا اور غیر مشروع باطل عبادت قائم ہوتی ہے۔ (اس مسئلہ کی تحقیق کے لیے تفسیر جلد ۹ صفحہ ۳۹۷ - ۴۰۱ دیکھو)

اِس خرافات کا علاج

جو لوگ اللہ کی نشانیوں سے جہل کی وجہ سے عبادت الہی میں شرک کرتے اور خرافات میں اپنے ہی جیسے جاہلوں کی تقلید کرتے ہیں، اُن کا علاج یہ ہے کہ اُنہیں علم کلام کے نظریوں سے دور رکھکر صرف قرآن مجید سے توحیدِ ربوبیت والوہیت کی تعلیم دی جائے۔

بتایا جائے کہ پیغمبروں کے فرائض کیا تھے، اور یہ کہ وہ بھی آدمی ہی تھے، مگر خدا نے اپنی وحی سے انہیں خصوصیت بخشی، تاکہ اس کے بندوں کو یہ پیغام پہنچائیں کہ اس مالک نے ان کے لیے کون دین پسند فرمایا ہے اور ان سے کس طرح کا قول و فعل چاہتا ہے، اور یہ کہ پیغمبروں کا فرض یہی تھا کہ تعلیم دیں، رہنمائی کریں، بشارت سنائیں، خوف خدا کی تلقین کریں، اس کی شریعت کے احکام، انصاف و مساوات کے ساتھ جاری کریں، اور یہ کہ خدا نے پیغمبروں کو کائنات میں تصرف کرنے کی کوئی ذاتی قوت نہیں بخشی تھی کہ جو چاہیں کر ڈالیں، یا اپنے قریبی رشتہ داروں کو اپنے اختیار سے ہدایت کی راہ پر لے آئیں، حتیٰ کہ اپنے باپ، بیٹے، بیوی تک کو ہدایت بخش دینے کی قدرت نہیں رکھتے تھے، چنانچہ ابراہیم خلیل اللہ کا باپ، کافر ہی جیا، کافر ہی مرا، اللہ کا بھی دشمن تھا۔ اللہ کے رسول و خلیل کا بھی دشمن۔ سب سے پہلے رسول، نوح علیہ السلام کا بیٹا، کافر مرا، حتیٰ کہ خدا نے یہ اجازت بھی نہ دی کہ کشتی پر سوار کر لیا جائے چنانچہ ڈوبنے والے کافروں کے ساتھ ڈوب گیا۔ ابو لہب، اللہ کے رسول و حبیب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا چچا تھا مگر آپ کا سب سے بڑا دشمن تھا۔ سب سے زیادہ تکلیف پہنچاتا تھا۔ چنانچہ خدا نے اس کی مذمت اور وعید میں قرآن کی ایک سورۃ نازل کی ہے جسے مومن، قیامت تک

بطور عبادت تلاوت کرتے رہیں گے، اور جیسی سورۃ کسی اور دشمنِ خدا یا رسول کے حق میں نازل نہیں ہوئی۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی کمالِ حکمت کو دیکھو کہ آپ کے دوسرے چچا (ابو طالب) جو آپ کے کفیل تھے اور جنہوں نے مشرکوں کے مقابلہ میں آپ کی حمایت کی، وہ بھی آپ پر ایمان نہ لائے آپ نے اُن سے یہاں تک کہا کہ صرف کلمۂ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کہہ دیں تاکہ قیامت کے دن اُن کے حق میں شہادت دی جا سکے، مگر انہوں نے یہ بھی منظور نہ کیا۔ اُنہی کے بارے میں خدا فرماتا ہے، جیسا کہ مسلم نے روایت کیا ہے:

اِنَّكَ لَا تَهْدِىْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ	جسے تم محبوب رکھتے ہو اُسے ہدایت نہیں دو گے، لیکن اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت بخش دیتا ہے۔

اِس مسئلہ کی تفصیل ہم نے آیت "واذ قال ابراھیم لابیہ آذر" کی تفسیر میں بیان کر دی ہے۔ اِسی سورۂ انعام کے خلاصہ میں ہم نے انبیاء علیہم السلام کے فرائض بیان کر دیے ہیں اور یہ بحث قابل دید ہے (تفسیر جلد ۸ صفحہ ۵۷۲ - ۵۷۸) پس جب کہ انبیاء کو بھی کائنات میں تصرّف کی قدرت نہیں دی گئی، تو اولیاء وغیرہم کو کیونکر مل سکتی ہے؟

معجزات اور کسبی خوارق

جو لوگ معجزوں کے منکر ہیں، اُن پر قرآن ہی سے حجت قائم ہوسکتی ہے، کیونکہ یہود ونصاریٰ، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ وغیرہما پیغمبروں کے جن معجزوں کا حال بیان کرتے ہیں، اُن پر یہ لوگ یقین نہیں کرتے بلکہ اِن کی روایتوں کو بھی اُسی طرح کے افسانے خیال کرتے ہیں جیسے ہر زمانہ کے عوام الناس اپنے بزرگوں کی نسبت مشہور کر دیا کرتے ہیں اور جن کی بنیاد سراسر وہم اور دھوکے پر ہوتی ہے۔ اپنے اِس خیال کی دلیل میں وہ کہتے ہیں کہ یوسیفوس مؤرخ، حضرت عیسیٰ کا معاصر تھا، لیکن اُس نے آپ کے اُن معجزوں میں سے کسی ایک کا بھی ذکر نہیں کیا جنہیں انجیلیں بیان کرتی ہیں، حالانکہ یہ انجیلیں مسیح علیہ السلام کے بہت بعد لکھی گئی ہیں۔ اور اگر روائتیں صحیح ثابت ہو جائیں تو بھی یہ لوگ معجزوں کی ویسی ہی تعلیل کرتے ہیں جیسی اُن ظاہری خوارق کی جو ہر زمانہ میں دکھائی دیتے ہیں۔ اور اگر اُن کا کوئی سبب سمجھ میں نہیں آتا، تو کہہ دیتے ہیں کہ ضرور اِن کا بھی کوئی کسبی سبب ہوگا جو آج نہیں تو کل معلوم ہو جائے گا یا اِس سبب کا اقرار خود وہ شخص کرلے گا جس کے ہاتھوں یہ خوارق پیش آئے ہیں، جیسا کہ ہندو فقیروں کے معاملہ میں پیش آچکا ہے جو ہوا میں اڑتے تھے اور جن کے عجائبات، معجزوں سے بھی زیادہ حیرت انگیز

تھے۔

ایک مصری اخبار نے اِن دنوں ہندوستان کے ایک یورپین سیّاح کے حالات شایع کیے ہیں۔ اِس سیّاح نے ایک ہندو فقیر، سرجُوہر دیاس کا واقعہ لکھا ہے جو ۱۸۳۷ء میں پیش آیا تھا۔

تفصیل یہ ہے کہ یہ ہندو فقیر، پنجاب کے پادشاہ، مہاراجہ رنجیت سنگھ کے محل میں حاضر ہوا اور مہاراجہ سے کہنے لگا کہ میں اپنی بعض کرامتیں دکھانا چاہتا ہوں۔ مہاراجہ فقیروں کا قائل نہ تھا۔ اُس نے پوچھا تو کیا کرامت دکھانا چاہتا ہے؟ فقیر نے کہا، مجھے چالیس دن تک دفن کر دیجیے اس کے بعد بھی میں زندہ رہوں گا!

مہاراجہ نے یہ کرامت دیکھنی منظور کر لی۔ چنانچہ انگریز اور فرانسیسی ڈاکٹروں کو، نیز پنجاب کے بہت سے معززوں کو جمع کیا۔ فقیر سب کے سامنے اکڑوں بیٹھ گیا۔ اُس کے کہنے کے بموجب روئی اور موم اُس کی ناک اور کانوں میں بھر دیا گیا۔ پھر اُسے کفنایا گیا۔ کفن ہر طرف سے سی کر فقیر کو ایک مضبوط چوبی صندوق میں بٹھا دیا گیا۔ پھر صندوق کو ہر طرف سے آہنی کیلوں سے جڑ دیا گیا۔ خود مہاراجہ نے اپنے ہاتھ سے اپنی مُہر، صندوق پر لگا دی۔ اس کے بعد صندوق کو باغ کے ایک تہ خانہ کی کوٹھری میں رکھکر دروازہ مقفّل کر دیا گیا اور مہاراجہ کی مُہر، قفل پر لگا دی گئی۔ پھر مہاراجہ نے اپنے

دو معتمد علیہ سپاہیوں کو حکم دیا کہ شب و روز دروازے کی نگرانی کرتے رہیں۔ اِسی قدر نہیں بلکہ اور بہت سی فوج بھی حفاظت کے لیے مقرر کر دی گئی۔ یہ تمام کارروائی خود مہاراجہ اور بہت سے انگریز اور فرانسیسی ڈاکٹروں اور پنجابی معززوں کی موجودگی میں پیش آئی تھی۔

چالیس دن کے بعد یہ سب لوگ پھر مہاراجہ کے محل میں جمع ہوئے دیکھا کہ مُہر ٹھیک ہے۔ تہ خانے کے سامنے کی گھانس پر کسی انسان کے نشان بھی دکھائی نہیں دیتے ہیں۔ پھر تہ خانے کی کوٹھری کھولی گئی صندوق پر بھی مُہریں بدستور تھیں۔ پھر صندوق کھولا گیا اور فقیر کو اندر سے نکالا گیا تو ایک شاہد عینی انگریز کے بیان کے بموجب اُس کی حالت حسب ذیل تھی:

"فقیر کو جب باہر نکالا گیا تو میں نے اُس کے دونوں ہاتھ اور پیر اکڑے ہوئے پائے۔ سر ایک طرف جھکا ہوا تھا۔ میں سمجھا کہ یہ مردہ لاش ہے اور مدت ہوئی کہ زندگی اس سے رخصت ہو چکی ہے۔ میں نے اپنے ڈاکٹر کو حکم دیا کہ اُس کا معائنہ کرے۔ ڈاکٹر نے اُس کے بازوؤں، کنپٹیوں، اور دل کا معائنہ کیا اور کہنے لگا کہ نبض کی حرکت کا کہیں پتہ نہیں، لیکن دماغ کے دائرے میں کچھ حرارت کا شبہ [illegible] ہے۔

"پھر سادھو کی ہدایت کے موجب [illegible] کا جسم گرم پانی سے دھویا

گیا اور جوڑ بتدریج نرم پڑنے لگے۔ روئی اور موم کو کانوں اور ناک پر سے ہٹا دیا گیا۔ سر پر گرم پانی کے پھائے چڑھا دیے گیے، اور کیا دیکھتے ہیں کہ مردہ لاش میں زندگی دوڑنا شروع ہو گئی! رگ پٹھے اور اعضاء سکڑ گیے، پھر اُن میں کپکپی سی پڑ گئی۔ پھر پسینہ چھوٹنے لگا، اور اعضاء اپنی پہلی حالت پر آ گیے۔ چند منٹ بعد آنکھیں بھی کھل گئیں اور اصلی رنگ اُن پر دوڑ گیا۔ اب سادھو زندہ ہو چکا تھا۔ اُس نے دیکھا کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ اُسے بڑی حیرت سے دیکھ رہے ہیں تو کہنے لگا "میرے مالک، آپ نے دیکھا کہ میں سچ کہتا تھا یا جھوٹ!" آدھ گھنٹہ بعد سادھو، تابوت کے اندر سے نکل آیا اور حاضرین سے میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگا!"

یہ واقعہ بھی اللہ کی ایک نشانی ہے جو کسبی ریاضت سے ظاہر ہوئی ہے۔ سادھو کا یہ واقعہ، انجیل کے اُس واقعہ سے زیادہ عجیب ہے جس میں لیعازر کا مرنا پھر چار دن بعد مسیح کی دعا سے اُس کا زندہ ہو جانا بتایا گیا ہے، جیسا کہ پچھلے صفحوں میں ہم بیان کر آئے ہیں۔ بلکہ سادھو کا یہ واقعہ بعض وجوہ سے خود اصحابِ کہف کے واقعہ سے بھی زیادہ عجیب ہے۔ کیونکہ ہندوستانی سادھو کی ناک بھی بند کر دی گئی تھی جس کے بعد عادتاً کوئی زندہ نہیں رہ سکتا۔ برخلاف اس کے اصحابِ کہف، ایک کشادہ غار میں سو گیے تھے، جس کا منھ، ہوا کے رخ، شمال کی طرف تھا، پھر دھوپ

بھی غار کے منھ پر صبح شام پڑتی اور ہوا کو سونے والوں کے لیے لطیف بنا جاتی تھی۔ اصحاب کہف کے معاملے میں جو کچھ عجیب بات ہے، وہ اُن کی طویل نیند میں ہے۔ یہ نیند بہت ہی دراز تھی جیسا کہ قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے۔ اِس بارے میں بیضاوی وغیرہ مفسرین نے قیل وقال کی ہے، لیکن اللہ کی نشانیوں کے راز کوئی جان نہیں سکتا۔ موجودہ زمانہ میں بھی بعض لوگوں کی نسبت بیان کیا گیا ہے کہ مرضِ خواب میں مبتلا ہو کر مہینوں پڑے سوتے رہے۔

لیکن ہندوستانی سادھو کا معاملہ، زندگی کے عام قوانین کے خلاف ہے۔ اور اگر ثابت ہو جائے کہ یہ واقعہ اِن سادھوؤں کے کسی ایسے کسبی طریقہ، ریاضت سے پیش آیا ہے جو زندگی کو، اِتنی طویل مدت تک ایسے مخالف حالات میں بھی باقی رکھ سکتا ہے، جبکہ دورۂ خون اور تنفس ممکن نہیں، تو ایسی صورت میں کسی عقلمند کے لیے روا نہیں رہتا کہ عام قوانین قدرت کے خلاف پیش آنے والے ہر واقعہ کا انکار بطور قاعدۂ کلیّہ کے قرار دے لے، کیونکہ اللہ عزّ وجلّ ہی نے یہ قوانین بھی بنائے ہیں۔ وہی اپنی قدرت سے ہر چیز کا خالق ہے، اُسی نے اپنی مشیئت سے اسباب مقرر کیے ہیں۔ خوارقِ عادت کے اکثر منکر، خدا پر ایمان رکھتے ہیں، مگر اس کی سنّتوں کے مخالف کسی چیز کا وقوع تسلیم نہیں کرتے، کیونکہ

اُن کے خیال میں ایسا ہونا، اُس کی حکمت کے منافی ہے۔ لیکن اُس علیم وحکیم کی سنّتوں اور حکمتوں کا کون احاطہ کر سکتا ہے؟ ہاں عقل کا یہ تقاضا ضرور ہے کہ عام اسباب کی جو دائمی و سرمدی سنّتیں معلوم چلی آتی ہیں اُن کے خلاف کسی بات کے پیش آنے کا اُس وقت تک یقین نہ کرتے جب تک اُس کا کوئی ایسا قطعی ثبوت نہ مل جائے جس کی تاویل نہیں ہو سکتی۔ مُسلّم محققین، علماء مادّیات، اور علماء نفسیات وغیرہم کا معتمد علیہ مسلک یہی ہے۔ موجودہ زمانہ میں الیکٹرک (بجلی) وغیرہ کے ایسے عجائبات ظہور میں آئے ہیں کہ اگر پچھلے زمانہ کے علماء و حکماء سے اُن کا ممکن ہونا کہا جاتا، تو ایسے آدمی کو ضرور مجنون یقین کرتے۔

کسبی اور حقیقی خوارق میں فرق

غرضکہ اِس کائنات کے رازوں کا احاطہ، خالق سبحانہ وتعالیٰ کے سوا کوئی نہیں کر سکتا۔ ہر زمانہ میں ایسے عجیب واقعات پیش آتے رہے ہیں جو الٰہی رازوں میں شمار ہو سکتے ہیں، وہ راز جو مخلوق میں قوانین الٰہی کے ضابطہ کے خلاف معلوم ہوتے ہیں۔ ایسے واقعات میں بعض محض جھوٹ ہیں، لیکن عجائب پرست عوام اُنہیں بیان کیا کرتے ہیں۔ بعض کے علمی یا صناعی مخفی اسباب ہیں، مگر اکثر لوگ اُن سے بے خبر ہیں۔ بعض سرے سے خوارق ہی نہیں ہیں اگرچہ لوگ اُنہیں خوارق

سمجھتے ہیں، مثلاً وہ واقعات جن کی بنیاد، وہم پر ہوتی ہے، جیسے بعض امراض میں وہم سے شفا مل جانا، یا وہ واقعات جو نظر بندی کے ذریعہ واقع ہوتے ہیں اور جس میں شعبدہ باز کامل ہوا کرتے ہیں۔ چنانچہ فرعون کے ساحروں نے جو کچھ کیا تھا، وہ نظر بندی ہی تھی جیسا کہ قرآن میں فرمایا گیا ہے "فَإِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ إِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ أَنَّهَا تَسْعَىٰ" (اُن کی رسیاں اور لاٹھیاں حضرت موسیٰ کو اُن کے سحر سے ایسی معلوم ہوئیں کہ چل رہی ہیں) اسی قبیل سے کانوں کا دھوکہ کھا جانا ہے، چنانچہ بعض لوگ اپنی آواز بدل کر رات کو نہایت عجیب آوازیں بولتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ جنات بول رہے ہیں، بلکہ دن میں بھی ہونٹھ ہلائے بغیر اپنے پیٹ سے طرح طرح کی آوازیں نکال سکتے ہیں۔
ظاہر ہے ایسے لوگوں کی کسی بات پر یقین نہیں کرنا چاہیے۔ ان شعبدہ بازوں کے جھوٹے ہونے کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ وہ اپنے عجیب کرتبوں ہی سے روٹی کماتے ہیں۔ اگر یہ لوگ سچے ہوتے تو بادشاہ اور علماء ان کی صحبت اور ان سے فائدہ حاصل کرنے میں باہم پیش قدمی کرتے۔

معجزات کی قسمیں

تمام معجزے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں اور اُن میں نصِ قرآن، پیغمبروں کے کسب کو کوئی دخل نہیں، لیکن اپنے مظاہر کے لحاظ سے اُن کی

دو قسمیں ہیں: ایسے معجزے جو کسی سنّت الٰہی کے مطابق واقع نہیں ہوتے یہ اُن خاص احکام و قوانین (آرڈیننس) کی طرح ہیں جو حکومتیں یا بادشاہ خاص خاص مصلحتوں سے جاری کرتے ہیں ـــــ لیکن اللہ ان سب سے بلند ہے ـــــ اور ایسے معجزے جو مادّی تو نہیں لیکن روحانی سنت الٰہی کے تحت واقع ہوتے ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السّلام کی جتنی نشانیاں قرآن سے ثابت ہیں، مثلاً وہ نَو نشانیاں جو مصر میں پیش آئی تھیں، تو یہ تمام تر پہلی قسم کے معجزے ہیں اور ان میں حضرت موسیٰ کے ارادے اور کسب کو کوئی دخل نہ تھا۔ اِسی طرح اُن کی وہ نشانیاں جو بنی اسرائیل کے خروج کے وقت اور صحراء سیناء میں پیش آئیں، تو یہ تمام کی تمام خدا کی طرف سے تھیں اور ان میں خود حضرت کو کوئی دخل نہ تھا، بجز اس کے کہ خدا کے حکم سے اُنہوں نے سمندر پر اور پتھر پر اپنی لاٹھی ماری تھی۔ کسی اور پیغمبر کو اِس طرح کی نشانیاں نہیں دی گئیں، اور اِن نشانیوں کی نسبت خیال بھی نہیں کیا جا سکتا کہ اُن اسباب میں سے کسی سبب سے پیش آ سکتی ہیں جو روحانی ریاضت یا مادّے کی قوتوں کے ذریعہ دکھائی جا سکتی ہیں۔

لیکن مسیح علیہ السلام کی نشانیاں جن سے خدا نے آپ کی تائید کی تھی، تو وہ اگرچہ کسبی عادات اور معلوم سُنَنِ خداوندی کے خلاف واقع

ہوئی تھیں، مگر ان میں سے اکثر یا سب کی نسبت کہا جا سکتا ہے کہ عالم ارواح میں خداوندی سنتوں کے مطابق پیش آئی تھیں۔ چنانچہ آپ کی پیدائش بھی انہی سنتوں کے مطابق ہوئی تھی۔ روح الٰہی ــــ یعنی جبریل علیہ السلام ــــ کی پھونک کے ذریعہ آپ شکم مادر میں آ گیے تھے۔ اسی روح کے اثر سے حضرت مریم کے رحم میں وہ کیفیت پیدا ہو گئی تھی جو مرد کے نطفہ سے پیدا ہو جاتی ہے، اور یہ محض قدرت الٰہی کا ایک کرشمہ تھا۔
چونکہ آپ کی پیدائش سراسر روحانی طریقہ پر ہوئی تھی، اس لیے تعجب نہیں کرنا چاہیے اگر آپ کی نشانیاں بھی تمام روحانیوں، پیغمبروں اور ولیوں کی نشانیوں سے بڑھ چڑھ کر ہوئیں، مثلاً کشف کے واقعات اور بعض بیماروں کا اچھا کر دینا وغیرہ وغیرہ امور۔ لیکن حضرت مسیح اور ہندوستانی سادھوؤں اور مسلمان صوفیوں میں فرق یہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی روحانیت زیادہ قوی اور زیادہ مکمل تھی، اور یہ کہ آپ کی نشانیاں سراسر اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھیں، جن میں آپ کے کسب و عمل کو دخل نہ تھا۔ آپ کی نشانیاں بھی اُسی طرح اللہ کی طرف سے تھیں جس طرح خود آپ کی پیدائش تھی۔ فرمایا:

وَالَّتِیْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِیْهَا مِنْ رُّوْحِنَا	اور وہ جو عفت مآب تھی (یعنی مریم) تو ہم نے اُس میں اپنی روح میں سے پھونکا اور

وَجَعَلْنٰهَا وَابْنَهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (۲۱: ۹۱)	اُسے (مریم) اور اُس کے بیٹے کو سب کے لیے نشانی کر دیا۔

اور فرمایا:

وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗٓ اٰيَةً (۲۳: ۵۰)	ہم نے ابن مریم اور اُس کی ماں کو نشانی بنا دیا ہے۔

حضرت عیسیٰ اور اُن کی والدہ، نشانی اِس لیے ہوئیں کہ حضرت روح الٰہی کی پھونک سے ماں کے پیٹ میں آ گیے اور پیدا ہو گیے، نہ کہ انسانی مادّے کی تلقیح سے جیسا کہ عام طور پر سب آدمی پیدا ہوتے ہیں۔ حضرت کی پیدائش سراسر اللہ تعالیٰ کی قدرت سے ہوئی نہ کہ حضرت مریم کے رحم میں نر اور مادہ کے مادّوں کی موجودگی کی وجہ سے جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے۔

حضرت عیسیٰ کا سب سے بڑا روحانی معجزہ وہ ہے جسے قرآن نے بیان کیا ہے، مگر چاروں انجیلوں کے مؤلفوں نے روایت نہیں کیا (کہا جاتا ہے کہ یہ معجزہ "انجیل طفولیت" میں موجود تھا جسے چرچ نے مسترد کر دیا اور وہ بعثت محمدی سے پہلے ہی دنیا سے مفقود ہو گئی) اور وہ معجزہ یہ ہے کہ آپ گیلی مٹی لیتے اور اُس سے چڑیا کا پتلا بناتے پھر اُس میں اپنی سانس پھونکتے اور وہ حکم خدا سے چڑیا بن جاتا تھا۔

روایت کیا گیا ہے کہ یہ مٹی کی چڑیا کچھ دُور اُڑتی تھی پھر مر کر گر پڑتی تھی۔

صحیح و سالم جسم والے مُردے کو جو حال ہی میں مرا ہو، زندہ کر دینا چڑیا والے معجزے سے کم ہے کیونکہ ایسے مُردے میں حضرت کا اپنا روحانی دھارا چھوڑنا پھر اللہ عزوجل کی طرف اپنے پورے دل سے متوجہ ہو کر دعا کرنا۔ اُس میں حکم خدا سے زندگی لوٹ آنے کا روحانی سبب ہوتا تھا، ٹھیک اُسی طرح جس طرح بجھے ہوئے چراغ سے آگ قریب ہوتی ہے تو فوراً جل اٹھتا ہے؛ یا جس طرح بجلی کی ایجابی لہر سلبی لہر سے ملتے ہی، روشنی پیدا کر دیتی ہے۔ خود اِس زمانہ میں بعض طبیبوں نے موت کے بعد ہی جرّاحی عمل یا قلب کے علاج سے مُردوں میں زندگی پیدا کر دی ہے۔

اِس سے گھٹ کر بعض بیماریوں کو اچھا کر دینے کا معجزہ ہے، خصوصاً عصبی بیماریوں کو، عام اِس سے کہ انجیل کے بقول وہ شیطان کی چھوت سے پیدا ہوئی ہوں یا کسی اور سبب سے، اور یہ اِس لیے کہ شیطان، خبیث روح ہے جو پاک روح کی توجہ کے ساتھ باقی باقی نہیں رہ سکتی، وہ پاک روح جو روح القدس جبریل علیہ السلام کی طرف سے شعلہ ہے۔ اِس قسم کے واقعات شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور دوسرے روحانیوں کے ذریعہ بھی پیش آ چکے ہیں۔ عصبی اور دوسری بیماریاں اِس کے سوا کچھ نہیں کہ زندگی کی کمزوری کا نتیجہ ہیں اور اِس

روح کے اتصال سے اُن کا دور ہو جانا سزاوار ہے، کیونکہ یہ روح، زندگی و قوت کا سب سے بڑا سبب ہے۔

اِس سے اُتر کر مکاشفات ہیں جنہیں خود حضرت عیسٰی کے قول کے طور پر قرآن میں اس طرح بتایا گیا ہے: وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ فِىْ بُيُوْتِكُمْ (میں تمھیں بتا دوں گا کہ تم کیا کھاتے ہو اور اپنے گھروں میں کیا جمع کرتے ہو) دوسرے اسرائیلی پیغمبر وغیرہم مستقبل کی اِس سے کہیں زیادہ مہتم بالشان باتیں بتا دیا کرتے تھے۔ نیز پیغمبروں کے علاوہ روحانی لوگوں خصوصًا امتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صالحین نے بھی ایسا ہی کیا ہے۔ لیکن اِس بارے میں درجے کم و بیش ہیں۔ یہ کمی بیشی، قوت و کمزوری میں، مدت کی درازی میں، حاضر و غائب کے ادراک میں، مرئیات و غیر مرئیات میں فرقِ مراتب کے لحاظ سے ہوتی ہے۔ کوئی شخص صرف گزشتہ ہی کی خبر دے سکتا ہے۔ کوئی آیندہ کی بھی باتیں بتا دیتا ہے۔ سب سے اعلیٰ درجہ پیغمبروں کے لیے خاص ہے۔ پیغمبروں کے علاوہ نہ کوئی آدمی ہوا ہے نہ ہوگا جو کشف سے قدیم ترین زمانوں کے حالات بیان کر سکے، جیسا کہ قرآن نے پرانے نبیوں اور اُن کی قوموں کے واقعات بیان کیے ہیں، یا مستقبل کے بارے میں یقین کے ساتھ کہہ سکے کہ آیندہ اِتنے برس کے اندر فلاں بات پیش آنے والی ہے،

جیساکہ قرآن نے بتایا ہے کہ چند سال میں رومیوں کو ایرانیوں پر فتح حاصل ہو جائیگی، یا جیساکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے حق میں پیشین گوئی کر دی تھی کہ وہ بڑے بڑے ملک فتح کرے گی اور قومیں اُس کی پیروی کرنے لگیں گی، پھر ایک وقت آئے گا کہ قومیں اِس اُمت پر ٹوٹ پڑینگی۔ اِس زمانہ میں بھی مکاشفات کا ثبوت ملتا ہے۔ اِسی چیز کو آج کل خیالات کا پڑھنا کہتے ہیں۔ خود ہم نے اِس طرح کی چیزیں دیکھی ہیں۔ اِسی قبیل سے وہ چیز بھی ہے جسے خیالات، کا منتقل کرنا کہتے ہیں۔

اِس تفصیل سے ظاہر ہو گیا کہ موسیٰ علیہ السلام کو جو نشانیاں ملی تھیں، وہ محض قدرتِ خدا سے تھیں اور خدا کی روحی قوتوں کی کسی ظاہری سنّت کے مطابق پیش نہیں آئی تھیں، اور یہ کہ عیسیٰ علیہ السلام کو جو نشانیاں دی گئی تھیں، وہ اِس سے مختلف ہیں۔ پہلی قسم کی سنّتیں انسانوں کی نظر میں اللہ کی قدرت و مشیئت اور مختارکل ہونے کی زیادہ صاف دلیلیں ہیں کیونکہ اسباب و مسببات کے نظام سے زیادہ دور ہوتی ہیں، اُس نظام سے جس کے بموجب اُن کی زندگیاں بسر ہوتی ہیں۔

موسیٰ کو چھوڑ کر مسیح اور ولیوں کی عبادت کا سبب

بہت لوگوں نے عیسیٰ علیہ السلام کی پرستش کی ہے اور انہیں خدا بنا لیا ہے، مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ یہ برتاؤ نہیں کیا، حالانکہ موسیٰ کی نشانیاں زیادہ جلیل القدر ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ان آدمیوں کے علم میں یہ بات نہیں آئی کہ عیسیٰ علیہ السلام کے معجزے عام روحی سنتوں کے بموجب پیش آئے ہیں جن میں اُن کے ساتھ دوسرے لوگ بھی شریک ہو سکتے ہیں، لہذا انہوں نے طے کر لیا کہ حضرت عیسیٰ کی نشانیاں خود اُن کی اپنی قدرت سے پیش آئی ہیں، اور یہ کہ اُنکی قدرت عین قدرت الٰہی ہے، کیونکہ اِن نادانوں کے بقول خدا، حضرت مسیح میں حلول کر گیا اور اُن سے متحد ہو کر ایک بن گیا ہے، اور یہ کہ موسیٰ علیہ السلام کی نشانیاں سراسر قدرت خدا سے پیش آئی تھیں۔ لیکن اِن لوگوں کو یاد نہ رہا کہ حضرت عیسیٰ نے بھی حضرت موسیٰ ہی کی شریعت (توراۃ) کی پیروی کی ہے، بجز چند باتوں کے جنہیں خدا نے آپ کی زبان سے منسوخ کرا دیا، جیسے بعض ایسی چیزوں کا حلال کر دینا جو یہودیوں پر اُن کی سرکشی کی وجہ سے بطور سزا کے حرام کر دی گئی تھیں، اور جیسے دولت اور خواہشوں کی پرستش میں اُن کے غلو کو حرام کر دیا ہے۔

اس بارے میں عیسائیوں کا معاملہ اُن مسلمانوں کا سا ہے

جو اپنی مصیبتوں میں صالحین سے دعا کر کے اُن کی عبادت کرتے ہیں۔ اِن لوگوں کا اعتقاد یہ ہے کہ یہ بزرگ اپنے غیبی تصرّف کے ذریعہ اُن سے تکلیف دور کر دیتے اور اُنہیں نفع پہنچاتے ہیں۔ اسباب و مسبّبات سے الگ یہ تصرّف اِن لوگوں کی بول چال میں کرامت ہے، حالانکہ اِس قسم کا تصرّف و اختیار صرف اللہ تعالیٰ ہی سے خاص ہے، لیکن یہ لوگ اپنے اِن معبودوں کو پروردگار، معبود، خدا، خالق نہیں کہتے، مگر ناموں کا یہ اختلاف اِس بارے میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا، کیونکہ لفظ اور نام اصطلاحی ہیں۔

خالق اور مخلوق، رَب اور مربوب میں فرق یہ ہے کہ پروردگار جسے چاہے نفع پہنچائے اور جسے چاہے نقصان پہنچائے۔ خدا، اسباب و مسببات کا پابند نہیں ہے، بلکہ جب چاہے اپنے پیدا کیے ہوئے اسباب سے کام لے اور جب چاہے اُن کے بغیر ہی کام کرے۔ لیکن مخلوق کی یہ حالت نہیں ہے۔ وہ سراسر اسباب و مسببات کی پابند ہے جو سب کے لیے یکساں طور پر مسخّر کر دیے گئے ہیں، لیکن لوگ اِن کے علم و عمل میں اُتنے ہی متفاوت درجے رکھتے ہیں جتنا عقل و حواس و اعضاء کے لحاظ سے اُن کی اِستعداد میں تفاوت ہے۔

کسبی علم و عمل کے ذریعہ اب انسان، نفع حاصل کرنے اور نقصان

دور کرنے میں اُس مقام تک پہنچ گیا ہے جو پہلے کسی مخلوق کو نصیب نہیں ہوا حتیٰ کہ پیغمبر بھی اُس تک پہنچ نہ سکے، اور یہ اس لیے کہ پیغمبر اِس معاملے کے لیے سرے سے بھیجے ہی نہ گیے تھے بلکہ اُن کی بعثت کی غرض صرف یہ تھی کہ لوگوں کو معرفت و عبادت الٰہی کی راہ دکھائیں اور اُن کے اخلاق درست کردیں۔

بنابریں دنیا کے منافع، انبیاء سے طلب نہیں کرنا چاہیے، نہ اُن کے جیتے جی نہ اُن کی وفات کے بعد، بلکہ اُن وسائل واسباب کے ذریعہ طلب کرنا چاہیے جن سے وہ حاصل کیے جا سکتے ہیں، اسباب کے پرے خدا کے سوا کسی اور کو قدرت نہیں ہے۔ ظالموں نے بعض انبیاء و اولیاء کو طرح طرح کی آزمائشوں میں مبتلا کیا، یہاں تک کہ قتل بھی کر ڈالا۔ اِس پر بھی یہ انبیاء و اولیاء اپنی ذات سے تکلیف و مصیبت دور نہ کر سکے۔ اِسی لیے قرآن حکیم میں بار بار اس کی تردید کردی گئی ہے کہ جن چیزوں یا آدمیوں کی لوگوں نے پرستش اختیار کر رکھی ہے، وہ نہ خود کوئی نفع پہنچا سکتے ہیں نہ خدا کے ہاں شفاعت و سفارش کے ذریعہ اِس کی قدرت رکھتے ہیں۔ فرمایا:

وَيَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ	خدا کو چھوڑ کر ایسوں کی پرستش کرتے ہیں جو انہیں نہ نقصان پہنچا سکتے ہیں نہ نفع،

وَيَقُولُونَ هٰؤُلَاءِ شُفَعَاؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ الخ (۱۰ : ۱۸)	اور کہتے ہیں کہ یہ لوگ خدا کے ہاں ہمارے شفیع ہیں۔

اسی کے ہم معنی اور بہت سی آیتیں ہیں۔ پھر خدا نے اپنے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی حکم دیا کہ دوسرے پیغمبروں کی طرح خود بھی لوگوں کو اِس حقیقت سے آگاہ کردیں۔ چنانچہ فرمایا:

قُلْ لَا أَمْلِكُ لِنَفْسِي نَفْعًا وَلَا ضَرًّا إِلَّا مَا شَاءَ اللّٰهُ وَلَوْ كُنْتُ أَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوءُ إِنْ أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ وَبَشِيرٌ لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ (۷ : ۱۸۸)	کہہ دیجئے کہ میں اپنی ذات کے لیے نہ کسی نفع کی قدرت رکھتا ہوں نہ کسی نقصان کی اِلّا اُس کے جو خدا چاہے، اور اگر میں غیب کو جانتا تو اپنے لیے بہت سی بھلائی حاصل کرلیتا اور مجھے تکلیف نہ پہنچتی۔ میں اِس کے سوا کچھ نہیں کہ ڈرانے والا اور ایمان لانے والوں کو بشارت دینے والا ہوں۔

اور فرمایا:

قُلْ إِنِّي لَا أَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَلَا رَشَدًا	کہہ دیجئے کہ میں تمھارے لیے نہ کسی نقصان کی قدرت رکھتا ہوں نہ کسی ہدایت کی۔

اِس مسئلہ کو ہم بارہا تفصیل سے بیان کرچکے ہیں۔ یہاں حسب دفعات ذیل اُس کا خلاصہ پیش کرتے ہیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو پورے کمال کے ساتھ پیدا کیا، اور اُسے ایسے نظام اور دستور سے جوڑ دیا ہے جس میں نہ کمی بیشی ہو سکتی ہے نہ خلل پڑ سکتا ہے۔ اللہ کے قوانین مقرر ہیں اور تمام اسباب و مسببات اُنہی سے وابستہ ہیں۔ اُس کی جملہ علوی اور سفلی مخلوقات، اُسی کے اسماء و صفات کی مظہر ہیں۔ اسی لیے حجۃ الاسلام غزّالی نے کہا ہے "جو کچھ ہو چکا ہے اُس سے بہتر ہونا ناممکن ہے"، کائنات میں یہ جاری و ساری نظام، جو حواس، عقل، اور نصوص قرآن سے ثابت ہے، خالق السّماوات والارض کی وحدانیت کی سب سے بڑی دلیل ہے "لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا" (اگر آسمان اور زمین میں خدا کے سوا دوسرے دیوتا ہوتے تو آسمان اور زمین میں خرابی پڑ جاتی)

۲۔ آفرینش میں نت نئی بوقلمونیوں، اور حرکت و سکون، تحلیل و ترکیب میں اللہ تعالیٰ کی سنتوں کا پورا پورا علم اُس ذاتِ اعزّ و اجل کے سوا کسی کو نہیں۔ اِس چیز میں آدمیوں کا غور و فکر، تجربہ و تدبّر جتنا زیادہ بڑھتا جاتا ہے، اُس کے اسرار و عجائب و منافع اتنے ہی زیادہ اُن پر کھلتے جاتے ہیں، وہ اسرار و عجائب و منافع جن کا اُنہیں نہ علم تھا نہ وہم و گمان۔ خود ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ تجارتی اور جنگی ہوائی جہاز، فضا میں اُڑ رہے ہیں اور قریب ہے کہ منطقۂ ہواء سے بھی اوپر نکل جائیں۔

بحری کشتیاں، سمندروں کے نیچے چل رہی ہیں۔ ایک برّاعظم کے آدمی دوسرے برّاعظم کے آدمیوں سے باتیں کرنے لگے ہیں، جس طرح قرآن مجید نے بتایا ہے کہ جنت کے لوگ دوزخ کے لوگوں سے باتیں کریں گے۔ حالت یہ ہو گئی ہے کہ مشرق کے باشندے مغرب کے باشندوں کی، شمال کے باشندے، جنوب کے باشندوں کی آوازیں، تقریریں، اور گانے سُن رہے ہیں۔ معاملہ اس حد تک پہنچ چکا ہے کہ برّاعظم یورپ میں کوئی آدمی ایک بٹن دبا دیتا ہے اور دوسرے برّاعظم میں فوراً بڑی بڑی مشینیں چلنا شروع ہو جاتی ہیں، حالانکہ دونوں سرزمینوں کے مابین بے شمار دوری ہے، ریگستان اور بیابان ہیں، سربفلک پہاڑ اور لمبے چوڑے سمندر ہیں۔ جو لوگ اللہ کی ان سنّتوں اور قدرت کے قانون سے ناواقف ہیں، نفع کی تلاش اور نقصان سے گریز کرنے میں اسباب کو چھوڑ کر دوسری راہ اختیار کرتے ہیں، کیونکہ جہل نے اُن پر اسباب کی راہ بند کر دی ہے، لہٰذا مشہور یا مجہول بزرگوں کی قبروں پر دوڑ دوڑ کر جاتے ہیں اور اُن سے طرح طرح کی منّتیں اور مرادیں طلب کرتے ہیں، حالانکہ اگر ان قبروں کو یا اُن کے بسنے والوں کو کچھ بھی اختیار ہوتا تو اجنبی فاتحوں کو مسلمانوں کے ملکوں سے نکال دیتے جنہوں نے مسلمانوں کو غلام بنا ڈالا ہے اور اُن کی دولت چھین لی

۳۔ دنیا میں جو کچھ بھی پیش آتا ہے، اُس میں اصل یہی ہے کہ اسباب و مسبّبات کے نظام کے بموجب پیش آئے۔ اللہ کی سنّتیں جو علم سے معلوم ہو چکی ہیں، اور جن کی وحی نے ہمیں خبر دیدی ہے، اُن میں کبھی تغیّر و تبدّل واقع نہیں ہوتا۔ بنا بریں اس نظام اور ان سنتوں کے خلاف پیش آنے والے ہر واقعہ کی خبر ضرور جھوٹی ہے۔ یا تو خود خبر دینے والے نے اپنے دل سے گڑھی ہے یا اُسے اپنے مشاہدے میں دھوکہ ہو گیا ہے، یا فریب دیا گیا ہے۔ لیکن اگر واقعی کوئی ایسا واقعہ پیش ہی آیا ہے، تو ضرور اُس کا کوئی مخفی سبب ہوگا جس سے خبر دینے والا ناواقف ہے، جیساکہ علماء اصول نے خبر کے بارے میں طے کر دیا ہے۔

۴۔ اللہ کی وہ نشانیاں جو خدا کی حکیمانہ سنّتوں سے ہٹ کر پیش آتی ہیں، اُن کا علم، قطعی دلیل کے سوا اور کسی طرح ممکن نہیں۔ اللہ کی حکمت کا تقاضا یہ ہوا کہ اپنے بعض پیغمبروں کو اس قسم کی کچھ نشانیاں بخش دے تاکہ مخالفوں پر حجت قائم ہو اور تخویف کا موجب بنے، لیکن اس قسم کی نشانیوں کا سلسلہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت و رسالت کے ختم ہو جانے کے ساتھ منقطع ہو چکا ہے، اور یہ اس لیے کہ خدا نے جو وحی آپ پر نازل کی ہے، وہ دائمی نشانی ہے اور تمام انسانوں کے لیے عام ہدایت جب تک وہ اس دنیا میں زندہ موجود ہیں، چنانچہ فرمایا وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ

اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعَالَمِیْنَ (اے پیغمبر، ہم نے تمھیں تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے) کیونکہ خدا کے علم میں یہ بات موجود ہے کہ انسانوں کو اس وحی کے بعد نہ کسی وحی کی ضرورت باقی رہے گی نہ اس نشانی کے اللہ کی طرف سے ہونے پر اس قرآن کے سوا کسی اور دلیل کی حاجت ہوگی، اور ہم اوپر بیان کر آئے ہیں کہ قرآن کے مِن عند اللہ ہونے کا کیا ثبوت ہے۔

ختم نبوت سے خوارق کا انقطاع اور کرامت کے معنی

۵۔ اگر قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی انسانوں کو نشانیوں کی ضرورت باقی رہتی، جیسا کہ کرامتوں اور نئے نئے فرقوں اور دینوں سے فتنہ میں پڑے ہوئے لوگوں کا خیال ہے، تو ختم نبوت کے کوئی معنیٰ ہی نہ ہوتے۔ یہی سبب ہے کہ بہائی اور قادیانی، ختم نبوت اور انقطاع وحی کے منکر ہیں، اور باب دیہا، غلام احمد، اور اُن کے جانشینوں کے حق میں اِن دونوں چیزوں کو ثابت کرتے ہیں، یہاں تک کہ اب حالت یہ ہوگئی ہے کہ معمولی لوگوں نے بھی نبوت کو کمائی کا ایک ذریعہ بنا لیا ہے۔

ہمارے شیخ، استاذ امام، شیخ محمد عبدہ نے اپنے "رسالۂ توحید" میں بیان کر دیا ہے کہ جس طرح افراد، طفولیت سے شباب، اور پھر کہولت تک پہنچتے ہیں، یہاں تک کہ اُن کی عقل پکی ہو جاتی ہے، اُسی طرح قوموں

نے بھی عقل وادراک میں بتدریج ترقی کی ہے اور اس ترقی کے ساتھ اُن کے دینی قانون بھی ترقی کرتے گئے ہیں، یہاں تک کہ عقل انسانی نے اِس حد تک ترقی کرلی کہ وہ اِس بلند ترین عقلی ہدایت (قرآن) کو سمجھنے لگی، حالانکہ پہلے اُسے وحی کا یقین دلانے کے لیے اِس کے سوا کوئی ذریعہ نہ تھا کہ ایسی نشانیاں ظاہر کی جائیں جو اُسے حیرت میں ڈال دیں اور جن کے سامنے اُس کی عقل کُند اور ششدر ہو کر رہ جائے۔

رسالت کی ضرورت پر گفتگو کرتے ہوئے استاذ امام نے ظاہر کیا ہے کہ "انسانی عقل کی بلندی اور کائنات کے قویٰ پر اُس کا عظیم اقتدار انسان کو اِس بات سے روکتا ہے کہ وہ اِن میں سے کسی چیز کے آگے بھی جُھکے۔ انسان صرف اُسی چیز سے مرعوب ہوتا اور اُسی کے آگے جھکتا ہے جس کا سبب واصلیت سمجھنے سے اُس کی عقل عاجز ہوتی ہے۔ وہ خیال کرنے لگتا ہے یہ چیز ضرور اُسی اعلیٰ غیبی قوت کا کرشمہ ہے جو عالمِ کَون کی چلانے والی اور اُس میں اسباب کو مسخّر کرنے والی ہے۔ لہٰذا یہ اللہ تعالیٰ کی انسان پر بڑی ہی رحمت تھی کہ اُس نے انسان کے سب سے زیادہ کمزور پہلو ہی کو اُس کی رہنمائی کے لیے چنا۔ چنانچہ اُسی کے گروہ میں سے رہبر و ہادی اٹھائے، اُن میں ایسی خصوصیتیں رکھ دیں جن میں اُن کا کوئی شریک نہیں، پھر لوگوں کو مزید یقین دلانے کے لیے اِن رہبروں کو ایسی حیرت انگیز

نشانیاں دیں جو دلوں پر قبضہ کر لینے والی، عقلوں پر چھا جانے والی تھیں۔ جن کے سامنے سرکش جھک گیے۔ ہٹ دھرم اپنی ضد سے باز آگیے۔ عقل نے اُن سے تصادم کیا اور اپنی کجی سے لوٹ آئی۔ جاہلوں کی نگاہیں اُنہیں دیکھ کر خیرہ ہوگئیں اور سچائی کو دیکھنے لگیں ''

پھر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے بارے میں فرمایا ''ایسا پیغمبر جس نے اگلے پیغمبروں کی تصدیق کی، لیکن اپنی رسالت کا یقین دلانے کے لیے نہ آنکھوں کو خیرہ کیا، نہ حواس کو حیرت میں ڈالا، نہ کچھ اور کیا، لیکن ہاں یہ کیا کہ ہر قوت سے اُس عمل کا مطالبہ کیا جس کے لیے وہ بنائی گئی ہے۔ خصوصیت سے عقل کو مخاطب کیا، اور حق و باطل کا اُسی کو حکم بنادیا۔ پھر گویائی کی قوت، بلاغت کے اقتدار، اور دلیل کی متانت کو حجت کا مبلغ اور حق کی نشانی بنادیا، وہ حق جس کی نسبت فرمایا: لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ تَنْزِيلٌ مِنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ ''

انبیاء کے معجزے، قرآن ہی سے ثابت ہو سکتے ہیں

۲۔ موجودہ زمانہ میں قرآن کے علاوہ اور کوئی ایسی حجت موجود نہیں ہے جس سے انبیاء کے معجزے ثابت کیے جائیں اور عقل والے اُسے مسترد نہ کر سکیں۔ اسلام سے پہلے ادیان کی کتابوں میں جتنے معجزے

بیان کیے گیے ہیں، خود اِن کتابوں کے جاننے والے علماء نے اِن کا انکار
کر دیا ہے، کیونکہ اُن کا حقیقی خارق عادت ہونا مشتبہ ہے۔ اِن لوگوں
کی حجّت یہ ہے کہ جس تواتر سے علم قطعی حاصل ہوتا ہے، وہ یہاں اِن معجزوں
کی روایت میں موجود نہیں ہے۔ اِس تواتُر کے لیے ضروری ہے کہ اِتنے بہت
سے لوگ کوئی بات بیان کریں کہ جھوٹ پر اُن سب کا متفق ہونا خیال نہ
کیا جا سکے۔ جس بات کی یہ لوگ خبر دیں، اُسے اُنہوں نے اپنے حواس سے
معلوم کیا ہو، اور نسلاً بعدَ نسلٍ و بطناً بعدَ بطنٍ اُسے بے شمار آدمی اُن سے
روایت کرتے چلے آئیں۔ جھوٹ پر اِن لوگوں کا متفق نہ ہو سکنا، چند
باتوں سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ خبر کا
مضمون ایسا ہو جس کی طرفداری کا شک اِن پر نہ ہو سکے اور وہ اُس میں
ایک دوسرے کی تقلید نہ کرتے ہوں۔ اِس تواتُر کے صحیح ہونے کی نشانی
یہ ہے کہ اُس کی موجودگی میں علم قطعی حاصل ہو جائے۔ دل مطمئن ہو جائیں۔
اعتقاد و ضمیر اُسے مسترد نہ کر سکے، اور معلوم ہے پرانے پیغمبروں کے معجزوں کا
یہ حال نہیں ہے۔

رہ گیا قرآن کا معجزہ تو یہ قرآن کے ساتھ قیامت تک باقی رہنے
والا ہے۔ اسلامی تاریخ سے ہر واقف جانتا ہے کہ قرآن متواتر ہے۔ رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت سے آج تک اُس کا تواتُر کبھی ٹوٹا نہیں۔

اِس حقیقت کو سب تسلیم کرتے ہیں۔ ہاں قرآن کے بارے میں جو چیز بہت سے یورپین لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی، وہ اُس کے مُعجز ہونے کے وجوہ ہیں۔ اِس بحث میں ہم نے اُن کا شبہہ تفصیل سے بیان کر کے اُس کا بُطلان بھی ظاہر کر دیا ہے۔ اور جب کہ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ قرآن، وحی الٰہی ہے، تو قرآن میں جو کچھ بھی وارد ہوا ہے، اُس پر ایمان لانا واجب ہے، عام اِس سے پیغمبروں کی نشانیاں ہوں یا کچھ اور۔ جس طرح اِن سب باتوں پر ایمان لانا ہر مومن کے لیے ضروری ہے، اُسی طرح یہ ایمان بھی رکھنا ضروری ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت ختم ہونے کے ساتھ پیغمبروں کے معجزے بھی ختم ہو گیے۔

کسی مسلمان پر یہ عقیدہ رکھنا واجب نہیں کہ محمد خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی کائناتی خارقِ عادت کرامت واقع ہوئی ہے، اس لیے دوسرے علما، وحکماء کی طرح یہ تسلیم کرنے سے اُس کے دین کو نقصان نہیں پہنچ سکتا کہ تمام قوموں میں معجزوں اور کرامتوں کے جو دعوے کیے جاتے ہیں، اُن میں سے اکثر جھوٹے ہیں۔ بعض علمی طریقہ پر پیش آئے ہیں یا شعبدہ بازی کا نتیجہ ہیں، اور اُن میں بہت کم ایسے ہیں جو بلند انسانی روحوں کے خواص سے تعلق رکھتے ہیں۔

۷۔ نصوص قرآنی سے پیغمبروں کے جو معجزے ثابت ہیں، اُن

کی تعداد بہت ہی کم ہے۔ اِن میں سے جن نصوص کی دلالت قطعی ہے، اُن کی ایسی تاویل کرنا جو عربی زبان کے خلاف ہو یا شریعت کے کسی قطعی قاعدے کو شکست کرنے والی ہو، اسلام سے خروج ہے۔ لیکن جو نصوص قطعی نہیں ہیں، اُنہیں اُن کے ظاہری الفاظ ہی پر رکھنا چاہیے۔ اگر کوئی اور ویسی یا اُس سے قوی تر نص مخالف پڑے، تو ایسی صورت میں دونوں کے مابین معلوم دلائل کی بنا پر ترجیح دینا چاہیے۔ اِس اصل سے خروج بدعت ہے۔

خلاصۂ خلاصہ

ہمارا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی اپنی قدرت وارادہ، اختیار وحکمت سے ہر چیز کا خالق ہے۔ جیسا کہ سورۂ الم سجدہ میں فرمایا کہ اُس نے ہر چیز کو کمال حُسن سے پیدا کیا ہے "اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ"، اور جیسا کہ سورۂ نمل میں ارشاد ہوا ہے کہ ہر چیز کمال سے بنانے والے خدا کی صنّاعی ہے "صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ"، اور یہ کہ اُس کی خلق میں نہ تفاوت ہے نہ خرابی، جیسا کہ سورۂ ملک میں فرمادیا ہے، اور یہ کہ اُس نے جو کچھ پیدا کیا ہے، پورے نظام و اندازے سے پیدا کیا ہے، یونہی بے سوچے سمجھے اور اٹکل پچو پیدا نہیں کردیا ہے، جیسا کہ سورۂ قمر میں فرمایا "اِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ"، اور سورۂ فرقان میں فرمایا "وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ

فَقَدَّرَہٗ تَقْدِیْرًا " اور سورۂ حجر میں فرمایا " وَاَنْبَتْنَا فِیْھَا مِنْ کُلِّ شَیْءٍ مَّوْزُوْنٍ، وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَائِنُہٗ وَمَا نُنَزِّلُہٗ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ "

اور ہمارا ایمان ہے کہ تکوین و آفرینش میں اور نظام اجتماع میں جس کی طرف خدا نے انسان کی رہنمائی کی ہے، اللہ کی سنتیں اور قانون مقرر و پائیدار ہیں جن میں مسببات سے اسباب ملتے ہیں۔ یہ سنتیں کسی آدمی کی خاطر بدلتی نہیں۔ بلکہ عالم اجسام اور عالم ارواح میں عام ہیں اور جاری وساری۔ اِن سنتوں کا اِسی لفظ کے ساتھ کئی سورتوں میں ذکر آیا ہے

اور ہمارا ایمان ہے کہ خلق میں اللہ تعالیٰ کی روشن نشانیاں ہیں اور اِن نشانیوں میں اُس کی کھلی یا چھپی حکمتیں ہیں۔ ہمیں اُس نے جو عقل و شریعت بخشی ہے، دونوں کا تقاضا یہی ہے کہ ہم مذکورۂ بالا محکم نظام اور خدائی قوانین کے خلاف کسی واقعہ کا پیش آنا قبول نہ کریں، مگر ہاں اُس وقت جب کوئی قطعی دلیل شہادت دے رہی ہو جس کے ثبوت و تحقیق میں عقل کے ساتھ حواس بھی شریک ہوں۔ نیز یہ بھی ضروری ہے کہ ایسے واقعہ میں خدا کی کوئی بڑی حکمت ضرور ہو گی، کیونکہ نظام کائنات میں کسی خلل کی وجہ سے یا یوں ہی بے فائدہ کوئی واقعہ پیش نہیں آسکتا۔ اور یہ کہ

خدا کی بہت سی حکمتیں ہم سے اُسی طرح پوشیدہ ہیں، جس طرح مخلوقات کے بہت سے معاملات ہماری سمجھ میں نہیں آتے۔ جو کچھ ہمیں معلوم نہیں ہے، اُسے معلوم کرنے کی کوشش کرنا چاہیے تاکہ ہمارا علم بڑھے اور ہمارا نفس کمال حاصل کرے۔ یہ نہیں ہونا چاہیے کہ اپنے جہل کو کفر و انکار کا سبب و عذر بنالیں۔ ہم میں جو سب سے بڑے عالم ہیں، وہ بھی اقرار کر رہے ہیں کہ اِس کائنات کا ہمیں جتنا علم حاصل ہے، جہل اُس سے کہیں زیادہ ہے۔ یعنی ہمیں اِس کا علم بہت ہی کم ہے، اور نا ممکن ہے کہ انسان اِس کے علم کا پورا پورا احاطہ کر سکے۔

اور ہمارا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم پر اپنے پیغمبر بھیج کر بڑا احسان کیا ہے۔ اِن پیغمبروں نے خدائی نشانیوں کے ذریعہ ہماری رہنمائی کی اور ہم حواس اور ذہن کے ابتدائی ادراک کے تنگ دائرے سے نکل کر عالمِ غیب کے وسیع دائرے تک پہنچ سکے۔ اگر پیغمبروں کی ہدایت نہ ہوتی تو انسان لاکھوں برس اُن تمام چیزوں کا انکار کرتے رہتے جنہیں اپنے حواس سے معلوم نہیں کرتے ہیں۔

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ اللہ پر، انبیاء کی نشانیوں پر، روزِ آخرت پر، اور اعمال کی سزا و جزا پر ایمان ہی نے انسانی عقل کو آمادہ کیا کہ کائنات کے رازوں کی جستجو کرے۔ اِسی جستجو کا نتیجہ ہے یہ تمام ترقی جو

انسان نے علوم و فنون، اور صنعتوں میں کی ہے۔ غیب پر ایمان نہ رکھنے والوں کا اِس ترقی میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ غیب کے تینوں رکنوں پر ایمان ہی نے انسان پر اُن علوم و اعمال کے دروازے کھولے ہیں، جنہیں منکرین غیب، غیب ہی کی طرح بالکل ناممکن سمجھتے تھے۔ اب تک جتنی ترقیاں ہو چکی ہیں، اُن کے بعد غیب کی کوئی خبر بھی عقل سے بعید نہیں رہی۔

اِس تمام تفصیل سے ظاہر ہو گیا کہ انبیاء کی نشانیوں یا معجزوں سے انسان کو تین فائدے حاصل ہوئے ہیں جو اِن نشانیوں کے قائم کرنے میں منجملہ الٰہی حکمتوں کے ہیں:

۱۔ یہ نشانیاں اِس بات کی محسوس دلیل بن گئیں کہ خدا اپنے سب کاموں میں با اختیار ہے، اور یہ کہ کائنات کا نظام اُس کے ماتحت ہے نہ کہ اُس پر حکمراں اور اُس کے ارادے کو پابند کرنے والا۔

۲۔ یہ نشانیاں اِس بات کی دلیل ہوئیں کہ خدا کے پیغمبروں نے اُس کی وحی کی بنا پر جو کچھ فرمایا ہے، بالکل سچ ہے، اور خود پیغمبر بھی سچے ہیں، کیونکہ اگر یہ نشانیاں ایسی ہوتیں جنہیں دوسرے انسان بھی اپنے کسب سے یا روحانی استعداد سے پیش کر سکتے، تو پھر یہ پیغمبروں کی سچائی کا ثبوت نہ بن سکتیں۔

۳۔ اِن نشانیوں کو دیکھکر انسانی عقل نے سمجھا کہ ممکنات کا دائرہ بہت ہی وسیع ہے اور معقولات میں محال کا دائرہ بہت ہی تنگ ہے، اور یہ کہ کسی چیز کے معمولی اسباب اور معلوم قوانین قدرت سے دور ہونے سے لازم نہیں آتا کہ وہ محال ہے اور پیش نہیں آسکتی، اور یہ کہ اُس کی خبر سنانے والے کو جھٹلا نہیں دینا چاہیے حالانکہ اُس کی سچائی کا ثبوت موجود ہے۔ بلکہ زیادہ سے زیادہ یہ کہنا چاہیے کہ اِس بارے میں اصل یہی ہے کہ ایسی خبر کو ثابت نہیں سمجھا جا سکتا جب تک صحیح دلیل سے اُس کا ثبوت مِل نہ جائے۔ موجودہ زمانہ کے علماءِ کائنات کا بھی یہی اصول ہے۔ اُن کے علم کی تکمیل میں صرف یہی نقص رہ گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کوئی ایسی نشانی ثابت ہوجائے جس کی کوئی علّت، معلوم قوانین قدرت میں بظاہر موجود نہ ہو۔

لیکن اب معاملہ برعکس ہوگیا ہے۔ بہت سے لوگ جنہوں نے وہ علوم سیکھ لیے ہیں جو انبیاء کے معجزوں اور ایمان بالغیب سے متعلق اُن کی دعوت کو عقل سے قریب کرنے والے ہیں، تو بجائے اس کے کہ یہ لوگ اُسے مانتے، اِنہی علوم کی وجہ سے اُس کا انکار کرنے لگے ہیں۔ یعنی جو چیز اِن علوم کا سبب بنی اور جس نے انسان کی اُن تک رہنمائی کی، اب اُسی سے انکار کیا جا رہا ہے، اُس کے امکان کا انکار نہیں بلکہ

اُس کے وقوع کا انکار۔ چنانچہ یہ علماء انکار کرتے ہیں کہ خدا نے ایسے عجائبات دکھائے ہوں جیسے یہ لوگ خود اُس کی بخشی ہوئی توفیق سے دکھا سکتے ہیں، حالانکہ انہیں چاہیے تھا کہ اپنی اس مقدرت کو خدائی نشانیوں کی دلیل اور اُن کی حقیقت کا بیان سمجھتے، جیسا کہ خدا فرماتا ہے:

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ۔	عنقریب ہم اپنی نشانیاں اُنہیں گردوپیش میں اور خود اُن کی ذات میں بھی دکھائیں گے یہاں تک کہ اُن پر ظاہر ہو جائے کہ قرآن حق ہے۔

لیکن خدا جب [illegible] انہیں اپنی کوئی روحانی نشانی خود ان کے اپنے اندر یا کائناتی نشانی آفاق میں دکھاتا ہے تو یہ لوگ معلوم پر نامعلوم کو قیاس کر کے کسی نہ کسی قانون قدرت کو اُس کا سبب قرار دیتے ہیں۔ اس طرح نشانی کو محض قدرت الٰہی کا کرشمہ تسلیم نہیں کرتے اور بدستور شک و شبہہ میں پڑے رہتے ہیں، ٹھیک اُن لوگوں کی طرح جنہوں نے مطالبہ کیا تھا کہ ہم اُس وقت تک [illegible] نہیں جانیں گے جب تک کوئی فرشتہ پیغمبر بنا کر نہ بھیجا جائے گا۔ فرمایا:

وَلَوْ جَعَلْنَاهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنَاهُ رَجُلًا وَلَلَبَسْنَا عَلَيْهِم مَّا يَلْبِسُونَ (۶: ۹)	اگر ہم اپنے رسول کو فرشتہ بناتے تو فرشتے کو بھی آدمی ہی کی صورت میں کر دیتے اور یہ لوگ بدستور شک میں پڑ جاتے۔

اور نہ یہ اس لیے کہ آدمی، فرشتہ کو دیکھ نہیں سکتے اور نہ اُس
سے تعلیم حاصل کر سکتے ہیں جب تک اُنہی کی طرح آدمی کی صورت میں
وہ نہ ہو، لیکن یہی آدمی کی صورت وہ چیز ہے جس کی وجہ سے یہ لوگ
انکار کرتے ہیں کہ بھلا ہمارا ہی جیسا آدمی، پیغمبر کیونکر ہو سکتا ہے؟ لہذا
اگر خدا، فرشتہ کو بھی پیغمبر بنا کر آدمی کی صورت میں اتار دیتا تو
اس حالت میں بھی انہیں وہی شک پیدا ہو جاتا جس میں انسانی پیغمبر
کی وجہ سے مبتلا ہیں۔

ٹھیک یہی حالت اس زمانہ میں ہے۔ آج کل مکاشفہ کے
ذریعہ اور مادّے میں تاثیر کی صورت میں متعدد روحانی نشانیاں ظاہر
ہو چکی ہیں، مگر لوگ انہیں بجلی کے ذریعہ گفتگو وغیرہ امور سے مشابہت
دے رہے ہیں تاکہ یہ ماننا نہ پڑے کہ خالق سبحانہ کی پیدا کردہ نشانیاں
ہیں جو اُن کے علم کے ماتحت نہیں آتیں۔

دین کے بغیر علم کی ترقی کا خطرہ

چونکہ یہ علماء اس طرح کی الٰہی نشانیوں پر ایمان نہیں رکھتے،
اس لیے انسان کو موجودہ زمانہ کی عجیب علمی ترقیوں کا پھل یہ ملا ہے
کہ اُس کی بدبختیوں میں اضافہ ہو گیا ہے، اور اب اُس کی تہذیب کے
لیے یہ خطرہ لاحق ہو گیا ہے کہ انہی علمی و صناعی ترقیوں کے ہاتھوں

کہیں برباد نہ ہو جائے۔ تمام مصلح علماء و حکماء و مدبّر حیران ہیں کہ کس طرح اس خطرے کو دور کریں، حالانکہ یہ دور ہی نہیں ہو سکتا جب تک دین اور علم کو ایک ساتھ جمع نہیں کر دیا جائے گا۔ یہی وہ چیز ہے جسے لیکر محمد خاتم النبیین تشریف لائے اور اسی کے لیے کتاب اللہ میں نشانیوں کو بیان کیا گیا ہے، کیونکہ انسان صرف اُسی چیز کے آگے جھکتا ہے جو اُس کی قوت سے بالا ہوتی ہے، اور وہ مان لیتا ہے کہ یہ چیز خدا کی غیبی قوت ہی کا کرشمہ ہے جو سب قوتوں سے بڑھکر ہے علم اور دین کی اس یکجائی پر ہم آگے گفتگو کریں گے۔

قرآن کا تیسرا مقصد

(اسلام، فطرت، عقل، علم، حجت، ضمیر، آزادی کا دین ہے)

انسان پر وہ دور گزر چکا ہے جب دین کی نسبت اُس کا علم صرف اس قدر تھا کہ وہ ایسی تعلیمات کا نام ہے جو عقل سے بالکل خارج ہیں اور یہ کہ انسان کو ان تعلیمات کا پابند صرف اس لیے بنا دیا گیا ہے کہ اُس کی فطرت کو کچلا جائے۔ اُس کے نفس کو تکلیف میں ڈالا جائے۔ اُس کی عقل و بصیرت کا خون کیا جائے، اور یہ کہ سب کو دینی پیشواؤں کی فرمانبرداری کرنی چاہیے۔ وہ جو کچھ بھی بتا دیں، اُسے بے چون وچرا

مان لینا چاہیے۔ اُن کی پوری پوری تابعداری میں کامیابی ہے اور سرِ اُد جہراً ذرا بھی مخالفت کی گئی تو بربادی یقینی ہے۔

یہی حالت تھی کہ اللہ نے محمد خاتم النبیین کو مبعوث کیا۔ آپ نے انسانوں کے سامنے آیاتِ الٰہی تلاوت کیں۔ کتاب وحکمت کی اُنہیں تعلیم دی، اور اُس تمام گمراہی سے پاک کر دیا جس میں وہ پڑے تھے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام انسانوں کو بتا دیا کہ اسلام، فطرت کا، عقل و فکر کا علم وحکمت کا، برہان وحجت کا، ضمیر ووجدان کا، آزادی وخود مختاری کا دین ہے اور یہ کہ خلق خدا میں کوئی نہیں جس کا کچھ بھی اقتدار، انسان کی روح پر، یا عقل پر، یا ضمیر پر ہو۔ پیغمبر بھی اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ رہنمائی ورہبری کرتے ہیں۔ بشارت سناتے اور قہرِ الٰہی سے ڈراتے ہیں، جیسا کہ پچھلے مبحث میں بیان ہو چکا۔ اب ہم اسلام کی یہ خصوصیتیں، قرآن کی شہادتوں سے اختصار کے ساتھ دکھاتے ہیں:

۲۔ اسلام، عقل کا دین ہے

کتابِ مقدس (توراۃ) کی پوری لغت پڑھ جاؤ، اُس میں کہیں "عقل" یا اُس کا ہم معنیٰ کوئی لفظ نہیں پاؤ گے، حالانکہ عقل ہی کی بنا پر خدا نے نوعِ انسانی کو تمام زندہ مخلوقات پر فضیلت بخشی ہے۔ نیز غور وفکر یا اُس کے ہم معنی الفاظ بھی نہ پاؤ گے، حالانکہ عقلِ انسانی کا اصلی کام یہی

ہے۔ یعنی یہ بھی کہیں نظر نہ آئے گا کہ دین الٰہی کا خطاب، عقل ہی سے ہے اور عقل ہی پر وہ قائم کیا گیا ہے۔ حالانکہ قرآن حکیم میں عقل اور اُس کے اسماء و افعال کا ذکر تقریباً پچاس مرتبہ ہوا ہے۔ عقلمندوں کا ذکر تیس چالیس سورتوں میں آیا ہے۔

قرآن میں عقل کا ذکر بصورت فعل زیادہ تر وہیں ہوا ہے جہاں آیاتِ الٰہی بیان کی گئی ہیں اور فرمایا گیا ہے کہ خدا کی اِن نشانیوں کے مخاطب اُن کے سمجھنے والے، اور اُن سے ہدایت پانے والے، عقلمند ہی لوگ ہیں۔ الٰہی نشانیوں سے بھی زیادہ تر مراد وہی نشانیاں ہیں جو اللہ تعالیٰ کے علم، مشئیت، حکمت، رحمت پر دلالت کرتی ہیں، جیسا کہ فرمایا:

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ	بے شک آسمانوں اور زمین کی آفرینش میں
وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ	رات اور دن کے پیچھے بعد دیگرے آنے میں
وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ	اور سمندر میں کشتیوں کا چلنا جس سے لوگوں
فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا	کو فائدہ پہنچتا ہے، اور آسمان سے خدا کا
اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ	پانی برسانا جس سے وہ زمین کو اُس کی موت
فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا	کے بعد زندہ کر دیتا ہے اور اُس نے زمین
وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّ	میں ہر قسم کے جانور پھیلا رکھے ہیں، اور ہوا
تَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ	چلانے میں، اور آسمان و زمین کے مابین ابر

وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ (۲: ۱۶۴)	کے مسخر ہونے میں عقلمندوں کے لیے نشانیاں ہیں۔

اس کے بعد اُن نشانیوں کا نمبر ہے جو کتاب الٰہی کی تشریعی آیتوں اور وصیتوں سے تعلق رکھتی ہیں، جیسا کہ سورۂ انعام کے آخر میں جامع وصیتوں کی تفصیل کے بعد فرمایا:

ذَٰلِكُمْ وَصَّاكُمْ بِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ (۶: ۱۵۱)	یہ ہے وہ جس کی خدا نے تمھیں وصیت کی ہے تاکہ تم عقل سے سمجھو۔

قرآن میں "أَفَلَا تَعْقِلُونَ" کا لفظ دس مرتبہ سے زیادہ آیا ہے جیسا کہ خدا نے اپنے رسول کو یہ حکم دیکر اپنی قوم کو بتادیں کہ یہ قرآن اخدا ہی کی طرف سے ہے نہ کہ کسی اور کی طرف سے، فرمایا:

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِنْ قَبْلِهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ (۱۰: ۱۶)	(میں) تم میں اس سے پہلے بھی ایک عمر تک رہ چکا ہے، کیا اس پر بھی تم غور نہیں کرتے۔

اور عقل کو استعمال نہ کرنے کو عذاب آخرت کا ایک سبب قرار دیا ہے، جیسا کہ سورۂ ملک میں دوزخیوں کے متعلق فرمایا:

وَقَالُوا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ أَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِي أَصْحَابِ السَّعِيرِ (۶۷: ۱۰)	اور انہوں نے کہا اگر ہم سنتے یا عقل رکھتے ہوتے تو دوزخیوں میں سے نہ ہوجاتے۔

اور اسی کے ہم معنی سورۂ اعراف کی یہ آیت ہے:

وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ	ہم نے جہنم کے لیے بہت سے جن و انس پھیلا رکھے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ دل رکھتے ہیں مگر اُن سے سمجھتے نہیں۔ آنکھیں رکھتے ہیں مگر اُن سے دیکھتے نہیں۔ کان رکھتے ہیں مگر اُن سے سنتے نہیں۔ یہ لوگ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ اُن سے بھی زیادہ گم گشتہ راہ۔ یہی لوگ غافل ہیں۔

اور سورۂ حج میں فرمایا:

أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَتَكُونَ لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ بِهَا أَوْ آذَانٌ يَسْمَعُونَ بِهَا فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَٰكِن تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ (۲۲: ۴۶)	کیا اِن لوگوں نے زمین کی سیاحی نہیں کی کہ اُن کے دل ہوتے جن سے سمجھتے یا کان ہوتے جن سے سنتے۔ یہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں مگر وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔

اِسی طرح غور و فکر، تدبّر و تأمّل پر زور دینے والی آیتیں بھی کتابِ عزیز میں بکثرت ہیں۔ اِن آیتوں کو دیکھنے والا فوراً جان لے گا کہ اِس دینِ اسلام کے ماننے والے غور و فکر، عقل و تدبّر کے لوگ ہیں، اور یہ کہ

چوپایوں کی طرح زندگی بسر کرنے والے غافلوں کا اس دین میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ بجز ظاہری رسم و رواج اور تقلیدی عادات کے جو نہ نفس کو پاک کرتی ہیں، نہ معرفت الٰہی کے ذریعہ اُسے کمال تک پہنچا سکتی ہیں چنانچہ فرمایا:

قُلْ إِنَّمَا أَعِظُكُم بِوَاحِدَةٍ أَن تَقُومُوا لِلَّهِ مَثْنَىٰ وَفُرَادَىٰ ثُمَّ تَتَفَكَّرُوا (۳۴-۴۵)	اے پیغمبر! کہو کہ میں تمھیں ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں: کھڑے ہو جاؤ اللہ کے لیے دو دو اور ایک ایک، پھر غور و فکر سے کام لو۔

اور فرمایا

أَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوا فِي أَنفُسِهِم مَّا خَلَقَ اللَّهُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا إِلَّا بِالْحَقِّ وَأَجَلٍ مُّسَمًّى (۳۰-۸)	کیا انہوں نے اپنے جی میں غور نہیں کیا کہ خدا نے آسمانوں کو اور زمین کو اور جو کچھ دونوں کے مابین ہے، ٹھیک سادھکر اور ٹھہرے ہوئے وعدے ہی پر پیدا کیا ہے۔

اور عقل و دانش رکھنے والوں کے حق میں فرمایا:

وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ (۳: ۱۹۱)	اور وہ غور کرتے ہیں آسمانوں اور زمین کی خلقت میں۔

اور یہ بتا کر کہ رسول کو نہ علم غیب حاصل ہے نہ زمین کے خزانوں میں تصرّف کا حق، اور یہ کہ رسول کا کام صرف یہ ہے کہ اپنی وحی کی پیروی

کرے، فرمایا:

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ ۚ أَفَلَا تَتَفَكَّرُونَ (۶: ۷)	اے پیغمبر، پوچھو کیا اندھا اور آنکھوں والا دونوں برابر ہیں؟ پھر تم کیوں غور نہیں کرتے؟

بعض مغربی دانشمندوں کا قول ہے، اور اِس قول کی سچائی میں کوئی ہوشمند بھی شک نہیں کر سکتا کہ انسانی ترقی کی بنیاد، غور و فکر کی عادت ہی پر ہے، اور یہ کہ غور و فکر کی کمی بیشی ہی سے انسانوں کے مرتبے کم و بیش ہوتے ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ دینی رسم و رواج اور پابندیوں نے انسان کی فکری آزادی سلب کر رکھی تھی، یہاں تک کہ اسلام آیا اور اس نے اپنی کتاب کے ذریعہ اِس ذہنی غلامی کا قلع قمع کر ڈالا۔ قرآن ہی نے انسان کو آزادی بخشی ہے۔ مغربی قوموں نے مسلمانوں ہی سے یہ عقلی آزادی حاصل کی ہے، مگر خود مسلمان الٹے پاؤں پیچھے لوٹ گئے اور اپنے آپ کو اِس آزادی سے محروم کر لیا حتیٰ کہ اب بہت سے مسلمان خود اُنہی لوگوں کی تقلید کرنے لگے ہیں جنھوں نے اُن کے بزرگوں کے ہاتھوں آزادی کی نعمت پائی تھی۔

۳۔ اسلام، علم و حکمت کا دین ہے

علم اور اُس کے مشتقات کا ذکر قرآن حکیم میں سیکڑوں جگہ

ہے۔ علم سے مقصود، دین اور دنیا کے سب علوم ہیں۔ علم مطلق کی نسبت سورۂ اسراء کی وصیتوں میں فرمایا:

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ،	اُس بات کے پیچھے نہ چلو جس کا تمھیں علم نہیں ہے۔

راغب نے اِس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ قیافہ اور گمان سے کوئی فیصلہ نہ کرو۔ بیضاوی کے قول کا خلاصہ یہ ہے کہ تقلید کی راہ سے یا یوں ہی اٹکل سے کسی ایسی بات کی پیروی نہ کرو جس کا علم تمھیں نہیں ہے۔

تاریخی علم کی نسبت فرمایا:

اِئْتُوْنِیْ بِكِتَابٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَا اَوْ اَثَارَةٍ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ (۲:۴۶)	میرے پاس لاؤ کوئی اِس سے پہلے کی کتاب یا کوئی پرانا علم، اگر تم سچے ہو۔

مادّی علوم کی نسبت فرمایا:

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ، يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غَافِلُوْنَ (۳۰: ۶ و ۷)	لیکن اکثر لوگ علم نہیں رکھتے۔ دنیاوی زندگی کا اوپری علم تو رکھتے ہیں اور آخرت سے بالکل غافل ہیں۔

اور اس بارے میں کہ انسانی علم، روح کی حقیقت تک نہیں پہنچا ہے، فرمایا:

وَيَسْئَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي وَمَا أُوتِيتُمْ مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا (۱۷: ۸۵)

اے پیغمبر، یہ لوگ آپ سے روح کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ آپ ان سے کہہ دیجیے کہ روح میرے پروردگار کے حکم سے ہے اور تمھیں کم علم دیا گیا ہے۔

اور عقلی علم کی نسبت فرمایا:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُجَادِلُ فِي اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَلَا هُدًى وَلَا كِتَابٍ مُنِيرٍ (۲۲: ۸)

اور ایسے لوگ بھی ہیں جو اللہ کے معاملے میں بغیر علم، رہنمائی، اور روشن کتاب کے بحث کرتے ہیں۔

بظاہر اس آیت میں "علم" سے مراد، علم نظری ہے، کیونکہ "هُدًى اور کتاب مُنیر" کے مقابلہ میں اُسے ذکر کیا گیا ہے جو دینی ہدایت ہے۔

اور علم طبیعی کے بارے میں فرمایا:

وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافُ أَلْسِنَتِكُمْ وَأَلْوَانِكُمْ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِلْعَالِمِينَ (۳۰: ۲۲)

اور اللہ کی نشانیوں میں سے، آسمانوں اور زمین کی پیدائش ہے، اور تمھاری زبانوں کا اور رنگوں کا اختلاف ہے۔ اس میں اہل علم کے لیے نشانیاں ہیں۔

"عالمین" سے یہاں مراد، علماء کون ہیں۔

اسی طرح یہ آیت ہے:

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللّٰهَ أَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجْنَا بِهِ ثَمَرَاتٍ مُّخْتَلِفًا أَلْوَانُهَا وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِيضٌ وَحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ أَلْوَانُهَا وَغَرَابِيبُ سُودٌ۔ وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَابِّ وَالْأَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُ كَذٰلِكَ، إِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ، إِنَّ اللّٰهَ عَزِيزٌ غَفُورٌ (۳۵: ۲۷ و ۲۸)	کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے آسمان سے پانی اتارا ہے جس سے ہم نے مختلف رنگوں کے پھل نکالے ہیں اور پہاڑ بھی طرح طرح کے ہیں، سفید، اور سرخ، رنگ برنگ کے اور تیز کالے رنگ والے، اسی طرح آدمیوں، چوپایوں اور جانوروں کے بھی رنگ مختلف ہیں۔ اور اللہ سے اُس کے عالم بندے ہی ڈرتے ہیں۔ اللہ زبردست ہے اور بڑا بخشنے والا۔

یہاں "علماء" سے مقصود وہ لوگ ہیں جو اس کائنات کے رازوں اُس کی جنسوں، قسموں، رنگوں، اور اُن میں اللہ کی نشانیوں اور حکمتوں کو سمجھتے ہیں۔

قرآن نے علم کا مرتبہ اس قدر بلند کر دیا ہے کہ اُس سے زیادہ بلند کوئی اور مرتبہ نہیں ہو سکتا، چنانچہ فرمایا:

شَهِدَ اللّٰهُ أَنَّهُ لَا إِلٰهَ | اللہ نے شہادت دی کہ اُس کے سوا کوئی

اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۳ : ۱۸)	معبود نہیں اور ملائکہ و اہل علم نے شہادت دی، اللہ عدل کے ساتھ قائم ہے، اُس عزیز و حکیم کے سوا کوئی معبود نہیں۔

اِس آیت کریمہ میں خدائے عزّ و جل نے گفتگو اپنی ذات سے شروع کی ہے۔ پھر ملائکہ کا نام لیا ہے، اور تیسرا درجہ اہل علم کو دیا ہے، جن میں انبیاء و حکماء اور اُن کے نیچے کے تمام علم والے داخل ہیں، جیسا کہ فرمایا:

يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ (۵۸ : ۱۱)	اللہ تم میں سے اُن لوگوں کے درجے بلند کر دیگا جو ایمان لائے ہیں اور جنہیں علم ملا ہے۔

اور اپنے سب سے زیادہ معزز اور سب سے زیادہ عالم رسول کو حکم دیا کہ یہ دعا مانگا کریں:

وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا	اے پیغمبر، کہو کہ پروردگار مجھے علم زیادہ دے۔

علم کی تعریف اور اُس کی ترغیب کی آیتوں کی تائید اُن آیتوں سے ہوتی ہے جو وہم و گمان کی پیروی کی مذمت میں نازل ہوئی ہیں۔ فرمایا:

وَمَا يَتَّبِعُ اَكْثَرُهُمْ	اُن میں سے اکثر گمان کی پیروی

اِلَّا ظَنًّا، اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا (۱۰: ۳۶)	کرتے ہیں۔ گمان، حق کے معاملے میں کچھ بھی سود مند نہیں۔

اسی طرح فرمایا:

وَمَا لَهُمْ بِهٖ عِلْمٌ، اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا (۵۳: ۲۷)	اُنہیں اس کا علم نہیں ہے، وہ صرف گمان کی پیروی کرتے ہیں، اور گمان، حق کے معاملے میں کچھ بھی سود مند نہیں۔

اور عیسائیوں کے اِس قول کے بارے میں کہ حضرت مسیح کو سولی دی گئی تھی، فرمایا:

مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ۔	اُن کے پاس اس کا علم نہیں، مگر گمان کی پیروی ہے۔

علم و دلیل کو قرآن نے اِتنی اہمیت دی ہے کہ شرک باللہ کی ممانعت کو بھی اِسی سے مقیّد کر دیا ہے، حالانکہ شرک سب سے بڑا گناہ اور سب سے زیادہ سنگین کفر ہے۔ فرمایا:

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ عَلَيْكُمْ	اے پیغمبر کہدیجئے کہ میرے پروردگار نے بدکاریاں حرام کر دی ہیں، کھلی ہوں یا چھپی، اور گناہ اور بغیر حق کے سرکشی حرام کر دی ہے اور یہ کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرو جس کی

سُلْطٰنًا وَّاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۔ (۷: ۳۲)	کوئی "دلیل" تم پر اتاری نہیں ہے اور یہ کہ خدا کے معاملے میں ایسی بات کہو جس کا علم نہیں رکھتے ہو۔

یہاں آیت میں لفظ "سلطان" سے مقصود، برہان اور دلیل ہے۔

والدین سے نیک سلوک کا حکم دیتے ہوئے فرمایا:

وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا وَاِنْ جَاهَدَاكَ عَلٰى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا۔ (۸،۲۹)	اور ہم نے انسان کو وصیت کی ہے کہ اپنے والدین سے نیک سلوک کرے اور اگر وہ تجھے اس بات پر مجبور کریں کہ میرے ساتھ شرک کر جس کا تجھے کوئی علم نہیں ہے، تو اُن کی اطاعت نہ کر۔

اور دین میں صاف معلوم ہو چکا ہے کہ اللہ سے شرک علم و برہان و دلیل کے ساتھ ہو نہیں سکتا، کیونکہ شرک قطعی طور پر باطل ہے۔ اس مسئلہ کی تفصیل آگے آتی ہے جہاں دلیل و حجّت کو اہمیت دی گئی اور تقلید کی مذمت کی گئی ہے

حکمت (دانائی) کی تنظیم و اہمیت کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَشَاءُ وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ (۲:۲۶۹)

جسے چاہتا ہے، حکمت بخش دیتا ہے، اور جسے حکمت ملتی ہے اُسے بہت سی بھلائی مل جاتی ہے عقل والے ہی نصیحت حاصل کرسکتے ہیں۔

خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے کیا غرض ہے؟

اسے یوں بیان فرمایا ہے:

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُبِينٍ (۶۲ : ۲)

وہ اللہ ہی ہے جس نے اَن پڑھوں میں ایک رسول اُنہی میں سے بھیجا ہے جو اُن پر اُس کی آیتیں تلاوت کرتا ہے، اُنہیں پاک کرتا، اور کتاب وحکمت سکھاتا ہے، اگرچہ وہ پہلے کھلی ہوئی گمراہی میں تھے۔

بقرہ اور آلِ عمران میں اسی کے ہم معنیٰ دو آیتیں اور موجود ہیں۔

اور اپنے رسول پر احسان جتاتے ہوئے فرمایا:

وَأَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكَ عَظِيمًا (۴ : ۱۱۲)

اور تجھ پر کتاب وحکمت اُتاری اور تجھے وہ علم دیا جو تو نہ جانتا تھا اور تجھ پر خدا کا فضل بہت بڑا ہے۔

اور فرمایا:

اپنے پروردگار کی راہ کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ بلاؤ۔	اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ (۱۶:۱۲۵)

بنیادی نیکیوں کی وصیت اور بڑی بڑی برائیوں سے ممانعت کرکے آخر میں فرمایا:

یہ وہ حکمت ہے جو تیرے پروردگار کی طرف سے تجھ پر وحی کی گئی ہے۔	ذٰلِکَ مِمَّا اَوْحٰی اِلَیْکَ رَبُّکَ مِنَ الْحِکْمَةِ (۱۷:۳۹)

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات سے فرمایا:

اور یاد کرو کہ تمھارے گھروں میں اللہ کی آیتوں اور حکمت کی تلاوت کی جاتی ہے۔	وَاذْکُرْنَ مَا یُتْلٰی فِیْ بُیُوْتِکُنَّ مِنْ اٰیَاتِ اللّٰہِ وَالْحِکْمَةِ (۳۳:۳۴)

خدا نے اپنے نبیوں اور رسولوں کو حکمت بخشی تھی، لیکن بعد میں اُن کی قوموں نے تقلید اختیار کرکے اور مذہبی پیشوائی قائم کرکے اُسے کھو دیا۔ پولس نے تو حکمت کو عیسائیت سے نصِّ صریح کے ساتھ دور کر دیا ہے۔ یہودیوں کے بارے میں خدا فرماتا ہے:

کیا وہ اس وجہ سے لوگوں پر حسد کرتے ہیں کہ خدا نے انہیں اپنا فضل بخشا ہے، تو ہم ابراہیم کو کتاب و حکمت دے چکے اور خود اُنہیں بڑی بادشاہی بخش چکے تھے۔	اَمْ یَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰی مَا اٰتٰهُمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ. فَقَدْ اٰتَیْنَا اٰلَ اِبْرَاهِیْمَ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَةَ وَ اٰتَیْنٰهُمْ مُّلْکًا عَظِیْمًا (۴:۵۴)

اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ کی اپنے بندوں پر سب سے بڑی نعمت "کتاب" ہے۔ اس کے بعد "حکمت" ہے، اور اس کے بعد "مُلک" (یعنی حکمرانی) ہے۔

اپنے پیغمبر داؤد علیہ السلام کی نسبت فرمایا:

وَآتَاهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهُ مِمَّا يَشَاءُ (۲: ۲۵۱)	خدا نے اسے علم و حکمت دی اور وہ علم دیا جو دینا چاہا۔

اور اپنے پیغمبر عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت فرمایا:

وَإِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرَاةَ وَالْإِنْجِيلَ (۵: ۱۱۰)	اور میں نے تجھے کتاب، حکمت، توراۃ، اور انجیل سکھا دی۔

اور فرمایا:

وَلَقَدْ آتَيْنَا لُقْمَانَ الْحِكْمَةَ (۳۱: ۱۲)	اور ہم نے لقمان کو حکمت دی۔

اور لقمان کی اس وصیت کا ذکر کیا ہے جو انہوں نے اپنے بیٹے کو کی تھی جس میں نیکی اختیار کرنے اور برائی سے بچنے کی ہدایت کی ہے اور دونوں کا نفع نقصان بھی بیان کر دیا ہے۔ بنابریں حکمت، علم سے خاص ہے۔ حکمت، کسی چیز کے ایسے علم کا نام ہے جو اس کی حقیقت کو بھی حاوی ہو۔ جس میں اس کے نفع نقصان کی بھی آگاہی ہو۔ یعنی حکمت، عملی فلسفہ ہے۔ جیسے علم النفس، علم اخلاق، علم اسرار کائنات۔ چنانچہ سورۂ اسراء میں جو

وصیتیں فرمائی ہیں۔ اُن کے آخر میں ارشاد ہوا ہے " ذلک مما اوحی الیک ربک من الحکمۃ " (یہ اُس حکمت میں سے ہے جس کی وحی پروردگار نے تجھ پر کی ہے) اگر ان وصیتوں کے ساتھ اُن کے فائدے اور علتیں بھی بیان نہ کردی جاتیں، تو اُنہیں "حکمت" نہ کہا جاتا۔ دیکھو، قرآن نے مُسرفوں کو " اخوان الشیاطین " کہا ہے، کیونکہ وہ اپنے اسراف سے معیشت کا نظام خراب کردیتے ہیں، اور خدا کی نعمت کو برباد کر کے کفرانِ نعمت کرتے ہیں۔ اِسی لیے مُسرفوں کا یہ نام رکھکر فرمایا " وَکَانَ الشَّیْطَانُ لِرَبِّهٖ کَفُوْرًا " (اور شیطان اپنے پروردگار کا سخت ناشکر گزار ہے) پھر فرمایا:

وَلَا تَجْعَلْ یَدَکَ مَغْلُوْلَةً اِلٰی عُنُقِکَ وَلَا تَبْسُطْهَا کُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا (۲۹)	نہ اپنے ہاتھ کو بالکل سمیٹ لو نہ بالکل کھول ہی دو کہ ملامت کیے ہوئے اور ہارے ہوئے بن کر بیٹھنا پڑے۔

اِس آیت میں اسراف کا نقصان یہ بتایا ہے کہ مُسرف کا حشر یہ ہوتا ہے کہ لوگ اُسے ملامت کرتے ہیں اور وہ خود اپنے دل میں رنجیدہ ہوتا ہے۔ لغت میں " محسور " وہ ہے جس کا پردہ اٹھ جائے۔ جس کی قوت چلی جائے اور جس کی کمزوری ظاہر ہو جائے۔ نیز مغموم کو بھی کہتے ہیں اور یہ تمام معانی، اُس آدمی پر منطبق ہوتے ہیں جو فضول خرچ بنکر فقر وفاقہ اور دوسری پریشانیوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

قرآن میں "فقہ" کا ذکر کئی جگہ آیا ہے اور اس سے مقصود، حقائق کا وہ باریک فہم ہے جس کی وجہ سے عالم حکیم بن جاتا ہے۔

اسلام، دین حجت و برہان ہے

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ بُرْهَانٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ نُورًا مُبِينًا (۴: ۱۷۴)

اے لوگو، تمھارے پروردگار کی طرف سے تمھارے پاس برہان آئی ہے اور ہم نے تمھاری طرف روشن نور اتارا ہے۔

اور فرمایا:

وَمَنْ يَدْعُ مَعَ اللَّهِ إِلَٰهًا آخَرَ لَا بُرْهَانَ لَهُ بِهِ فَإِنَّمَا حِسَابُهُ عِنْدَ رَبِّهِ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الْكَافِرُونَ (۲۳: ۱۱۷)

جو کوئی خدا کے سوا دوسرے معبود کو پکارے جس کی وہ اپنے پروردگار کے پاس کوئی دلیل نہیں رکھتا ہے تو اس کا حساب پروردگار ہی کے پاس ہے جو کافروں کو شاد کام نہیں کرتا۔

اس آیت میں شرک کی وعید کو اس بات سے مقید کیا گیا ہے کہ مشرک کے پاس اپنے شرک کے لیے کوئی ایسی دلیل و برہان نہیں ہے جسے اپنے پروردگار کے سامنے پیش کر سکے، اور معلوم ہے کہ شرک کی سرے سے کوئی برہان موجود ہی نہیں ہے، لیکن اس کے باوجود محض

برہان کی اہمیت بڑھانے کے لیے اس طرح فرمایا ہے۔

قیامت کے دن یہ ہوگا کہ خدا قوموں کو اُن کے پیغمبروں اور پیغمبروں کے جانشینوں کے ساتھ اٹھائے گا اور ان کی موجودگی میں گمراہوں سے مطالبہ کرے گا کہ تم نے اپنے رہبروں کی جو کچھ مخالفت کی ہے، اُس کی دلیل پیش کرو۔ چنانچہ فرمایا:

وَنَزَعْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ شَهِيدًا فَقُلْنَا هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ فَعَلِمُوا أَنَّ الْحَقَّ لِلَّهِ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَفْتَرُونَ۔ (۲۸: ۷۵)	اور ہم نکالیں گے ہر قوم میں سے ایک شہادت دینے والا پھر اُس قوم سے کہیں گے لاؤ اپنی دلیل۔ اُس وقت اِن لوگوں کو معلوم ہوجائے گا کہ حق سراسر اللہ ہی کے لیے ہے اور گم ہوجائینگی اُن سے اُن کی تمام افتراپردازی۔

اور سورۂ انبیاء میں آسمان و زمین کا ذکر کر کے شرک کے بطلان پر یہ عقلی دلیل قائم کی ہے:

لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا (۲۱: ۲۲)	اگر آسمان اور زمین میں خدا کے سوا کئی معبود ہوتے تو اُن میں فساد پڑجاتا۔

اِس کے بعد مشرکوں سے مطالبہ کیا ہے کہ اُنہوں نے اپنے لیے جو معبود بنا رکھے ہیں اُن کی حقانیت کی دلیل پیش کریں:

أَمِ اتَّخَذُوا مِن دُونِهِ آلِهَةً ۖ قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ ۖ هَٰذَا ذِكْرُ مَن مَّعِيَ وَذِكْرُ مَن قَبْلِي ۗ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ الْحَقَّ ۖ فَهُم مُّعْرِضُونَ۔ (۲۱: ۲۴)	کیا خدا کو چھوڑ کر انھوں نے اپنے معبود قرار دیے ہیں؟ اے پیغمبر، اُن سے کہو کہ لاؤ اپنی دلیلیں (اور کہو) یہی بات ہے میرے ساتھ والوں کی اور مجھ سے پہلے کے لوگوں کی۔ واقعہ یہ ہے کہ ان گمراہوں میں سے اکثر حق کو نہیں جانتے، اس لیے روگرداں ہو گیے ہیں۔

اسی طرح سورۂ نحل میں فرمایا:

أَمَّن يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ وَمَن يَرْزُقُكُم مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ ۗ أَإِلَٰهٌ مَّعَ اللَّهِ ۚ قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ (۲۷: ۶۴)	کون آفرینش کا آغاز کرتا پھر اُسے لوٹاتا ہے۔ کون تمھیں آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے؟ کیا خدا کے سوا بھی کوئی معبود ہے؟ اے پیغمبر، ان سے کہو کہ اپنی دلیل لاؤ اگر تم سچے ہو!

اپنی قوم کے مقابلہ میں حضرت ابراہیم کی حجت کا تذکرہ کرکے اور شرک کے بطلان پر علمی دلائل پیش کرکے فرمایا:

وَكَيْفَ أَخَافُ مَا أَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُونَ أَنَّكُمْ أَشْرَكْتُم بِاللَّهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِ عَلَيْكُمْ سُلْطَانًا	میں کیونکر اُس چیز سے ڈر سکتا ہوں جسے تم شریک بناتے ہو، مگر تم خود اس بات سے نہیں ڈرتے کہ خدا کے ساتھ اُسے شریک بنا چکے

فَاَیُّ الْفَرِیْقَیْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔ (۶: ۸۱)	ہو جس کی اُس نے کوئی دلیل نہیں اُتاری اگر علم رکھتے ہو تو بتاؤ ہم دونوں میں سے کون فریق بے خوفی کا زیادہ حقدار ہے؟

اِسی بیان کے آخر میں ارشاد ہوتا ہے:

وَتِلْکَ حُجَّتُنَا آتَیْنَاهَا اِبْرَاهِیْمَ عَلٰی قَوْمِهٖ نَرْفَعُ دَرَجَاتٍ مَّنْ نَّشَاءُ اِنَّ رَبَّکَ حَکِیْمٌ عَلِیْمٌ (۸۳)	یہ ہماری حجت ہے جو ہم نے ابراہیم کو اُن کی قوم کے مقابلے میں دی تھی۔ ہم جس کے درجے چاہتے ہیں بلند کر دیتے ہیں۔ تیرا پروردگار علم و حکمت والا ہے۔

یہاں "درجات" سے مراد حجت و برہان عقلی کے درجے ہیں جو خدا اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے بخش دیتا ہے۔

برہان کو کئی جگہ "سلطان" (قوت و اقتدار) کہا گیا ہے، چنانچہ فرمایا:

اَلَّذِیْنَ یُجَادِلُوْنَ فِیْ آیَاتِ اللّٰهِ بِغَیْرِ سُلْطَانٍ اَتَاهُمْ کَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ الَّذِیْنَ آمَنُوْا، کَذٰلِکَ یَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰی کُلِّ قَلْبِ مُتَکَبِّرٍ جَبَّارٍ (۴۰: ۳۵)	یہ لوگ اللہ کی نشانیوں میں بغیر حجت و دلیل کے جھگڑتے ہیں۔ یہ بات اللہ کے نزدیک اور مومنوں کے نزدیک بڑی ہے اسی طرح خدا ہر متکبر جبار دل پر مہر لگا دیتا ہے

اسی معنیٰ میں ایک اور آیت اسی سورۃ میں موجود ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ یُجَادِلُوْنَ فِیْٓ اٰیٰتِ اللّٰہِ بِغَیْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰھُمْ اِنْ فِیْ صُدُوْرِھِمْ اِلَّا کِبْرٌ مَّا ھُمْ بِبَالِغِیْہِ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ اِنَّہٗ ھُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ (۵۶)	جو لوگ اللہ کی نشانیوں میں بغیر حجت و دلیل کے جھگڑتے ہیں، اُن کے سینوں میں تکبر ہی ہے۔ وہ اُس تک پہنچنے والے نہیں، لہذا پناہ مانگو خدا سے وہ سمیع و بصیر ہے۔

دوسری کئی سورتوں میں فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو فرعون کے پاس اپنی نشانیوں اور "سلطان مبین" کے ساتھ بھیجا تھا۔

اسلام، قلب وضمیر کا دین ہے

فیوّمی نے اپنی کتاب "المصباح" میں کہا ہے "انسان کا ضمیر، اُس کا قلب و باطن ہے۔ اور کبھی عقل کے معنیٰ میں بھی بولا جاتا ہے، ہم اس لفظ کے معانی اور طرقِ استعمال آیۂ اعراف کی تفسیر میں بیان کر چکے ہیں (دیکھو صفحہ ۲۱۹ تفسیر جلد ۹)

قرآن میں یہ لفظ ایک سو سے زیادہ آیتوں میں وارد ہوا ہے۔

چنانچہ سورۂ قاف میں فرمایا:

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَذِکْرٰی	اس میں سمجھ کی بات ہے اُس کے لیے

لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ (۵۰-۳۶)	جو دل رکھتا ہے یا متوجہ ہو کر کان لگائے۔

اور سورۂ شعراء میں فرمایا:

يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ۔	اُس دن نہ مال کام آئے گا نہ اولاد، لیکن جو شخص خدا کے پاس قلب سلیم کے ساتھ پہنچے۔

اور ابراہیم خلیل علیہ السلام کی تعریف میں فرمایا:

اِذْ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ۔	جب وہ اپنے پروردگار کے پاس قلب سلیم کے ساتھ آیا۔

اور اُنہی کا یہ قول نقل فرمایا ہے:

وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِىْ	لیکن اِس لیے کہ میرے قلب کو اطمینان ہو۔

مومنین کے وصف میں فرمایا:

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ۔	جو لوگ ایمان لائے اور اُن کے دل ذکر الٰہی سے مطمئن ہوتے ہیں، بے شک ذکر الٰہی سے ہی دلوں کو اطمینان ہوتا ہے۔

اور حضرت عیسٰی علیہ السلام کے متبعین کے حال میں فرمایا:

وَجَعَلْنَا فِىْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً	ان کے پیروؤں کے دلوں میں ہم نے رحم اور ترس ڈال دیا اور رہبانیت جسے

وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا۔ | اُنہوں نے ایجاد کر لیا ہے۔

مومنین کے قلوب کی یہ صفت بیان کی ہے کہ اُن میں خشوع و خضوع ہوتا ہے۔ برائیوں سے پاک ہوتے ہیں، مگر کافروں اور منافقوں کے قلوب میں گندگی، بیماری، بے رحمی، کجی ہوتی ہے۔ حق اور بھلائی کی استعداد سے اُن کی محرومی کو اس پیرایہ میں بیان کیا ہے کہ اُن پر مُہریں لگادی گئی ہیں لہذا اُن میں کوئی نئی چیز داخل ہی نہیں ہوتی۔

چونکہ اسلام، عقل و دلیل، اور آزادی ضمیر کا دین ہے، اس لیے اُس نے عیسائیوں اور دوسرے لوگوں کے اس طرزِ عمل سے منع کر دیا کہ دین کے معاملہ میں زبردستی کی جائے۔ غیر مذہب والوں کو ستایا جائے۔ اس بارے میں بکثرت آیات نازل ہوئیں جنہیں ہم نے اُن کے مناسب مقام پر بیان کر دیا ہے۔ اور اس دینی آزادی کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ قرآن نے تقلید کی مذمت کی اور مقلّدوں کو گمراہ بتایا ہے۔

تقلید اور بزرگوں کے راستہ پر جمود

علم، استقلالِ عقل و فکر، اور ضمیر کی آزادی کی تعریف میں جو آیتیں نازل ہوئی ہیں، تقلید کی مذمت پر بھی دلالت کرتی ہیں۔ پھر خود تقلید اور مقلّدوں کی مذمت میں بھی بہت سی آیتیں قرآن میں موجود ہیں۔ مثلاً فرمایا:

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا ۗ أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ

(۲: ۱۷۰)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خدا نے جو ہدایت اتاری ہے، اُسے مانو، تو جواب دیتے ہیں کہ ہم تو اُسی پر چلیں گے جس پر اپنے باپ دادا کو پاتے ہیں۔ اگرچہ اُن کے باپ دادا کچھ سمجھ بوجھ نہ رکھتے ہوں تو بھی انہی کی راہ پر چلیں گے۔

اور فرمایا:

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَىٰ مَا أَنزَلَ اللَّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ قَالُوا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا ۚ أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ (۵: ۱۰۴)

اور جب اِن سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی اتاری ہوئی ہدایت اور رسول کی طرف آؤ، تو کہتے ہیں ہمارے لیے وہ کافی ہے جس پر ہم نے اپنے بزرگوں کو پایا ہے، اگرچہ اُن کے بزرگ نہ کچھ جانتے ہوں نہ ہدایت پر ہوں؟

قرآن نے تقلید والوں کی مذمت دو لحاظوں سے کی ہے: ایک یہ کہ وہ اپنے آباء و اجداد کے طریقے پر جم کر رہ گیے ہیں اور علم و عمل کی ترقی پر اپنے جمود کو ترجیح دیتے ہیں، حالانکہ یہ بات زندہ و عاقل انسان کی شان سے بعید ہے، کیونکہ زندگی ہمیشہ نمو اور تولید کا تقاضہ کرتی ہے۔ عقل، تجدید و مزید کو طلب کرتی ہے۔ دوسرے یہ کہ ان لوگوں نے باپ دادا کی

اندھی تقلید کرکے اپنے آپ کو انسانیت کے امتیاز سے محروم کر لیا ہے، اور انسان کا امتیاز یہ ہے کہ حق و باطل، خیر و شر، حُسن و قُبح میں عقل و علم کی راہ سے تمیز کرتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

وَاِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَا آبَاءَنَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا، قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ، اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۔ (۷: ۲۸)

جب کوئی بدکاری کرتے ہیں تو کہتے ہیں ہم نے اپنے بزرگوں کو ایسا ہی کرتے پایا ہے اور خدا نے ہمیں یہی حکم دیا ہے۔ اے پیغمبر کہہ دیجئے کہ خدا بدکاری کا حکم نہیں دیتا۔ کیا تم خدا پر وہ بات کہتے ہو جس کا علم نہیں رکھتے۔

عرب، فرشتوں کی پرستش کرتے تھے۔ اُن کے بارے میں فرمایا:

وَقَالُوْا لَوْ شَاءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنَاهُمْ، مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ۔ اَمْ آتَيْنَاهُمْ كِتَابًا مِّنْ قَبْلِهٖ فَهُمْ بِهٖ مُسْتَمْسِكُوْنَ۔ بَلْ قَالُوْا اِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلٰى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰى آثَارِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ۔ وَكَذٰلِكَ مَا اَرْسَلْنَا مِنْ

اگر رحمان چاہتا تو ہم اُن کی پرستش نہ کرتے۔ اِن لوگوں کو اِس بات کا کوئی علم نہیں ہے۔ یہ لوگ محض اٹکل پچّو کہتے ہیں۔ کیا ہم نے انہیں اس سے پہلے کوئی کتاب دی ہے جس پر یہ جمے ہوئے ہیں۔ نہیں بلکہ کہتے ہیں ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک راہ پر پایا ہے اور ہم انہی کے نقش قدم پر چلنے والے ہیں۔ اسی طرح ہم نے اے پیغمبر، تم سے پہلے جب جب

قَبْلِكَ فِي قَرْيَةٍ مِّن نَّذِيرٍ إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوهَا إِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلَىٰ أُمَّةٍ وَإِنَّا عَلَىٰ آثَارِهِم مُّقْتَدُونَ (۴۳: ۲۰ تا ۲۳)

کوئی پیغمبر کسی آبادی میں بھیجا تو وہاں کے آسودہ لوگوں نے یہی کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک راہ پر پایا ہے اور ہم انہی کے نقش قدم کی پیروی کرنیوالے ہیں۔

اسی طرح کی آیتیں سورۂ انبیاء، شعراء، صافّات میں حضرت ابراہیم اور اُن کی قوم کے قصہ میں وارد ہوئی ہیں۔

پس قرآن ہی نے آکر تمام سابق مذہبوں اور دینوں کے ماننے والوں کو دعوت دی کہ دین کے علم و ہدایت تک پہنچنے کے لیے اپنے ضمیر کے ساتھ اپنی عقل کو بھی کام میں لائیں۔ آباء و اجداد کی چھوڑی ہوئی میراث پر جمے بیٹھے نہ رہیں، کیونکہ یہ جمود، انسانی فطرت، عقل و فکر، اور دل سب ہی پر ظلم ہے۔ اسی علم و ہدایت کی وجہ سے اسلام نے تمام دینوں میں امتیاز حاصل کر لیا تھا اور اسی کشش سے تمام قوموں کے عقلاء جوق جوق اس دین میں داخل ہونے لگے تھے، مگر خود مسلمان بعد میں اد ندھے ہو گیے۔ اگلی قوموں کی طرح خود بھی باپ دادا اور اپنے بعض اماموں کی طرف منسوب مشائخ کی تقلید کرنے لگے، حالانکہ ان اماموں نے تقلید سے منع کیا ہے اور ہرگز اس کی اجازت نہیں دی۔ اس حرکت سے مسلمانوں نے اس حجتِ الٰہی کو باطل کر دیا ہے جو سب قوموں پر قائم ہو چکی تھی اور

خود اپنے دین کے خلاف ایک حجت بن کر رہ گیے۔ بلکہ اب حالت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ رسمی علم کے مدّعی ہر اُس شخص کی سختی سے مذمت و مخالفت کرتے ہیں جو مسلمانوں کو کتاب اللہ کی پیروی، رسول اللہ کی ہدایت اور سلف صالحین کی سیرت کی طرف انہیں دعوت دے۔ ہم اِن لوگوں کے ہاتھوں سختیاں جھیل رہے ہیں۔ جہل وجمود کی راہ سے آنے والے تمسخر، طعنہ زنی، اور بدکلامی کا شکار بنے ہوئے ہیں۔ ہم پر پھبتی کسی جاتی ہے کہ یہ حضرت "مجتہد" ہیں، وہ لقب جسے جہل نے بعض قدیم علماء کے لیے مخصوص کر دیا ہے اور اب کسی اور کو مل ہی نہیں سکتا!

اگر ہم میں ایسے علماء کی کثرت ہوتی جو اسلام کو اُس کی حقیقی علمی وعقلی صورت میں پیش کر سکتے تو اِس زمانہ کے آزاد خیال لوگ بھی اُس میں جوق جوق داخل ہونے لگتے اور وہ ساری دنیا میں پھیل جاتا، کیونکہ فرنگی ممالک اور اُن کے مقلد مشرقی ملکوں کے مدرسوں میں جو تعلیم دی جا رہی ہے اُس کی بنیاد آزاد خیالی پر اور عقل و دلیل پر ہے، لیکن یہ آزاد خیال قومیں تمام دینوں کو تقلید ہی دیکھتی اور انہیں صرف اخلاقی اور اجتماعی نظام باقی ہیں، اس لیے [illegible] کر اپنے ہی دین کی پیروی کر کے اپنے اخلاقی نظام کو برقرار [illegible] ثابت کرنا بہت مشکل ہو گیا ہے کہ تمام [illegible] کیونکہ ہم میں ایسے لوگوں کی کمی ہے جو

اسلام کو اُس کی اُس صورت میں پیش کر سکتے ہیں جو قرآن نے اُسے بخشی ہے اور جس کا بیان، خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت، خلفاء راشدین اور سلف صالحین رضی اللہ عنہم اجمعین کی سیرت سے ہو چکا ہے۔

ایک شبہہ کا ازالہ

بعض مقلدوں کا خیال ہے کہ کتاب وسنت سے ہدایت حاصل کرنے اور اُن کے فہم میں استقلال فکری کی طرف مسلمانوں کو دعوت دینے میں رسالہ "المنار" نے اِس زمانہ میں جو شہرت حاصل کی ہے، اُس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ بعض جاہلوں کو شریعت میں اجتہاد کے دعوے، آئمہ کی تقلید سے گریز، ائمہ پر اور اُن کے پیروؤں پر اعتراض کی جرأت پیدا ہو گئی ہے، جو ایک بالکل نئی بدعت ہے اور تقلید کی جگہ بے راہ روی کی مصیبت ہے لیکن یہ سراسر وہم ہے اور دین کے ساتھ تاریخ سے بھی جہل کا نتیجہ ہے، کیونکہ بدعت والحاد کے مذہب بہت پرانے ہیں۔ خود خیر القرون اور سب سے بڑے امام کے زمانہ میں اِس فتنہ کے سینگ نکل چکے تھے، اِن بدعتی مذہبوں میں دین کو سب سے زیادہ خراب کرنے والا وہ مذہب تھا جس نے معصوم اماموں کی پیروی کی دعوت دی اور کہا کہ اِن کی فرماں برداری واجب ہے اور اِن سے کسی دلیل کا مطالبہ نہیں کیا جا سکتا۔ حالانکہ ائمۂ اہل سنت کا یہ مسلک نہ تھا۔ وہ دین میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی خاص شخص کی بھی

محض اُس کی ذات کی وجہ سے پیروی کو حرام قرار دیتے تھے، کیونکہ صرف خدا کا رسول ہی معصوم ہے اور اُس کے سوا کوئی انسان بھی معصوم نہیں ہے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ جن اماموں نے تقلید کو حرام ٹھہرایا تھا اُنہی کے پیروؤں نے اُن لوگوں کی روش اختیار کر لی جو اپنے اماموں کو معصوم بتاتے ہیں، حتیٰ کہ باطنی ملحدوں کی روش پر بھی یہ لوگ بے تکلف چل پڑے ہیں، چنانچہ یہ لوگ اپنے اماموں کے اقوال کے مقابلہ میں بلکہ اُن کی طرف نسبت رکھنے والے مدّعیان علم کے مقابلہ میں بھی کتاب و سنت کی نصوص مسترد کر دیتے ہیں۔

یاد رکھنا چاہیے کہ بدعتوں کی قدر صرف تقلید ہی کے بازار میں ہو سکتی ہے نہ کہ آزاد خیالی اور دلائل کے بازار میں۔ تقلید ہی کے دروازے سے مسلمانوں میں اکثر خرافات آئی ہیں، کیونکہ صوفیت وغیرہ کا روپ بھرنے والے تمام دجّال، مجتہد ائمہ ہی کی طرف منسوب ہیں، حالانکہ وہ اس نسبت میں سراسر جھوٹے ہیں، اور ہم لوگ جو علم صحیح اور کتاب و سنت سے ہدایت حاصل کرنے کی دعوت دیتے ہیں، اُن سے زیادہ ائمہ کی پیروی کے حقدار ہیں۔

ائمہ کی طرف نسبت رکھنے والوں کی کتبِ تفسیر، فقہ، تصوّف، اور شروحِ احادیث میں بہت سی ایسی بدعتیں اور خرافات پائی جاتی ہیں

جن سے ہدایت کے امام بری ہیں، لیکن چونکہ ان کتابوں میں یہ چیزیں درج ہیں، اِس لیے جامد اور نام نہاد علماء اُن کا مشروع اور جائز ہونا ثابت کرتے اور انہی کی بنا پر کتاب الہی اور سنت صحیحہ کی نصوص مسترد کر دیتے ہیں۔ خدا کے فضل و احسان سے مصر میں صرف "المنار" کا مُدیر ہی ایک ایسا شخص ہے جو ان لوگوں کو، بابیوں کو، بہائیوں کو، قادیانیوں کو، تیجانیوں کو، قبوریوں کو، اور اِس زمانہ کے تمام بدعتیوں کو جواب دیتا رہا ہے۔

زور و جبر کی جگہ شخصی آزادی

یہ اسلام کی اُن خصوصیتوں میں سے ایک خصوصیت ہے جن کی بنا پر ہم بتا چکے ہیں کہ وہ دینِ فطرت ہے۔ دین کے معاملہ میں زبردستی کی ممانعت اِس آیت کریمہ سے نکلتی ہے جو مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے نازل ہوئی تھی:

وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَآمَنَ مَنْ فِي الْأَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيعًا، أَفَأَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتَّىٰ يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَنْ تُؤْمِنَ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ قُلِ انْظُرُوا

اگر خدا چاہتا تو زمین پر رہنے والے تمام لوگ ایمان لے آتے۔ اے پیغمبر کیا تو لوگوں کو مجبور کریگا کہ زبردستی ایمان لے آئیں؟ کوئی بھی حکم الہی کے بغیر ایمان نہیں لاسکتا اور خدا اُن لوگوں پر گندگی ڈال دیگا جو عقل سے کام نہیں لیتے۔ اے پیغمبر، کہہ دیجئے کہ لوگو،

مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، وَمَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ (۱۰: ۹۹ تا ۱۰۱)	دیکھو آسمانوں میں اور زمین میں کیا ہے۔ دگر، نشانیاں اور تنبیہیں اُن لوگوں کے لیے سودمند نہیں جو ایمان نہیں رکھتے۔

ان آیات میں خدا نے اپنے رسول کو بتایا ہے کہ اُس کی محکم سنتوں کا تقاضا یہی ہے کہ دین کے سمجھنے میں انسانوں کی عقل اور سمجھ مختلف ہو، اُسے ثابت کرنے والی نشانیوں میں اُن کی نگاہیں یکساں نہ ہوں، لہذا یہ قدرتی سے ہے کہ بعض لوگ ایمان لائیں اور بعض کفر کریں۔ بنابریں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا آرزو کرنا کہ سب آدمی ایمان لے آئیں، مشیئت الہی کے خلاف ہے جس کا مقتضیٰ یہی ہے کہ ایمان کی استعداد انسانوں میں کم وبیش ہو، کیونکہ استعداد کا دارومدار اِس پر ہے کہ لوگ آیاتِ الہی کے فہم میں اپنی عقلیں استعمال کریں، اور دین کی ہدایت کو کفر کی گمراہی سے الگ کرسکیں۔

پھر جب یہودی قبیلہ بنو نضیر، حجاز سے جلا وطن ہونے لگا اور صحابہ نے چاہا کہ اپنے اُن لوگوں کو اُس سے چھین لیں جو یہودی بن چکے تھے تو یہ آیت نازل ہوئی:

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ	دین کے معاملے میں زبردستی نہیں ہے، ہدایت گمراہی سے الگ ہوچکی ہے۔ جس شخص نے شیطان کا انکار کیا اور اللہ پر ایمان لایا تو اُس نے بہت

فَقَدِ اسْتَمْسَکَ بِالْعُرْوَۃِ الْوُثْقٰی لَا انْفِصَامَ لَھَا وَاللّٰہُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ (۲:۲۵۶)	مضبوط حلقہ تھام لیا ہے جسے کسی طرح شکستگی نہیں۔ اللہ خوب سننے والا جاننے والا ہے۔

اس آیت کے نازل ہونے پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو حکم دیا کہ اپنے رشتہ داروں کو اختیار دیدیں۔ چنانچہ انہیں اختیار دے دیا گیا جس نے یہودیت پسند کی، یہودیوں کے ساتھ جلا وطن ہو گیا جس نے اسلام منظور کیا، مسلمانوں کے ساتھ رہ گیا۔ کسی کو اسلام لانے پر مجبور نہیں کیا گیا جیسا کہ ہم تفسیر میں بیان کر چکے ہیں۔

دین کے بارے میں لوگوں کو تکلیفیں دینا اور تکلیفیں دیکر انہیں مجبور کرنا کہ اپنے دین سے باز آجائیں، تو اسلام میں جنگ کے مشروع ہونے کا پہلا سبب یہی بنا، جیسا کہ ہم اپنی تفسیر میں ذیل کی آیتوں کے سلسلہ میں بتا چکے ہیں:

وَقَاتِلُوھُمْ حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَۃٌ وَّیَکُوْنَ الدِّیْنُ لِلّٰہِ، فَاِنِ انْتَھَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَی الظّٰلِمِیْنَ (۲:۱۹۳)	کافروں سے جنگ کرو یہاں تک کہ دین کے معاملے میں زبردستی باقی نہ رہے اور دین کا معاملہ اللہ ہی کے لیے ہو جائے۔ اگر وہ ایسا کرنے سے باز آجائیں تو نا منصفوں کے علاوہ کسی پہ سختی نہیں ہوا کرتی۔
وَقَاتِلُوھُمْ حَتّٰی لَا تَکُوْنَ	کافروں سے جنگ کرو یہاں تک کہ دین کے

فِتْنَةٌ وَّيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلّٰهِ فَإِنِ انْتَهَوْا فَإِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُونَ بَصِيرٌ (۸: ۳۹)	معاملے میں زبردستی باقی نہ رہے اور دین کا سارا معاملہ اللہ ہی کے لیے ہو جائے۔ اگر وہ باز آجائیں تو اللہ ان کے عملوں سے واقف ہے۔

اسی قدر نہیں بلکہ اسلام میں دینی سرداری بھی ممنوع ہے جو عیسائیوں میں پائی جاتی ہے۔ اس بارے میں قرآن کی آیتیں صاف ہیں، اور یہ معاملہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفاء راشدین کی سیرت سے بھی پوری طرح ظاہر ہو جاتا ہے۔ اس کی تشریح ہم نے پیغمبروں کے فرائض کے بیان میں کردی ہے۔ یہاں اشارے کے طور پر صرف ایک ہی آیت کافی ہے جس میں خدا اپنے رسول برحق سے فرماتا ہے:

فَذَكِّرْ إِنَّمَا أَنْتَ مُذَكِّرٌ لَّسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُسَيْطِرٍ (۸۸: ۲۱، ۲۲)	اے پیغمبر تم لوگوں کو سمجھاؤ، کہ تمھارا کام یہی سمجھانا ہے۔ تم کسی پر افسر نہیں ہو۔

قرآن کا چوتھا مقصد

اجتماعی و سیاسی اصلاح جن آٹھ وحدتوں سے پوری ہوتی ہے وہ حسب ذیل ہیں:

قوم کی وحدت۔ نسل انسانی کی وحدت۔ دین کی وحدت۔ انصاف میں مساوات کے ذریعہ قانون کی

وحدت۔ روحانی اخوت اور عبادت میں مساوات کی
وحدت۔ سیاسی لحاظ سے حکومت کی قومی وحدت۔
عدالت کی وحدت۔ زبان کی وحدت۔

اسلام نے آکر دیکھا کہ انسان مختلف قومیتوں میں منقسم ہیں حسب ونسب، رنگ، زبان، وطن، دین، مذہب، قبیلہ، حکومت، اور سیاست میں باہم ایک دوسرے کے مخالف و دشمن ہیں۔ انہی اختلافوں کی وجہ سے آپس میں کشت و خون کرتے ہیں۔ اسلام نے یہ دیکھا تو زور سے چلا کر اس فساد سے منع کیا۔ تمام آدمیوں کو عام جامع انسانی وحدت کی طرف بُلایا۔ اس وحدت کو اُن پر فرض کر دیا۔ اختلاف اور پھوٹ سے روکا اور اِس چیز کو حرام قرار دے دیا۔

اس پھوٹ کے نقصان تاریخی شہادتوں سے بیان کرنے اور انسانی وحدت و اجتماع کے بارے میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے نصوص پیش کرنے کے لیے ضخیم کتاب کی ضرورت ہے۔ مجبوراً اس کتاب میں نہایت اختصار کے ساتھ ہم صرف جامع اصول ہی بیان کرنے پر اکتفا کرتے ہیں، وہ اصول جن کے ذریعہ تمام انسان ایک ہی قوم، ایک ہی دین، ایک ہی شریعت ایک ہی حکومت، ایک ہی زبان ہو کر اُسی طرح ایک بن جائیں جس طرح اُن کی اصلیت ایک ہے اور اُن کا پروردگار ایک ہے۔

۱۔ پہلی اصل ——— خدائے تعالیٰ نے سورۂ انبیا میں امت اسلام کو مخاطب کرکے فرمایا ہے:

إِنَّ هٰذِهٖٓ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَّاحِدَةً وَّأَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ (۲۱: ۹۲)	یہ تمھاری امت، ایک ہی امت ہے اور میں تمھارا پروردگار ہوں لہذا میری عبادت کرو۔

پھر سورۂ مومنین میں خدا نے تمام پیغمبروں کو اسی قومی وحدت کے بارے میں مخاطب کیا ہے:

يٰٓأَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا إِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ۔ وَإِنَّ هٰذِهٖٓ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَّاحِدَةً وَّأَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ (۲۳: ۵۱، ۵۲)	اے پیغمبرو، پاک چیزیں کھاؤ اور نیکی کرو، میں تمھارے اعمال سے خوب واقف ہوں۔ یہ تمھاری امت، ایک ہی امت ہے، اور میں تمھارا پروردگار ہوں پس مجھ سے ڈرو۔

لیکن ہر نبی کی امت اُس کی اپنی قوم ہوا کرتی تھی۔ برخلاف اِس کے خاتم النبیین کی امت تمام انسان ہیں۔ خدا نے سب آدمیوں پر فرض کردیا ہے کہ اُس کے پیام بروں پر ایمان لائیں اور اُن میں تفریق نہ کریں، جیسا کہ بیان ہو چکا۔ پیغمبروں کے خاتم (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان لانا درحقیقت اولین پیغمبر اور درمیان کے سب پیغمبروں پر ایمان لے آنا ہے۔ پیغمبروں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک ہی سلطنت میں کئی گورنر۔ اور نسخ کے ذریعہ اگلوں کی شریعت کی منسوخی ایسی ہے جیسی سلطنت کے قوانین میں وقتاً فوقتاً ترمیم

ہوا کرتی ہے، یہاں تک کہ دین الٰہی کامل ہو گیا۔

دوسری اصل ـــــــ تمام انسانوں، اُن کی قوموں اور قبیلوں میں مساوات کے ذریعہ انسانی وحدت کی عام بنیاد اس کلام الٰہی میں موجود ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ (۴۹ : ۱۳)	اے لوگو، ہم نے تمھیں نر اور مادہ سے پیدا کیا ہے اور قوموں قبیلوں کی صورت میں کر دیا ہے تاکہ باہم شناخت کر سکو۔ اللہ کے ہاں تم میں سب سے عزت دار وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس انسانی وحدت کی تبلیغ حجۃ الوداع میں عید اکبر کے موقعہ پر کر دی۔ اس فرمان میں ضمناً یہ دعوت بھی موجود ہے کہ تعارف سے میل ملاپ پیدا کرو اور پھوٹ ڈال کر باہم زیادتی نہ کرو۔

تیسری اصل ـــــــ دین کی وحدت اس طرح قائم کر دی کہ سب آدمی ایک ہی رسول کی پیروی کریں، اُس رسول کی جو اُسی دین فطرت کے اصول لیکر آیا ہے جسے تمام پیغمبر لائے تھے مگر اُس کی شریعت ایسے احکام سے مکمل کر دی گئی ہے جو تمام انسانوں کے لیے یکساں مفید ہیں۔ اس اصل کی عام شہادت ذیل کی آیت میں موجود ہے:

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي	اے پیغمبر کہہ دیجئے کہ لوگو میں تم سب کے

رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا (۷: ۱۶۸) | کا رسول ہوں۔

اور چونکہ اسلام، فطرت کا اور عقیدہ و ضمیر کی آزادی کا دین ہے۔ اسی لیے اُس نے دین کے معاملہ کو جبری نہیں بلکہ اختیاری کر دیا ہے۔ فرمایا:

لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ (۲: ۲۵۶) | دین میں زبردستی نہیں ہے۔ ہدایت گمرہی سے الگ ہو چکی ہے۔

چوتھی اصل ——— قانون کی وحدت اس طرح قائم کر دی ہے کہ احکام اسلام کے سامنے جھکنے والے تمام لوگوں میں مساوات پیدا کر دی ہے۔ شہری حقوق میں بھی اور تادیبی حقوق میں بھی۔ مومن و کافر، نیک و بد، بادشاہ اور بازاری، امیر و فقیر، زبردست و کمزور سب پر عدل و انصاف یکساں طور پر جاری ہوتا ہے۔ اِس کے شواہد ہم تشریعی اصلاح کے باب میں بیان کریں گے۔

پانچویں اصل ——— روحی وحدت اِس طرح قائم کر دی ہے کہ اِس دین کی روحی اخوت اور عبادات میں اِس دین کے تمام مومنوں میں پوری مساوات پیدا کر دی ہے، مثلاً نماز اور حج۔ چنانچہ نماز کی صفوں میں اور حج کے مناسک میں مسلمانوں کے بادشاہ، امراء، علماء، فقیروں اور عام آدمیوں کے دوش بدوش کھڑے ہوتے ہیں۔ لیکن یورپین قومیں جو عیسائیت کی طرف منسوب ہیں، اِس مساوات کو پسند نہیں کر سکتیں جس پر اسلام میں شروع سے

آج تک عمل چلا آتا ہے اور سب اُس سے واقف ہیں۔ خدا فرماتا ہے:

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ (۴۹: ۱۰)	تمام مومن آپس میں بھائی ہیں۔

اور برسرِ جنگ مشرکوں کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے فرمایا:

فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَإِخْوَانُكُمْ فِي الدِّينِ (۹: ۱۱)	اگر وہ توبہ کرلیں، نماز قائم کریں، زکاۃ ادا کریں تو تمھارے دینی بھائی ہیں۔

چھٹی اصل ——— جنسی سیاسی وحدت اِس طرح قائم کردی ہے کہ اسلامی حکومت کے ماتحت تمام ممالک عام حقوق میں مساوی ہیں، بجز اِس حق کے کہ جزیرۃ العرب یا حجاز میں بود و باش رکھیں کہ یہ جگہ مسلمانوں کے لیے خاص ہے۔ اور یہ اِس لیے کہ حرمین اور اطراف کے علاقے، عبادت خانوں اور مسجدوں کا حکم رکھتے ہیں، اور اسلام نے تمام قوموں کے عبادت خانوں کے بارے میں یہی فیصلہ کر رکھا ہے کہ اُسی قوم کے قبضہ میں رہیں جس نے اُنہیں قائم کیا ہے۔ اسلام نے اُن کی حرمت تسلیم کی ہے۔ اُن میں اُن کے مالکوں کی اجازت بغیر داخلہ تک جائز نہیں رکھا۔ اِس حکم میں مسلم اور غیر مسلم سب برابر ہیں۔

ساتویں اصل ——— عدالتی وحدت اور اُس کی آزادی، اور عادل شریعت کے سامنے سب لوگوں کا یکساں ہونا، اسلام ہی نے ضروری ٹھہرایا ہے، لیکن اس سے شخصی دینی احکام مستثنیٰ ہیں۔ کیونکہ اس بارے میں اسلام، عقیدہ و ضمیر کی آزادی کا لحاظ رکھتا ہے۔ چنانچہ اُس نے غیر مسلموں کو

بھی اجازت دی ہے کہ شادی بیاہ وغیرہ معاملات کا تصفیہ اپنے علماءِ ملّت سے کرائیں۔ لیکن اگر مسلمانوں سے فیصلہ چاہیں تو مسلمان اپنی عادل شریعت کی بنا پر فیصلہ کر دیں گے جس نے اُن کی شریعتوں کو منسوخ کر دیا ہے۔ اِس بارے میں اصل یہ آیت ہے:

فَاِنْ جَآءُوْکَ فَاحْکُمْ بَیْنَھُمْ اَوْ اَعْرِضْ عَنْھُمْ وَاِنْ حَکَمْتَ فَاحْکُمْ بَیْنَھُمْ بِالْقِسْطِ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ (۵: ۴۲)	اگر غیر مسلم تمھارے پاس آئیں تو اُن کے جھگڑے کا فیصلہ کر دو یا اُن سے اعراض کرو لیکن اگر فیصلہ کرو تو انصاف سے کرو۔ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

اور چند آیتوں کے بعد فرمایا:

وَاَنِ احْکُمْ بَیْنَھُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ وَلَا تَتَّبِعْ اَھْوَآءَھُمْ عَمَّا جَآءَکَ مِنَ الْحَقِّ (۵: ۴۹)	اُن کے مابین اللہ کی اتاری ہوئی شریعت کے بموجب فیصلہ کر اور حق کو چھوڑ کر اُن کی خواہشوں کی پیروی نہ کر۔

آٹھویں اصل ـــــــــ زبان کی وحدت۔ معلوم ہے کہ انسانوں میں اتحاد اور اخوت ممکن ہی نہیں اور قومیں، ایک قوم بن ہی نہیں سکتیں جب تک اُن کی زبان، ایک نہ ہو۔ انسانوں کی مصلحت پر غور کرنے والے حکیموں کی ہمیشہ آرزو رہی ہے کہ سب لوگوں کی زبان ایک ہو جائے تاکہ باہمی تعارف کے سوا تعلیم، آداب، علوم و فنون، اور دنیاوی معاملات میں تعاون کرسکیں۔

اسلام نے اُن کی یہ دیرینہ آرزو پوری کردی ہے۔ اُس نے دین، تشریع، اور حکومت کی زبان کو اپنے تمام مومنوں اور ماتحتوں کی زبان بھی بنادیا ہے۔ مومن اپنے اعتقاد و وجدان سے مجبور ہوں گے کہ اللہ کی کتاب اور اُس کے رسول کی سنت سمجھنے، عبادت کرنے، اور اخوت اسلامی کے سلسلہ میں منسلک ہونے کے لیے اسلام کی زبان کو سیکھیں، اسی لیے قرآن میں جابجا یہ بات بار بار کہی گئی ہے کہ وہ عربی کتاب اور عربی حکم ہے، اور تاکید کی گئی ہے کہ اس عربی قرآن کو سمجھو۔ اُس سے نصیحت و ادب حاصل کرو۔ رہ گیے غیر مؤمن، تو وہ بھی مجبور ہوں گے کہ اُس شریعت کی زبان سیکھیں جس کی حکومت کو تسلیم کرتے ہیں، جیسا کہ اس بارے میں انسانوں کا عام دستور ہے۔ تمام اسلامی عربی فتوحات میں صورت حال ایسی ہی تھی۔

میں پہلے بتا آیا ہوں کہ اسلام میں عربی زبان کا سیکھنا واجب ہے اور یہ کہ اِس پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے جیسا کہ امام شافعیؒ نے اپنے رسالہ میں طے کردیا ہے۔ اِسی پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں، پھر خلفاء راشدین اور بنی امیّہ و بنی عبّاس کے عہد میں عمل بھی رہا یہاں تک کہ عجمیوں کی کثرت ہوگئی۔ علم کم ہوگیا۔ جہل زیادہ ہوگیا، اور لوگ صرف عبادات واذکار ہی میں دین کی زبان پر اکتفاء کرنے لگے (دیکھو تفسیر ج ۹ ص ۲۱۰)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کو ہر اُس بات سے روکتے تھے

جو اُن میں پھوٹ ڈالے، اُن کے اتحاد اور اُن کی قومی وحدت کے منافی ہو، ایسی وحدت جو ایک جسم کی طرح ہوتی ہے، جیسا کہ آپ نے اِس قول میں فرمایا ہے "مؤمنوں کی مثال اپنی باہمی محبت، رحم، اور الفت میں ایسی ہے جیسے زندہ جسم کہ اُس کے ایک عضو کو تکلیف ہوتی ہے تو پورا جسم بے خوابی اور دکھ کی مصیبت میں مبتلا ہو جاتا ہے" (مسند احمد، حدیث نعمانؓ بن بشیر) آپ ہر اُس بات کو ناپسند فرماتے تھے جس سے جنسی، نسبی، یا زبان کی تفریق پیدا ہو۔ پہلی بات مشہور ہے۔ دوسری بات کی دلیل پہلی بات کے ساتھ درج ذیل ہے:

حافظ ابن عساکر نے ابوسلمہ بن عبدالرحمن سے روایت کیا ہے کہ قیس بن مطاطیہ ایک مجلس میں پہنچا جس میں سلمان فارسی، صہیب رومی، بلال حبشی بیٹھے تھے۔ اِن صحابیوں کو دیکھ کر یہ منافق کہنے لگا "اوس اور خزرج کے قبیلوں نے اِس شخص کی حمایت کی تو کی، مگر یہ سب کون ہیں؟" (منافق کا مطلب یہ تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم عرب ہیں اور یہ دونوں قبیلے، اوس اور خزرج بھی عرب ہیں، خیر اُنہوں نے اپنی قومیت کے لحاظ سے یہ سب کیا، مگر یہ فارسی، رومی، اور حبشی کیوں آپ کی تائید پر کھڑے ہو گیے؟)

حضرت معاذ بن جبل نے یہ بات سن لی تو منافق کا گریبان پکڑ لیا اور کشاں کشاں لاکر نبی صلعم کو واقعہ سنایا۔ آپ غضبناک ہو کر اٹھے اور مسجد میں مسلمانوں کو جمع کر کے خطبہ دیا:

"اے لوگو، تمہارا پروردگار ایک ہے۔ باپ بھی ایک ہی ہے۔ دین بھی ایک ہی ہے۔ عربیت نہ تمھاری ماں ہے نہ باپ، بلکہ وہ ایک زبان ہے۔ جو کوئی یہ زبان بولتا ہے، عرب ہے!" حضرت معاذ نے عرض کیا "اے رسول اللہ! اس منافق کے بارے میں آپ مجھے کیا حکم دیتے ہیں؟" فرمایا "اسے دوزخ کے لیے چھوڑ دو" چنانچہ آپ کے بعد یہ شخص بھی مرتد ہو کر قتل کیا گیا۔

اگر مسلمان اسی محمدی تربیت پر استوار رہتے تو کیا اُن میں قومیت اور زبان کے اختلاف کی وجہ سے وہ تمام نااتفاقیاں اور جنگیں برپا ہو سکتی تھیں، جو ہوئیں اور جنہوں نے اُنہیں اِس پستی اور کمزوری میں پہنچا دیا ہے؟ اگر مسلمانوں نے اِس اسلامی اخوت کی حفاظت کی ہوتی تو کیا چند بے دین ترکوں کو موقعہ مل سکتا تھا کہ حکومت اسلام کی جنت کے اِس ہرے بھرے پیڑ کی جڑیں اکھاڑ سکتے، اور اسلام کی اِس تلوار کو اُس کے نیام سے نکال کر پھینک سکتے؟ کیا وہ تُرکی قوم اور اُس زبان کے مابین حائل ہو سکتے تھے جو اُس کے اللہ کی معصوم کتاب اور اُس کے مصلح رسول کی سنت کی زبان ہے، اور معلوم ہے کہ وہ عربی زبان ہی ہے، اور یہ حرکت صرف اس لیے کہ اس قوم کو یورپین قوموں میں جذب کر دیا جائے، بالکل اُسی طرح جس طرح کسی بچہ کو زبردستی دوسرے باپ کے سر منڈھ دیا جائے، اور صرف اتنی سی ہوس کے لیے کہ کہا جائے، ایک بڑا آدمی پیدا ہوا تھا جس نے تجدید کی، جس نے ایک نئی قوم، ایک نئی زبان،

ایک نئی حکومت، ایک نیا دین پیدا کر دیا؟ لیکن نہیں نہیں، یہ منصوبہ کبھی پورا ہونے والا نہیں!

یہ قوم (ترک) اسلام کے نام پر ایک ایسی دینی پیشوائی کی مالک تھی جس کے حلقہ بگوش تقریباً چالیس کروڑ انسان تھے۔ اگر یہ قوم علم وحکمت سے بھی آراستہ ہوتی، عقل وتدبیر کے ساتھ رہنمائی کی قابلیت رکھتی، اور ریاست کو مستحکم کرنے والے نظام کی مالک ہوتی، تو پوری مشرقی دنیا کو اپنے اشاروں پر چلا سکتی تھی اور اپنی اس دینی پوزیشن سے مغربی دنیا پر بھی حاوی ہو جا سکتی تھی جیسا کہ نپولین کا منصوبہ تھا اگر وہ مصر میں باقی رہ جاتا۔

بعض کوتاہ بیں اعتراض کرتے ہیں کہ مختلف قوموں میں زبان کا اتحاد پیدا کرنا، انسانی فطرت کے خلاف ہے، لیکن دین کا اتحاد تو انسانی طبیعت کے اور بھی زیادہ خلاف ہے اگر انسان سے مقصود، تمام افراد انسانی ہوں۔ حکماء وعقلاء برابر کوشش کرتے رہے ہیں کہ سب آدمیوں کی ایک ہی زبان ہو جائے اگرچہ یہ بھی جانتے ہیں کہ بعض زبانیں علوم وفنون میں اتنی ترقی کر چکی ہیں کہ انہیں بولنے والی قومیں کسی اور زبان کو ہرگز اختیار کر نہیں سکتیں۔ لیکن ان حکماء وعقلاء نے قوموں کو ایک ہی دین پر جمع کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ قرآن جس نے اپنی شریعت اور اپنی زبان کے ساتھ سب لوگوں کے لیے ایک ہی دین بھی ضروری ٹھہرایا ہے، ہمیں سکھاتا ہے کہ انسان کی آفرینش میں حکمت

الہی کا یہ منشا نہیں ہے کہ سب آدمی ایک ہی امت بن جائیں اور ایک ہی دین ماننے لگیں:

وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَا يَزَالُونَ مُخْتَلِفِينَ إِلَّا مَنْ رَحِمَ رَبُّكَ وَلِذَٰلِكَ خَلَقَهُمْ (۱۱: ۱۱۸)	اگر تیرا پروردگار چاہتا تو سب لوگوں کو ایک ہی امت کر دیتا۔ وہ برابر مختلف ہی رہیں گے بجز اُن کے جن پر تیرا پروردگار رحم فرمائے۔ اس نے انہیں اسی لیے پیدا کیا ہے۔

اس رحمت کی طرف خدا نے انسانوں کو اس لیے بلایا ہے کہ اُن کی بدبختی کم ہو جائے جو باہمی پھوٹ سے پیدا ہوتی ہے ــــ یہی وہ پھوٹ ہے جس نے موجودہ زمانہ کی سب سے زیادہ علم و ترقی رکھنے والی قوموں کو اب مجبور کر دیا ہے کہ دنیا بھر سے لوٹی ہوئی دولت کو جنگ کی طیاری پر برباد کریں، وہ جنگ جو اُن کی تمام ترقیوں اور خوشحالیوں کا خاتمہ کر کے رہے گی۔

اسلام نے تمام انسانوں کو ایک ہی دین کی طرف دعوت دی ہے۔ اس دعوت میں زبان اور دوسری چیزوں کی وحدت بھی شامل تھی جس سے قومیں بنتی ہیں۔ دعوت کے بلند ہوتے ہی انسانوں نے اُسے قبول کرنا شروع کر دیا، حتیٰ کہ ایک صدی کے اندر اندر یہ دعوت بحر اٹلانٹک سے ہندوستان تک پھیل گئی۔ اگر اسلام میں بدعتیں پیدا نہ ہو جاتیں، اُس کی حکومتیں، ظلم و استبداد میں مبتلا نہ ہو جاتیں، اُس کے حلقہ بگوشوں میں جہل و فساد پھیل نہ

جاتا، پھوٹ عام نہ ہوجاتی، تو اسلام میں اکثر انسان ضرور داخل ہوجاتے اور اسلام کی زبان، اُن کی زبان بن جاتی، کیونکہ انسان کی جبلّت یہی ہے کہ اچھائی کو قبول کرے بشرطیکہ اُسے اچھائی کا علم ہوجائے۔

قسطنطنیہ میں ایک جرمن عالم نے بعض مسلمانوں سے کہا، جن میں مکہ کے خاندانِ شرافت کا بھی ایک رکن موجود تھا، کہ ہم یورپین لوگوں کو چاہیے کہ معاویہ بن ابی سفیان کا طلائی بُت، برلن میں نصب کریں! لوگوں نے پوچھا، یہ کیوں؟ کہنے لگا اُس لیے کہ معاویہ ہی نے اسلامی حکومت کا نظام، ڈیموکریسی سے ہٹا کر زور زبردستی پر قائم کر دیا تھا۔ اگر یہ واقعہ پیش نہ آتا تو اسلام سارے جہان میں پھیل جاتا اور ہم جرمن اور یورپ کی تمام قومیں آج مسلمان اور عرب بنی ہوئی ہوتیں!"

اب غور کرو کہ قوموں کو متحد کرنے والے یہ اصول کیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نفس سے پھوٹنے والی وحی کا نتیجہ ہوسکتے ہیں جب کہ آپ ادھیڑ عمر میں پہنچ چکے تھے، وہ اصول جن کی خوبی نے آپ کو تمام انبیاء و حکماء سے بلند کر دیا ہے، یا عقل کا فیصلہ یہ ہے کہ اسلام کے یہ تمام اصول، اللہ تعالیٰ کی وحی ہیں جو آپ پر نازل ہوئی تھی؟

قرآن کا پانچواں مقصد

اسلام میں عبادات و ممنوعات، یعنی شخصی پابندیاں

۱۔ اسلام، درمیانی راہ ہے جس میں روح و جسم کے حقوق اور دنیا و آخرت کے مصالح جمع ہو گیے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (۲: ۱۴۳)	ہم نے تمھیں درمیانی قوم بنایا ہے تاکہ تم نمونہ بن کر لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو۔

اس آیت کی تفسیر میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ مسلمان اُن لوگوں کے وسط میں ہیں جن پر جسمانی خواہشوں اور مادّی منفعتوں کا غلبہ ہے، جیسے یہودی، اور اُن کے جو روحانیت اور نفس کشی میں مبالغہ کرتے ہیں جیسے ہندو اور عیسائی، اگرچہ ان میں سے اکثر اب اس راہ سے پھر چکے ہیں۔

۲۔ اسلام کا مقصد یہ ہے کہ ایمانِ صحیح، معرفت الٰہی، عمل صالح، مکارم اخلاق، محاسن اعمال کے ذریعہ نفس کو پاک کر کے دنیا و آخرت کی سعادتوں تک پہنچا دے۔ اسلام میں نہ محض اعتقاد رکھنا اور تکیہ کر لینا کافی ہے، نہ شفاعتوں اور خارق عادت باتوں پر بھروسہ کر لینا۔ اس دفعہ کا بیان اوپر گزر چکا ہے

۳۔ اسلام کی غرض یہ ہے کہ انسانوں میں تعارف ومحبت بڑھے نہ کہ اختلاف اور پھوٹ میں اضافہ ہو۔

۴۔ اسلام، آسان دین ہے۔ اُس میں کسی طرح کی سختی، تنگی، زبردستی نہیں۔ خدا فرماتا ہے:

لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (۲:۲۸۶)	کسی جان پر خدا اُس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔

اور فرمایا:

وَلَوْ شَاءَ لَاَعْنَتَکُمْ (۲:۲۲)	اگر خدا چاہتا تو تمھیں سختی میں ڈال دیتا۔

اور فرمایا:

یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ (۲:۱۸۵)	خدا تمھارے لیے آسانی چاہتا ہے، سختی نہیں چاہتا۔

اور فرمایا:

وَجَاهِدُوْا فِی اللّٰہِ حَقَّ جِهَادِهٖ هُوَ اجْتَبٰکُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَیْکُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ (۲۲:۲۷)	اللہ کی راہ میں پورا پورا جہاد کرو، اُس نے تمھیں منتخب کرلیا ہے اور دین کے معاملہ میں تم پر کوئی سختی نہیں کی۔

اور فرمایا:

مَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیَجْعَلَ عَلَیْکُمْ مِّنْ حَرَجٍ (۵:۷)	خدا نہیں چاہتا کہ تم پر سختی ڈالے۔

اِس اصل کی تحت یہ مسئلہ بھی ہے کہ اگر کسی فرض کا ادا کرنا، مکلّف پر بار ہو اور ادا نہ کر سکے یا ادا کرنے میں بہت تکلیف ہو، تو اُس سے وہ فرض ساقط ہو جاتا ہے یا اُس کا عوض قبول کر لیا جاتا ہے، جیسے بیمار یا شیخ فانی کہ اول الذکر سے روزہ ساقط ہو جاتا ہے اور تندرستی کے بعد اُسے رکھنا چاہیے، لیکن آخر الذکر پر روزہ کی قضا بھی نہیں ہے، بلکہ اُس کا کفارہ یہ ہے کہ اگر قدرت ہو، تو مسکین کو کھانا کھلا دے۔ اسی طرح ضرورت پڑ جانے پر حرام بھی بنصِ قرآن جائز ہو جاتا ہے، اور اگر اِس حرام چیز کی حرمت یا ممانعت، فساد کا دروازہ بند کرنے کے لیے ہے تو ضرورتاً وہ بھی مباح ہو جاتی ہے، جیسا کہ ہم سود، روزے اور حرام کھانوں سے متعلق آیات کی تفسیر میں بیان کر چکے ہیں۔

اسلام کی عام آسانی کو ہم آیت "یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا لَا تَسْئَلُوْا عَنْ اَشْیَاءَ اِنْ تُبْدَ لَکُمْ تَسُؤْکُمْ" کی تفسیر میں بہ تفصیل بیان کر آئے ہیں (دیکھو تفسیر جلد ۷)

۵۔ اسلام نے دین میں غلو سے منع کیا ہے۔ اسراف و نخوت کے بغیر زینت کو اور طیّبات کو جائز رکھا ہے۔ نفس کو بے وجہ عذاب میں ڈالنے سے روکا ہے۔ اِس کی تفصیل ہم نے سورۂ بقرہ اور آل عمران کی اُن آیتوں کی تفسیر میں کر دی ہے جن میں طیبات کھانے کا حکم دیا گیا ہے نیز اِس آیت کی تفسیر میں:

یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِیْنَتَکُمْ عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ وَّکُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا، اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْرِفِیْنَ۔ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِیْنَةَ اللّٰهِ الَّتِیْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّیِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ؟ قُلْ هِیَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا خَالِصَةً یَّوْمَ الْقِیٰمَةِ کَذٰلِکَ نُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ (۷:۳۱و۳۲)	اے اولادِ آدم، اپنی آرائش برتو ہر عبادت کے موقع پر۔ کھاؤ پیو، اور اسراف نہ کرو، خدا اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اے پیغمبر کہدیجئے کہ اللہ کی اُس زینت کو اور کھانے کی ستھری چیزوں کو کس نے حرام کیا ہے جو اُس نے اپنے بندوں کے لیے جاری کی ہیں؟ کہہ دیجئے یہ چیزیں ایمان والوں کے لیے ہیں دنیا کی زندگی میں اور خالص ہونگی قیامت کے دن۔ اسی طرح ہم تفصیل کرتے ہیں آیتوں کی اُن لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں۔

اور فرمایا:

یٰٓاَهْلَ الْکِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ (۵:۷۷)	اے اہل کتاب، اپنے دین میں غلو نہ کرو۔

غلو کی یہ ممانعت مسلمانوں کے لیے اور بھی زیادہ قابل لحاظ ہے۔ اُنہیں بدرجۂ اولیٰ اپنے دین میں غلو نہیں کرنا چاہیے جو رحمت اور آسانی کا دین ہے۔ عبادت میں غلو، ترک طیبات، اور رہبانیت سے ممانعت کے متعلق جو صحیح حدیثیں وارد ہیں، وہ اِن آیتوں کی تفسیر کرنے والی ہیں اور

مصداق ہیں اُس نام کی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کا رکھا ہے، یعنی اَلْحَنِیفِیَّۃُ السَّمْحَۃ (آسان سیدھی راہ)

۶۔ اسلام میں پابندیوں کا کم ہونا اور اُن کا بآسانی سمجھ میں آجانا اِس سے ظاہر ہے کہ ریگستان سے کوئی گنوار بدوی، رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا اور دعوت سنتے ہی اسلام لے آتا تھا۔ آپ اُسے ایک ہی نشست میں تعلیم دیدیتے تھے کہ خدا نے اُس پر کیا فرض کیا ہے اور کس چیز کو حرام رکھا ہے۔ وہ سمجھ جاتا تھا اور عمل کرنے کا آپ سے عہد کرتا تھا آپ یہ سن کر فرماتے تھے "بدو، فلاح پا گیا اگر سچا ہے"، اسلام کی یہی آسانی تھی جس کی وجہ سے اُس کی مقبولیت عام ہو گئی تھی، لیکن فقہاء نے اپنے اجتہادوں سے اُس میں پابندیاں اِس قدر بڑھا دی ہیں کہ اُن کا سمجھنا اور اُن پر عمل کرنا بہت ہی مشکل ہو گیا ہے۔

۷۔ اسلام میں پابندیوں پر عمل دو طرح سے ہوتا ہے: شدت کے ساتھ عمل اور اسے "عزیمت" کہتے ہیں۔ نرمی کے ساتھ عمل اور اسے "رخصت" کہا جاتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس آخر الذکر صورت کو ترجیح دیا کرتے تھے اور حضرت عبداللہ بن عمر اول الذکر کو۔ معلوم ہے کہ سب آدمی یکساں سرگرمی نہیں رکھتے، اِس لیے سب کا عمل بھی یکساں نہیں ہو سکتا۔ اِس طرح اسلام، سادہ لوح بدوی سے لیکر فلسفی حکیم اور درمیان کے تمام لوگوں کے

موافق بن گیا ہے۔ اسی اختلاف استعداد کو خدا نے اس طرح بیان فرمایا ہے:

ثُمَّ اَوۡرَثۡنَا الۡكِتٰبَ الَّذِيۡنَ اصۡطَفَيۡنَا مِنۡ عِبَادِنَا ‌ۚ فَمِنۡهُمۡ ظَالِمٌ لِّنَفۡسِهٖ‌ ۚ وَمِنۡهُمۡ مُّقۡتَصِدٌ ‌ۚ وَمِنۡهُمۡ سَابِقٌۢ بِالۡخَيۡرٰتِ بِاِذۡنِ اللّٰهِ‌ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الۡفَضۡلُ الۡكَبِيۡرُ۔ (۳۵ : ۳۲)

پھر کتاب کا وارث اُن لوگوں کو بنایا جنہیں ہم نے اپنے بندوں میں سے چنا تھا۔ ان میں بعض اپنے نفس پر ظلم کرنے والے ہیں۔ بعض درمیانی طریقہ پر ہیں، اور بعض خدا کے حکم سے نیکیوں میں ترقی کیے چلے جاتے ہیں یہی بہت بڑا فضل ہے۔

۸۔ کتاب و سنت، دونوں میں اس واقعہ کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ عقل و فہم و ہمت میں انسانوں کے درجے مختلف ہیں۔ چنانچہ قطعی احکام سب کے لیے عام ہیں، اور غیر قطعی احکام میں چونکہ لوگوں کی سمجھ مختلف ہے، اس لیے ہر ایک کو اپنے اجتہاد کے بموجب چلنے کا مجاز ہے۔ اسی لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب میں سے ہر ایک کے اجتہاد کو درست قرار دیتے تھے۔ چنانچہ جب شراب اور جوئے کے بارے میں سورۂ بقرہ کی آیت نازل ہوئی جس سے ان دونوں کی حرمت پر ظنی دلیل قائم ہوتی تھی، تو بعض صحابہ نے ان چیزوں سے توبہ کر لی اور دوسروں نے نہیں کی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں گروہوں کے اجتہاد برقرار رکھے یہاں تک کہ سورۂ مائدہ کی آیتیں نازل ہوئیں جن میں شراب اور قماربازی

کی قطعی حرمت وارد ہو گئی ہے۔

خدا فرماتا ہے:

وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ وَمَا يَعْقِلُهَا اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ (۲۹ : ۴۳)	یہ کہاوتیں ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں، مگر انہیں وہی سمجھتے ہیں جو علم والے ہیں۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ عام دینی فرائض اور عام دینی محرّمات، صرف نصِّ قطعی سے ہی ثابت ہو سکتے ہیں جسے ہر کہہ و مہہ سمجھے۔ فرائض کے بارے میں یہ مذہب، حنفی فقہاء کا ہے اور محرّمات میں یہ مذہب، جمہور سلف کا ہے۔ رہ گئیں وہ آیات جن میں ظنّی دلالت ہے اور وہ احادیثِ آحاد جن کی روایت یا دلالت ظنی ہے۔ تو عبادات اور شخصی اعمال میں اُن لوگوں کے لیے واجب العمل ہیں جن کے نزدیک وہ ثابت ہو جائیں۔ عدالتی معاملات اور سیاسی مسائل میں وہ اولوالامر کے اجتہاد پر موقوف ہیں۔ یہ بات ہم اپنی تفسیر اور "المنار" میں کئی جگہ صاف کر چکے ہیں۔

۹۔ اسلام نے یہ اصل طے کر دی ہے کہ ظواہر کے بموجب لوگوں سے برتاؤ کیا جائے اور باطن کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیا جائے۔ بنابریں اسلامی حکّام حتیٰ کہ خود خلیفۃ المسلمین کو بھی حق نہیں کہ کسی شخص سے اُس کے عقیدے یا دل کے خیال پر محاسبہ و مواخذہ کرے۔ سزا اُسی وقت دی جا سکتی ہے جب

دوسروں کے حقوق و مصالح سے متعلق عام احکام کی مخالفت کی جائے۔
اس اصل کو ہم سورۂ توبہ کی تفسیر کے خلاصہ میں بہ تفصیل بیان کر آئے ہیں۔

۱۰۔ اسلام میں تمام عبادتوں کا مدار اس پر ہے کہ ظاہر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقہ کی پیروی کی جائے۔ اس بارے میں نہ کسی کی ذاتی رائے کو دخل ہو سکتا ہے نہ کسی کی پیشوائی کو، اور عبادات کا باطن میں مدار اس پر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے اخلاص اور نیک نیتی پر مبنی ہوں۔ ان دونوں معاملوں سے متعلق بکثرت آیات و احادیث وارد ہیں۔

قرآن کا چھٹا مقصد

(اسلام کی سیاسی فرمانروائی، اس کی نوعیت، بنیاد، اور عام اصول)

اسلام ایک ایسا دین ہے جس میں ہدایت بھی ہے، سرداری بھی ہے، سیاست بھی ہے، حکومت بھی ہے، کیونکہ انسانوں کے تمام دینی، اجتماعی، عدالتی معاملات و مصالح کی جو اصلاح وہ لایا ہے، اُسے عمل میں اُسی وقت لایا جا سکتا ہے جب اسلام کو برتری و قوت حاصل ہو، عدل کے ساتھ حکومت کی جائے۔ حق کو قائم کیا جائے۔ دین اور سلطنت دونوں کی حفاظت کا سامان مہیّا ہو۔ اس بارے میں چند اصول و قواعد ہیں جنہیں ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:

حُکمِ اسلامی کی بنیاد

اسلام میں حکومت کا معاملہ سراسر قوم کے ہاتھ میں ہے۔ اور اُس کی شکل، حکومتِ شوریٰ کی ہے۔ اِس حکومت کا صدر، مسلمانوں کا امام اعظم یا خلیفہ ہے، جو اسلام کی شریعت کو نافذ کرنے والا ہے۔ خلیفہ کے عزل و نصب کا اختیار، امت ہی کو ہے۔ خدا نے مومنوں کی شان میں فرمایا:

وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (۴۲: ۳۸) | اُن کا معاملہ آپس میں مشورے پر ہے۔

اور اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا:

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ (۳: ۱۵۹) | مسلمانوں سے مشورہ کیا کیجئے۔

چنانچہ آپ اپنے اصحاب سے اُن تمام سیاسی، جنگی، مالی، اور عام مصالح میں مشورہ کرتے تھے جن کی کوئی نص کتاب اللہ میں موجود نہیں۔ اِس کی تفسیر میں نے اُس بحث میں بیان کر دی ہے جس میں دکھایا ہے کہ شوریٰ کو امت کے اجتہاد پر چھوڑ دینے میں کیا حکمت ہے (دیکھو تفسیر جلد ۴ صفحہ ۱۹۹)

اور خدا نے فرمایا:

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ	اے وہ جو ایمان لائے ہوئے اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور اُن کی جو تم میں اولوالامر ہیں۔ لیکن اگر کسی بات میں

فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا (۴: ۵۸)	تمھاری نزاع ہو جائے تو اُس بات کو اللہ اور رسول کی طرف لے جاؤ اگر تم اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔ یہ بہتر ہے اور نتیجہ کے لحاظ سے سب سے اچھا۔

اولوالامر، وہ اہلُ الحلِّ والعقد اور مصالحِ امت میں ٹھیک رائے رکھنے والے لوگ ہیں جن پر امت بھروسہ کرتی اور جن کی تجویزوں پر چلتی ہے۔ اِس قول کی دلیل یہ ہے کہ اِس آیت کے بعد خدا فرماتا ہے:

وَإِذَا جَاءَهُمْ أَمْرٌ مِنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ أَذَاعُوا بِهِ ، وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَإِلَىٰ أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنْبِطُونَهُ مِنْهُمْ (۸۳)	جب اُن پر امن یا خوف کا کوئی معاملہ آتا ہے تو اُسے شہرت دیدیتے ہیں، حالانکہ اگر اسے رسول اور اپنے اولوالامر کے پاس لیجاتے تو وہ اُسے جان لیتے جو معاملات سمجھتے ہیں۔

پس اولوالامر وہ لوگ تھے جو رسولؐ کے ساتھ تھے، جن کے سامنے معاملات پیش کیے جاتے تھے عام اِس سے کہ امن سے متعلق ہوں یا جنگ سے یا کسی اور چیز سے۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اِن لوگوں سے نازک، اہم، باریک معاملات میں مشورہ لیا کرتے تھے۔ عام مسلمانوں سے بھی عام معاملات میں مشورہ فرماتے اور اکثریت کی رائے پر چلتے اگرچہ خود آپ کی ذاتی رائے کے خلاف ہی کیوں نہ ہو، جیسا کہ غزوۂ اُحُد کے موقع پر اُن سے

مشورہ کیا کہ مدینہ ہی میں محصور ہو کر بیٹھیں یا جبلِ اُحد تک جا کر مشرکوں سے مقابلہ کریں۔ خود آپ کی اور بعض اکابر امت کی رائے میں پہلی صورت بہتر تھی، لیکن اکثریت کی خواہش دوسری صورت کے ساتھ تھی۔ آپ نے اسی صورت پر عمل کیا۔ لیکن بدر کے قیدیوں کے معاملہ میں آپ نے خواص اولی الامر سے مشورہ کیا مگر عمل حضرت ابوبکر کی رائے پر کیا، جیسا کہ ہم سورۂ انفال کی تفسیر میں بہ تفصیل بیان کر چکے ہیں۔

میں نے پہلی آیت (۴: ۵۸) کی تفسیر میں بتایا ہے کہ اس سے اسلامی حکومت کے کتنے قواعد نکلتے ہیں اور یہ کہ وہ قواعد، موجودہ زمانہ کی پارلیمنٹری نظام حکومت سے کہیں بہتر ہیں (دیکھو تفسیر جلد ۵ صفحہ ۱۸۰ — ۲۲۲)

یہ بات بکثرت دلائل سے ثابت ہے کہ اسلام میں عدالتی اور سیاسی قانون سازی کا حق، قوم ہی کو حاصل ہے جسے حدیث میں لفظ "جماعت" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ چنانچہ پچھلی دونوں آیتوں میں جو عام حکومت و سلطنت سے متعلق ہیں، نیز جملہ عام احکام میں قرآن نے مومنوں کی جماعت ہی کو مخاطب کیا ہے۔ جیسا کہ اس آیت میں:

بَرَاءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عَاهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ۔	اللہ اور اُس کے رسول کی طرف سے براءت ہے اُن مشرکوں سے جن کے ساتھ تم عہد کر چکے تھے۔

اِس کے بعد کی آیتوں میں بھی جو معاہدوں سے اور جنگ و صلح کے معاملات سے تعلق رکھتی ہیں اِسی طرح کا خطاب موجود ہے۔ نیز بقرہ و آل عمران اور انفال میں بھی ایسی ہی آیتیں وارد ہیں۔ اور جیسا کہ فرمایا:

وَاِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ (۴۹: ۹)	اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو اُن کے مابین صلح کردو لیکن اگر ایک گروہ دوسرے پر سرکشی کرے تو سرکشی کرنیوالے سے لڑو یہاں تک کہ امر الٰہی کی طرح رجوع کرے تو دونوں میں انصاف کے ساتھ صلح کرادو، عدل کرو، اللہ عدل کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

اِسی طرح مالی احکام جیسے مال غنیمت، اُس کی تقسیم، اور عورتوں کے معاملات میں بھی جماعت ہی کو مخاطب کیا ہے۔ اِن سب مسئلوں کو ہم اپنی تفسیر میں بیان کرچکے ہیں۔

بعض اصولی علماء کبار نے تصریح کی ہے کہ اسلام میں پورا اختیار، امت ہی کو حاصل ہے۔ اِس اختیار کو کام میں لانے والے، امت کے اہل الحل والعقد ہیں جو خلفاء و ائمہ کو قائم کرتے اور مصلحت کے وقت اُنہیں معزول کرسکتے ہیں۔ امام رازی نے خلافت کی تعریف میں کہا ہے "خلافت، دین اور

دنیا میں چند اشخاص میں سے ایک شخص کی عام سرداری ہے،، اور اِس قید سے غرض یہ ہے کہ اگر امام یا خلیفہ کو اُس کے فسق کی وجہ سے معزول کر دیا جائے تو سرداری اُن چند اشخاص میں واپس جائے جن کا اِس قید میں ذکر کیا گیا ہے۔ علامہ سعد تفتازانی نے اِس تعریف کے موقعہ پر "شرح المقاصد" میں لکھا ہے کہ امام رازی کا مقصود، امت کے اہل الحل والعقد ہیں جن کی سرداری، سب لوگوں پر قائم ہے۔ قومی اختیار کے مسئلہ کی تفصیل ہم اپنی کتاب "الخلافۃ او الامامۃ العظمیٰ" میں کر چکے ہیں۔

اِسلامی حکمرانی کا یہ بنیادی اصول، انسانوں کی سب سے بڑی سیاسی اصلاح ہے۔ اسلام نے یہ اصول اُس زمانے میں مقرر کیا جب تمام قومیں، مستبد حکومتوں کے پنجہ میں گرفتار تھیں اور اپنے دینی اور دنیاوی معاملات میں غلام بنی ہوئی تھیں۔ اِس اصول کو سب سے پہلے نافذ کرنے والے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ چنانچہ قوم کے عام سیاسی اور انتظامی معاملات میں اُن لوگوں کے مشورے بغیر کوئی کام نہیں کرتے تھے جنہیں قوم میں عزت حاصل تھی، اور یہ اِس لیے کہ آنے والی نسلوں کے لیے یہ عمل، نمونہ بن جائے۔

آپ کے بعد خلفاء راشدین کا بھی یہی مسلک تھا۔ خلیفۂ اول ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنی بیعت کے بعد ہی منبر رسول پر سے

جو خطبہ دیا، وہ اِن لفظوں سے شروع ہوتا ہے "میرے سپرد تمھارے معاملات کیے گیے ہیں، حالانکہ میں تم میں سب سے بہتر آدمی نہیں ہوں۔ اگر راہ راست پر رہوں تو میری مدد کرنا۔ کج روی اختیار کروں تو مجھے ٹھیک راستہ پر لگا دینا!" پھر خلیفۂ دوم، عمرؓ بن الخطاب نے بھی یہی کہا "تم میں سے جو شخص مجھ میں کجی دیکھے، مجھے سیدھا کر دے"، یہ سن کر ایک بدوی چلا اٹھا "اگر ہم تجھ میں کجی دیکھیں گے تو اپنی تلوار سے تیرے سارے بَل نکال دیں گے!" خلیفہ نے یہ سنا تو کہا "خدا کا شکر کہ اُس نے مسلمانوں میں ایسے لوگ پیدا کر دیے ہیں جو عمر کے بَل اپنی تلوار سے نکال سکتے ہیں!" آپ کا دستور تھا کہ صحابہ میں سے عالموں اور دانشمندوں کو جمع کرتے اور اُن تمام معاملات میں مشورہ کرتے جن کی نص نہ کتاب اللہ میں ہوتی نہ رسول اللہ کی سنت میں اُن کی کوئی دلیل موجود ہوتی تھی۔ خلیفۂ سوم عثمان رضی اللہ عنہ نے بیعت کے بعد فرمایا تھا "میرا فیصلہ تمھارے فیصلہ کے ماتحت ہے"، خلیفۂ چہارم، علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کا بھی عمل اسی طریقہ پر تھا اگرچہ اُن کا اِس طرح کا کوئی مختصر جملہ مجھے اِس وقت یاد نہیں۔

اگر خدا نے خود اپنے رسول پر مشورہ کرنے کو واجب قرار دے دیا ہے تو دوسرے لوگوں پر یہ اور بھی زیادہ واجب ہے۔ کسی طرح روا نہیں کہ اسلام کا نظام حکومت، عربی ملکۂ سبا کی حکومت سے کم درجہ ہو، جو مشورے

سے مقیّد تھی۔ یہی چیز دوسری قوموں میں بھی پائی گئی ہے، اگرچہ بہت سے فقہاء اِس سے جاہل رہے۔

لیکن مسلمان پادشاہ بعد میں اِس صراطِ مستقیم سے بھٹک گیے۔ منافق مولویوں اور فتنہ پرداز سرداروں نے اُن کا ساتھ دیا اور ہوتے ہوتے مسلمان اپنے دین کی حکومت کے اِس بنیادی قاعدے سے بالکل بے خبر ہو گیے۔ لیکن اہلِ یورپ خوش نصیب تھے کہ صلیبی جنگوں میں مسلمانوں کے جس سلطان سے اُنہیں سابقہ پڑا اور شکست اٹھانا پڑی، وہ سلطان صلاح الدین ایوبیؒ تھا جو اپنی حکمرانی میں خلفاءِ راشدین اور عمر بن عبد العزیز کے نقشِ قدم پر چلتا تھا۔ اِسی سلطان کے ایک مقرّب مصاحب نے جب اُس سے ایک شخص کی فریاد کی تو سلطان نے کہا "میں خود کچھ نہیں کر سکتا۔ مسلمانوں کا قاضی موجود ہے۔ شریعت کا قانون عام و خاص سب پر جاری ہے۔ میں اِس کے سوا کچھ نہیں ہوں کہ شریعت کا غلام اور سنتری ہوں۔ تم عدالت سے رجوع کرو۔ جو حق ہوگا وہی فیصلہ میں آجائے گا!" سلطان کے اِس قول کا مطلب یہ ہے کہ اُن کی حیثیت اِس سے زیادہ نہیں ہے کہ شریعت کو نافذ کریں [illegible] ہیں۔ قاضی اپنی جگہ بالکل آزاد ہیں، کیونکہ عدل و مساوات کے قانون کی [illegible] کرتے ہیں۔ صلیبیوں نے حکومت کا یہ طریقہ اُن سے اخذ کر لیا۔ [illegible] تاریخ کا مطالعہ کیا اور بہت سی ایسی باتوں سے باخبر ہو گیے جن

سے بعد کے اکثر مسلمان جاہل ہیں۔ پھر اُنہوں نے اپنے ہاں کی حکومتیں، اسلام کے لائے ہوئے اِس اصول پر قائم کیں کہ اختیارات کا سرچشمہ خود امت ہی ہے، مگر دعویٰ یہی کیا کہ اِس طرزِ حکومت کے موجد وہ خود ہیں اور اسلامی حکومتوں پر اُن کے استبداد کی وجہ سے لعن طعن شروع کر دی۔ اِسی قدر نہیں بلکہ خود اسلام کو بھی بدنام کرنے لگے کہ وہ استبداد اور شخصی حکومت کا بانی ہے۔ بے علمی کی وجہ سے مسلمانوں نے اِن لوگوں کی تصدیق کی اور رٹ کر لیا کہ اسلامی حکومتوں کی اصلاح اِسی طرح ہو سکتی ہے کہ یورپ والوں کی تقلید کی جائے۔ اِس صورت حال کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کی سب سے بڑی سیاسی اور قانونی خصوصیت ضایع اور اُس کی اکثر سلطنتیں برباد ہو گئیں۔

اسلامی قانون سازی کے اصول

اہل سنت کے ہاں قانون سازی کے اصول چار ہیں:

۱۔ قرآن مجید۔ علما، اصول کہتے ہیں کہ دینی، قانونی، سیاسی عملی احکام کی آیتیں، قرآن کی تمام آیتوں کا دسواں حصہ ہیں۔ بعضوں نے اُنہیں گنا بھی ہے اور کہا ہے کہ عبادات و معاملات کی پانچ سو آیتیں ہیں۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اِن کی غرض صریح آیات سے ہے۔ بے شک قرآن کا بیشتر حصہ، دینی معاملات سے متعلق ہے، کیونکہ اکثر دنیادی معاملات لوگوں کے دستور اور اجتہاد

پر چھوڑ دیے گئے ہیں۔

۲۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتاب اللہ کو بیان کرنے کے لیے عمل و قضا کی جو سنت مقرر فرمائی ہے۔ علماء نے کہا ہے کہ اصولی احکام کی حدیثیں بھی پانچ سو ہیں اور اُن کی متعلقہ احادیث کی تعداد چار ہزار ہے۔

۳۔ اجماعِ امت۔ تمام امت کا اتفاق ہو چکا ہے کہ دینیات میں صحابہ کا اجماع، حجت ہے۔ اُن کے بعد مجتہدین کے اجماع میں اختلاف ہے۔

۴۔ عدالتی، سیاسی، انتظامی، جنگی معاملات میں اماموں، حاکموں، قاضیوں، سپہ سالاروں کا اجتہاد۔ بعض فقہاء نے اجتہاد کو قیاس کے ساتھ خاص کر دیا ہے۔ بعضوں نے قیاس سے انکار کیا ہے۔ بعضوں نے اُسے مقیّد کر دیا ہے جیسا کہ ہم آیت (۵: ۱۰۱) کی تفسیر میں بیان کر چکے ہیں۔

اِس ترتیب کے بارے میں احادیث و آثار بھی وارد ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین کے زمانہ میں اس پر عمل تھا۔ چنانچہ حضرت معاذ کی حدیث میں ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مجھے یمن بھیجنے لگے تو پوچھا "اگر تمھیں فیصلہ کرنا پڑا تو کس طرح فیصلہ کروگے؟" میں نے جواب دیا، کتاب اللہ [illegible] فیصلہ کروں گا۔ فرمایا [illegible]

کتاب اللہ میں موجود نہ ہو؟" میں نے عرض کیا، تو سنت رسول اللہ کے بموجب عمل کروں گا۔ فرمایا "اگر سنت رسول اللہ میں بھی نہ ہو" میں نے کہا تو پھر اپنے اجتہاد سے کام لوں گا اور کوئی کوتاہی نہیں کروں گا۔ یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری چھاتی ٹھونکی اور فرمایا "خدا کا شکر جس نے رسول اللہ کے قاصد کو اُس بات کی توفیق بخشی جس میں رسول اللہ کی خوشنودی ہے" (ابو داؤد و ترمذی) اسی ترتیب پر خلفاء راشدین کے زمانہ میں عمل ہونا سب کو معلوم ہے۔ ہم اس کی تفصیل کسی اور جگہ کر چکے ہیں۔ اسی بات کا حکم حضرت عمر نے قاضی شریح کو اپنے مشہور خط میں دیا تھا، لیکن فقہاء نے اجماع کو، حتیٰ کہ علماء اصول کے عرفی اجماع کو نص پر مقدم رکھا ہے، اور اس مسئلہ میں اختلاف ہے۔

حکام کے حق میں اجتہاد کا مشروع ہونا اس حدیث سے نکلتا ہے "جب حاکم کے سامنے معاملہ پیش ہوتا ہے اور وہ اجتہاد سے فیصلہ کرتا ہے، تو اگر فیصلہ ٹھیک ہوتا ہے تو حاکم کو دو ثواب ملتے ہیں۔ اگر غلط ہوتا ہے تو ایک ثواب ملتا ہے" تمام کتب حدیث میں یہ حدیث موجود ہے۔

خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے سپہ سالاروں کو آزادی دے دیا کرتے تھے کہ مصلحت کے بموجب کام کیا کریں، چنانچہ اُن سے فرماتے تھے "جب تم کسی قلعہ کا محاصرہ کرنا اور دشمن تم سے کہے کہ فیصلۂ الٰہی کے سامنے

وہ ہتھیار رکھ دینے پر آمادہ ہے تو تم یہ بات منظور نہ کرنا بلکہ اُسے مجبور کرنا کہ تمھارے فیصلہ کے سامنے ہتھیار رکھے، کیونکہ تم نہیں جانتے کہ فیصلۂ الٰہی کے بموجب اُس سے برتاؤ کر سکو گے یا نہیں" (رواہ احمد ومسلم و ترمذی وابن ماجہ)

نصوص سے قواعد اجتہاد

کتاب وسنت میں کچھ احکام، اعمال و واقعات کے ساتھ خاص ہیں اور کچھ قانون سازی کے عام اصول ہیں۔ خاص احکام میں سے کچھ روایت و دلالت کے لحاظ سے قطعی ہیں جن میں نہ اجتہاد کی گنجائش ہے نہ اُن سے گریز کیا جا سکتا ہے اِلّا یہ کہ کوئی شرعی مانع پیش آجائے، جیسے شبہہ کے موجود ہو جانے سے حد نہ جاری ہو سکنا، یا ضرورت و مجبوری کا عذر پیش کر دینا۔ مثلاً حضرت عمرؓ نے قحط کے زمانہ میں چور کا ہاتھ کاٹنے سے منع کر دیا تھا۔ اور ان میں کچھ احکام غیر قطعی ہیں۔ ان میں حاکموں، قاضیوں، اور سپہ سالاروں کے اجتہاد پر عمل کیا جائے گا، جیسا کہ عبادات ومحرّمات کے بارے میں بیان ہو چکا۔

رہ گیے عام اصول و قواعد تو مختلف احکام میں اُن کی رعایت ضروری ہے۔ ان میں سب سے اہم اصول یہ ہیں کہ ہمیشہ ہر حال میں بے غل وغش حق کو تلاش کیا جائے، حقوق، شہادت، احکام میں مساوات برتی جائے۔ مصلحتیں قائم کی جائیں۔ مفاسد دور کیے جائیں۔ عرف عام کا لحاظ رکھا جائے۔ شبہات کی

موجودگی میں حدیں نہ جاری کی جائیں۔ ضرورات کی بنا پر ممنوعات کو مباح سمجھا جائے۔ ضرورت کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کیا جائے۔ معاملات کی بنیاد اِس قاعدے پر رکھی جائے کہ نیکیاں حاصل ہوں اور برائیاں دور کی جائیں عدل وظلم کے بارے میں چند شواہد پیش کرنے پر ہم اکتفا کرتے ہیں۔

(عدل اور اُس میں مساوات کے وجوب اور ظلم کے ممنوع ہونے پر نصوص قرآنی)

چونکہ عدل ہی احکام کی بنیاد اور قانون سازی کی ترازو ہے، اِس لیے اللہ تعالیٰ نے مکی اور مدنی سب سورتوں میں اُس کا حکم دیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ (۱۶: ۹۰)	خدا عدل اور نیکی کا حکم دیتا ہے۔

اور فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمَانَاتِ اِلٰى اَهْلِهَا وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ (۴: ۵۷)	خدا کا تمھیں حکم یہ ہے کہ امانتیں اُن کے مالکوں کے حوالے کردو اور جب لوگوں کے مابین فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ کرو۔

اور فرمایا:

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا كُوْنُوْا قَوَّامِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰى	اے ایمان والو، عدل کے قائم کرنیوالے بنو، اللہ کے لیے گواہی دو اگرچہ خود تمھارے ...

اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ اِنْ یَّكُنْ غَنِیًّا اَوْ فَقِیْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا (۴: ۱۳۵)	یا تمھارے والدین اور رشتہ داروں ہی کے خلاف کیوں نہ پڑے، اگر کوئی مالدار ہے یا غریب ہے تو اللہ اُن کا تم سے زیادہ خیر خواہ ہے، لہٰذا اپنی خواہش کی پیروی کرکے انصاف سے نہ ہٹو اور لگوگول مول باتیں کرنے تم جو کچھ کرتے ہو، خدا اُس سے خوب واقف ہے۔

اِس آیت میں خدا نے مؤمنوں کو حکم دیا ہے کہ عدل کرنے میں مبالغہ سے کام لیں، اور یہ کہ مقدموں میں اُن کی شہادتیں ہمیشہ اللہ عزّوجل ہی کے لیے ہوں نہ کہ اپنی ذاتی خواہش یا کسی کی مصلحت کے لیے، اگرچہ یہ شہادتیں خود اپنی ذات ہی کے خلاف یا اپنے والدین اور قریبی رشتہ داروں ہی کے خلاف کیوں نہ پڑیں، اور یہ کہ شہادت میں نہ امیر کی امارت سے مرعوب ہوں نہ فقیر کے فقر پر ترس کھائیں، بلکہ سچی بات ہی کہہ دیا کریں، اور جو کوئی ایسا نہ کرے، تو خدا نے اُسے سزا دینے کی دھمکی دی ہے۔

اور فرمایا:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا یَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَنْ لَّا	اے ایمان والو، کھڑے ہو جاؤ اللہ کے نام پر انصاف کے ساتھ گواہی دینے کے لیے۔ کسی کی دشمنی تمھیں انصاف سے روکنے نہ پائے۔

تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (۵ : ۸)	انصاف کیا کرو کہ یہی تقویٰ سے قریب ہے۔ اللہ سے ڈرتے رہو، اللہ تمھارے اعمال سے باخبر ہے۔

یہ آیت اگلی آیت کو پورا کرنے والی ہے۔ اُس میں حکم دیا گیا تھا کہ عدل و شہادت کے معاملہ میں پوری پوری مساوات سے کام لینا چاہیے عام اِس سے کہ خود اپنی ذات کا معاملہ ہو یا غیر کا۔ قریب والوں کا ہو یا دور والوں کا۔ امیر کا ہو یا غریب کا۔ اور اِس آیت میں حکم دیا گیا ہے کہ آدمی کو چاہیے اِن دونوں چیزوں میں اپنے آپ کو اپنے دشمنوں سے بھی مساوی رکھے۔ عداوت کا کوئی سبب بھی ہو، دینی یا دنیاوی، اِس کی وجہ سے انصاف کرنے اور سچی شہادت دینے میں کوتاہی نہ کرے، کیونکہ انصاف میں مساوات ہی تقویٰ الٰہی سے قریب ہے۔ پہلی آیت میں جس طرح کسی کی طرفداری کرنے پر وعید فرمائی تھی، اُسی طرح اِس آیت میں اُن لوگوں کو ڈرایا ہے جو کسی کی دشمنی کی وجہ سے عدل و انصاف کو چھوڑ دیتے ہیں۔ دونوں قسم کے لوگوں کو بتا دیا ہے کہ یاد رکھو، خدا کو ہر بات کی خبر ہے۔ اُس سے کوئی بات بھی چھپی نہیں ہے۔ وہ ہر آدمی سے اُس کے عمل، نیت، ارادہ کا حساب لے گا اور اپنے علم کے مطابق اُسے ثواب یا سزا دیگا۔

آیت ذیل میں "میزان" سے مقصود، عدل و انصاف ہی ہے:

اَللّٰهُ الَّذِیْ اَنْزَلَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِیْزَانَ (۴۲: ۱۷)	وہ اللہ ہی ہے جس نے حق کے ساتھ کتاب (قرآن) اور میزان (انصاف) اُتاری۔

اور فرمایا:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْکِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْهِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ (۵۷: ۲۵)	ہم نے اپنے رسول کھلی نشانیوں کے ساتھ بھیجے اور کتاب و میزان اُن کے ساتھ اُتاری تاکہ لوگ انصاف کو قائم کریں، اور لوہا اتارا جس میں شدید ہیبت ہے اور لوگوں کے لیے فوائد۔

پس سب سے بہتر وہ لوگ ہیں جو قرآن کی ہدایت کے ذریعہ ظلم و جور سے باز رہتے ہیں۔ اِن کے بعد اُن لوگوں کا درجہ ہے جنہیں حکومت کا انصاف اِس چیز سے روکتا ہے۔ اور سب سے بدتر وہ لوگ ہیں جن کا علاج لوہے اور تلوار کے سوا کچھ نہیں۔ اِس آیت میں "حَدِیْد" سے مراد یہی ہے۔

دنیا کی اصلاح کا دارومدار اسی پر ہے کہ لوگ کتاب اللہ پر ایمان لائیں جس نے ظلم اور تمام برائیوں کو حرام قرار دے دیا ہے۔ اِس طرح مومن، دنیا و آخرت میں عذاب الٰہی کے خوف اور ثواب کی اُمید پر ظلم سے دور رہیں، اور یا پھر سچے انصاف پر ایمان ہو جو حکومت کے ہاتھوں سزا کا خوف دلا کر لوگوں کو ظلم سے باز رکھتا ہے۔

عدل قائم کرنے کے اِس اصول کی تائید اُن آیتوں سے بھی ہوتی ہے جو ظلم کی تحریم اور اُس پر سخت وعید کے بیان میں نازل ہوئی ہیں۔ قرآن کی صدہا آیتوں میں ظلم کا ذکر نہایت سخت مذمت کے ساتھ آیا ہے۔ اور بعض آیتوں میں ظلم کے بد ترین دنیاوی واخروی نتائج بھی بیان کیے گیے ہیں، اور بتا دیا گیا ہے کہ ظلم کی سزا، کہیں دور سے نہیں آتی بلکہ لازمی نتیجہ کے طور پر ظلم کے ساتھ ہی ہوتی ہے، اور یہ کہ خدا کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ لیکن خود لوگ ہی اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا، اور یہ کہ ظلم کا نتیجہ اِس دنیا میں بھی یہ ہوتا ہے کہ قومیں برباد اور تہذیبیں تباہ ہو جاتی ہیں۔ فرمایا:

وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ۔	خدا قوموں کو اُن پر ظلم کر کے (یا اُن کے شرک کی وجہ سے) تباہ نہیں کرتا حالانکہ وہ اپنی روش میں اصلاح پسند ہوتی ہیں۔

اسی طرح فرمایا:

وَتِلْكَ الْقُرٰى اَهْلَكْنٰهُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَجَعَلْنَا لِمَهْلِكِهِمْ مَّوْعِدًا۔	اِن آبادیوں کو ہم نے برباد کر ڈالا جب اُنہوں نے ظلم کیا اور اُن کی بربادی کا ہم نے وقت مقرر کر رکھا تھا۔

اور حکم قصاص کے سلسلہ میں فرمایا:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۔	اور اللہ کی اتاری ہوئی شریعت کے بموجب جو لوگ فیصلہ نہیں کرتے تو وہی ظالم ہیں۔

(احکام و معاملات میں نیکی کا لحاظ ضروری ہے)

کتاب و سنت میں جتنے بھی احکام ہیں، شخصی ہوں، یا شہری، یا سیاسی یا جنگی، اُن سے غرض یہی ہے کہ نیکی کو قائم رکھا جائے۔ حق، انصاف، پابندیٔ عہد، رحم، محبت، ہمدردی، بھلائی، احسان کو کام میں لایا جائے۔ ظلم، بدعہدی، بے وفائی، جھوٹ، خیانت، سنگ دلی، دغابازی، فریب اور حرام طریقوں سے لوگوں کا مال کھانا، جیسے سودخواری، رشوت ستانی، دین فروشی، اور ٹونے ٹوکے وغیرہ معائب سے بچا جائے۔

جنگی معاملات میں اصلاح پر گفتگو بعد میں کی جائے گی۔

اِن تمام اصول و قواعد میں، جن کی بنا پر اسلام تمام پیغمبروں کی شریعتوں اور تمام علماء و حکماء کے ضابطۂ قوانین سے بلند ہو گیا ہے، یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ یہ حیرت انگیز اصول و قواعد، ایک اَن پڑھ پیغمبر کی زبان سے بیان ہوئے ہیں جس نے اَن پڑھ لوگوں ہی میں پرورش پائی تھی۔

اب قدرتی طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ اُس پیغمبر نے بڑھاپے میں اپنے دل سے ایجاد کیا تھا یا یہ پروردگار کی طرف سے اُس پر وحی تھی، جیسا کہ اُس نے ہمیں خبر دی ہے؟

قرآن کا ساتواں مقصد

مالی اصلاح کی طرف رہنمائی

تمہید ــــــ ہم بیان کر چکے ہیں کہ قرآن نے دین و ایمان، عمل و عقیدے، عقل و دلیل، ذہن و ضمیر، اور عادل حکمرانی کے بارے میں کیا کیا اصلاحیں کی ہیں، عام اس سے کہ افراد سے متعلق ہوں یا جماعتوں سے متعلق، یا قوموں سے متعلق۔ مگر ابھی ایک چیز باقی ہے، اور وہ نہایت خطرناک اجتماعی مفاسد کی اصلاح ہے جو مذکورۂ بالا اصلاحوں کے بعد ہی کمال کو پہنچ سکتی ہے۔ وہ اجتماعی مفاسد حسب ذیل ہیں:

۱۔ دولت و تونگری کی سرکشی۔

۲۔ جنگ کی زیادتی و بے رحمی۔

۳۔ عورت پر ظلم اور بے قید سختی۔

۴۔ کمزوروں اور قیدیوں پر ظلم اور اُن کی آزادی پر دست درازی یعنی غلامی۔

دنیا کی تمام مسرتوں اور راحتوں کا دار و مدار انہی مفاسد کی اصلاح پر ہے اور یہ اصلاح ممکن نہیں، جب تک دین و عقل، علم و حکمت، اور اقتدار و حکومت، یہ سب مل کر باہم تعاون نہ کریں۔ ہم اِن معاملات پر

ذیل میں گفتگو کرتے ہیں:

۱۔ مال، فتنہ و آزمائش ہے

مال کے بارے میں قرآن کا بنیادی اصول یہ ہے کہ وہ فتنہ ہے، یعنی انسان کی دنیاوی زندگی میں اُس کے لیے آزمائش ہے، اور یہ اِس لیے کہ اچھائی اور برائی، نیکی و بدی، خیر و شر کا وہی ذریعہ ہے۔ اُسی کے کمانے اور خرچ کرنے میں لوگ باہم رشک کرتے ہیں۔ وہی دولتمندوں میں گردش کرتا اور اُن کی بڑائی کا سبب بنتا ہے۔ تمام مصالح و منافع کا بھی دار و مدار اُسی پر ہے۔

اِس بارے میں خدا فرماتا ہے:

لَتُبْلَوُنَّ فِي أَمْوَالِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ (۳:۱۸۶)	تمھارے مال اور جان میں تمھاری آزمائش کی جائے گی

اور سلیمان علیہ السلام نے ملکۂ سبا کا تختِ شاہی جب اپنے سامنے ٹھہرا ہوا دیکھا تو کہا:

هَٰذَا مِن فَضْلِ رَبِّي لِيَبْلُوَنِي أَأَشْكُرُ أَمْ أَكْفُرُ، وَمَن شَكَرَ فَإِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهِ، وَمَن كَفَرَ فَإِنَّ رَبِّي غَنِيٌّ كَرِيمٌ (۲۷:۴۰)	یہ میرے پروردگار کا فضل ہے تاکہ میری آزمائش کرے کہ میں شکر ادا کرتا ہوں یا ناشکر گزار بنتا ہوں۔ جو شکر کرے تو اپنے ہی لیے شکر کریگا اور جو ناشکری کرے تو میرا پروردگار بے نیاز اور کریم ہے۔

اور فرمایا:

وَمَآ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ بِالَّتِىْ تُقَرِّبُكُمْ عِنْدَنَا زُلْفٰىٓ اِلَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَزَآءُ الضِّعْفِ بِمَا عَمِلُوْا وَهُمْ فِى الْغُرُفٰتِ اٰمِنُوْنَ (۳۴: ۳۷)	نہ تمہاری دولت نہ تمہاری اولاد ہمارے حضور تمہیں مقرب کرتی ہے، مگر ہاں جو ایمان لائے اور عمل صالح انجام دیتے ہیں تو اُن کے لیے نیکوکاری کا دونا صلہ ہے اور وہ جنت کے بالاخانوں میں چین سے رہیں گے۔

اور فرمایا:

وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَا فِىْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ (۳۰: ۳۹)	اور جو روپیہ تم بیاج پر دیتے ہو کہ لوگوں کے مال میں بڑھے، تو وہ روپیہ خدا کے ہاں نہیں بڑھتا (لیکن ہاں) جو کچھ تم پاک دل سے بوجہ اللہ دیتے ہو تو ایسا کرنے والوں ہی کو دونا اجر ملے گا۔

اور فرمایا:

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ (۳: ۱۴)	رجھا دیا گیا ہے لوگوں کو مرغوبات کی محبت پر یعنی عورتیں بیٹے، سونے چاندی کے ڈھیر، گھوڑے، مویشی، اور کھیتی، یہ ہے دنیا کی زندگی کا لطف مگر اللہ کے پاس ہی اچھا ٹھکانا ہے۔

اور فرمایا:

وَاعْلَمُوٓا اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ وَّاَنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ (۸ : ۲۸)	جان لو کہ تمھارے اموال اور تمھاری اولاد، آزمائش ہی ہے، اور اللہ کے پاس بڑا ثواب ہے۔

سورۂ تغابن میں بھی اسی طرح فرمایا ہے۔ اس کے بعد خرچ کرنے کی ترغیب دی ہے اور بھلائی اس بات پر موقوف بتائی ہے کہ کنجوسی نہ کی جائے۔ فرمایا:

اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ اَمَلًا (۱۸ : ۴۶)	مال اور بیٹے، دنیا کی زندگی کی رونق ہیں، اور باقی رہنے والی نیکیاں تیرے پروردگار کے پاس بہتر ثواب اور بہتر توقع کا ذریعہ ہیں۔

اس آیت پر سورۂ کہف کی ابتدائی آیتوں کے ساتھ غور کرو۔

فرمایا:

اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (۱۸ : ۷)	جو کچھ زمین پر ہے ہم نے اُسے زمین کی رونق بنادیا ہے تاکہ انسانوں کی آزمائش کریں کہ اُن میں کون زیادہ اچھے عمل والا ہے

یہاں عمل سے مراد یہ ہے کہ زمین کو آباد کیا جائے، اور یہ کہ سب سے اچھا عمل وہ ہے جو لوگوں کے لیے سب سے زیادہ مفید اور شکرگزاری کے

لحاظ سے خدا کو سب سے زیادہ پسند ہے۔

مال غنیمت کو اُس کے مستحقوں میں تقسیم کر دینے کی حکمت یہ بیان فرمائی ہے:

کَیْ لَا یَکُوْنَ دُوْلَۃً بَیْنَ الْاَغْنِیَاءِ مِنْکُمْ۔	تاکہ مال تمھارے دولتمندوں ہی میں گردش نہ کرتا رہے۔

اور فرمایا:

وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَالْفِضَّۃَ وَلَا یُنْفِقُوْنَھَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَبَشِّرْھُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ (۹: ۳۴)	جو لوگ سونے چاندی کے خزانے جمع کرتے ہیں اور اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے اُنہیں سخت عذاب کی بشارت سنا دو!

مال کے فتنہ ہونے کے بارے میں بکثرت آیات وارد ہوئی ہیں جن پر ہم نے اپنی تفسیر میں جا بجا گفتگو کی ہے۔

چنانچہ کئی آیتوں میں فرمایا گیا ہے کہ کامیابی و شادکامی، مال خرچ کرنے سے وابستہ ہے اور بدبختی، کنجوسی کے ساتھ آتی ہے۔ ذیل کی آیت میں ترغیب و ترہیب دونوں کو جمع کر دیا ہے:

وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ وَاَحْسِنُوْا اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ (۲: ۱۹۵)	اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ نیکی کرو، خدا نیکی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

یعنی اللہ کی راہ میں مال نہ خرچ کرنا، ہلاکت کا ایک سبب ہے۔

اور سورۂ لیل میں فرمایا:

فَاَمَّا مَنۡ اَعۡطٰی وَ اتَّقٰی ، وَ صَدَّقَ بِالۡحُسۡنٰی ، فَسَنُیَسِّرُہٗ لِلۡیُسۡرٰی ، وَ اَمَّا مَنۡۢ بَخِلَ وَ اسۡتَغۡنٰی ، وَ کَذَّبَ بِالۡحُسۡنٰی ، فَسَنُیَسِّرُہٗ لِلۡعُسۡرٰی ، وَ مَا یُغۡنِیۡ عَنۡہُ مَالُہٗۤ اِذَا تَرَدّٰی ۔

(۹۲ : ۶ تا ۱۱)

جس نے مال دیا اور ڈر رکھا، اور بھلی بات کو سچ جانا، اُسے ہم سہج سہج آسانی میں پہنچا دینگے، اور جس نے نہ دیا اور بے پروا رہا اور جھوٹ جانا بھلی بات کو تو اُسے ہم سہج سہج سختی میں پہنچا دینگے اور جب وہ گڑھے میں گریگا، اُس کا مال کام نہ آئے گا۔

یہ آیات تفصیل ہیں "اِنَّ سَعۡیَکُمۡ لَشَتّٰی" (تمھاری کوشش مختلف ہے) کی جس کا اجمال و اختصار کے ساتھ مطلب یہ ہے کہ مال کے کمانے اور خرچ کرنے میں تمھاری کوششیں، آغاز و انجام، طریقہ و نتیجہ کے لحاظ سے مختلف ہیں، لیکن جو شخص اپنے ذمہ واجب شخصی اور قومی حقوق ادا کرتا ہے، اُن انفرادی و اجتماعی نقصانوں سے بچتا ہے جو ان حقوق کے نہ ادا کرنے سے پیدا ہوتے ہیں۔ تو خدا یہ کرتا ہے کہ اعمال میں نفسی صفات کے اثر اور خاص و عام معاملات میں اعمال کے اثر سے متعلق اپنی مقرر سنتوں کے بموجب ایسے شخص کے لیے بھلائی اور خوبی کا راستہ آسان کر دیتا ہے، چنانچہ وہ شخص خود بھی نفع اٹھاتا ہے۔ لوگ بھی اُس سے خوش ہوتے ہیں، اور خدا بھی راضی ہو جاتا ہے، لیکن جو

کوئی اِن حقوق کے ادا کرنے میں بخل برتتا ہے، اور اپنے مال کے گھمنڈ پر لوگوں کی تعریف و مجت سے اور اللہ کی رضامندی و ثواب سے بے نیاز بن جاتا ہے اور ثواب سے متعلق وعدۂ الٰہی کی تکذیب کرتا ہے، زبان سے نہ سہی، عمل سے سہی، تو خدا اپنی مذکورۂ بالا سنتوں کے مطابق اُس کے لیے سب سے زیادہ مشکل راستہ آسان کر دیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سب لوگ اُس سے بیزار ہو جاتے ہیں۔ اُس کے دشمن بن جاتے ہیں۔ خدا بھی اُس سے ناخوش ہوتا ہے اور دوارین میں اُسے بدترین بدلہ ملتا ہے۔

اِس حقیقت کی تائید دفعہ ۲ کی آیات سے ہوتی ہے اور وہ حسب ذیل ہیں:

۲ــــ دولت کی سرکشی و غرور

سورۂ فلق میں خدا فرماتا ہے:

كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰٓى اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى۔	جب آدمی اپنے آپ کو مالدار دیکھتا ہے تو سرکشی پر اُتر آتا ہے۔

یہ آیت اور اس کے بعد کی آیتیں، ابوجہل کے بارے میں نازل ہوئی ہیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کا سب سے بڑا دشمن تھا، اور یہ اِس بارے میں اوّلین آیتیں ہیں۔ اِسی طرح یہ سورۃ ہے:

تَبَّتْ يَدَآ اَبِىْ لَهَبٍ وَّتَبَّ	ابولہب کے ہاتھ ٹوٹیں اور وہ برباد ہو جائے۔

مَا أَغْنَىٰ عَنْهُ مَالُهُ وَمَا كَسَبَ سَيَصْلَىٰ نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ، وَامْرَأَتُهُ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ فِي جِيدِهَا حَبْلٌ مِنْ مَسَدٍ۔	اُس کے کام نہ اُس کا مال آیا نہ کمائی عنقریب شعلہ زن آگ میں داخل ہوگا اور اُس کی بیوی بھی جو لکڑیاں اٹھا کر لاتی ہے (یعنی چغل خور اور فتنہ پرداز ہے) اس کی گردن میں بٹی ہوئی رسی ہوگی۔

اسی طرح سورۂ ہمزہ میں ہے:

وَيْلٌ لِكُلِّ هُمَزَةٍ لُمَزَةٍ، الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَعَدَّدَهُ، يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ كَلَّا لَيُنْبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ، وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْحُطَمَةُ، نَارُ اللَّهِ الْمُوقَدَةُ، الَّتِي تَطَّلِعُ عَلَى الْأَفْئِدَةِ، إِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُؤْصَدَةٌ فِي عَمَدٍ مُمَدَّدَةٍ۔	ہلاکت ہے ہر غیبت کرنے والے طعنہ باز کے لیے جو مال جمع کرتا اور اُسے بار بار گنتا ہے۔ سمجھتا ہے کہ اُس کا مال سدا اُس کے پاس رہیگا ہرگز نہیں۔ یہ شخص عنقریب برباد کن آگ میں جھونک دیا جائے گا، اور کیا تم جانتے ہو وہ آگ کیا ہے؟ وہ اللہ کی آگ ہے جو بھڑکائی گئی ہے، جو دلوں تک پہنچ جائے گی۔ وہ بدراہوں پر گھیر دیجائیگی لمبے لمبے ستونوں میں۔

یہ سورۃ، ولید اور اُمیہ بن خلف کے حق میں نازل ہوئی تھی۔

اسی طرح یہ آیت ہے:

ذَرْنِي وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيدًا، وَجَعَلْتُ لَهُ مَالًا مَّمْدُودًا، وَّبَنِينَ شُهُودًا، وَّمَهَّدتُّ لَهُ تَمْهِيدًا، ثُمَّ يَطْمَعُ أَنْ أَزِيدَ، كَلَّا إِنَّهُ كَانَ لِآيَاتِنَا عَنِيدًا، سَأُرْهِقُهُ صَعُودًا

(۷۴: ۱۱ تا ۱۷)

چھوڑ دو مجھے اور اُسے اکیلا جسے میں نے پیدا کیا اور دیا مال بہت سا اور حاضر باش بیٹے، اور ہمواری کر دی اُس کے لیے پوری ہمواری، اِس پر بھی لالچ رکھتا ہے کہ اور زیادہ دونگا۔ ہرگز نہیں۔ وہ ہماری آیتوں کا کٹّر مخالف ہے۔ عنقریب اُسے چڑھاؤں گا بڑی چڑھائی!

یہ آیات، ولید بن مغیرہ کے حق میں نازل ہوئی ہیں۔

اِسی طرح سورۂ نون میں فرمایا:

وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ، هَمَّازٍ مَّشَّاءٍ بِنَمِيمٍ، مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ أَثِيمٍ، عُتُلٍّ بَعْدَ ذَٰلِكَ زَنِيمٍ، أَن كَانَ ذَا مَالٍ وَّبَنِينَ، إِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِ آيَاتُنَا قَالَ أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ۔

(۶۸: ۱۰ تا ۱۵)

نہ کہا مان کسی قسمیں کھانے والے کی جو بے قدر ہے۔ طعنے دیتا ہے۔ چغلی لیے پھرتا ہے۔ نیکی سے روکتا ہے۔ زیادتی کرتا ہے۔ گنہگار ہے اور اس سب کے بعد بدنام ہے، اور یہ سب بدیاں اس لیے کہ مال اور بیٹے رکھتا ہے جب ہماری باتیں اُسے سنائی جاتی ہیں، تو کہتا ہے یہ اگلوں کی کہانیاں ہیں۔

یہ لوگ، سرداران قریش میں سب سے زیادہ مالدار تھے۔

اِنہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بَیر باندھا تھا اور محض اپنی دولتمندی کی وجہ سے متکبر بن کر آپ کے ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ اِنہی کی نسبت خدا نے فرمایا ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ لِیَصُدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ، فَسَیُنْفِقُوْنَھَا ثُمَّ تَکُوْنُ عَلَیْھِمْ حَسْرَۃً ثُمَّ یُغْلَبُوْنَ (۸: ۳۶)	کافر لوگ اپنا مال اس لیے خرچ کرتے ہیں کہ اللہ کی راہ سے مخلوق کو باز رکھیں۔ سو ابھی اور خرچ کریں، پھر اُن کا یہ مال اُن کے حق میں پچھتاوا بن جائے گا اور آخرکار مغلوب ہو کر رہ جائیں گے۔

نیز اِنہی کے حق میں اور انبیاء کی قوموں کے ایسے ہی لوگوں کے حق میں فرمایا ہے:

وَقَالُوْا نَحْنُ اَکْثَرُ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا وَّ مَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِیْنَ۔	وہ کہنے لگے ہمارے پاس سب سے زیادہ مال و اولاد ہے اور ہمیں ہرگز عذاب میں نہیں مبتلا کیا جائے گا۔

اس سلسلہ میں عام انسانی فطرت کے بارے میں فرمایا ہے:

وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ (۴: ۱۲۸)	انسان حریص واقع ہوا ہے۔

اور سورۂ معارج میں فرمایا:

اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ	انسان کم ہمت پیدا ہوا ہے جب اُسے تکلیف

هَلُوعًا، إِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوعًا، وَإِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوعًا، إِلَّا الْمُصَلِّينَ الَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ، وَالَّذِينَ فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَعْلُومٌ، لِلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ الخ (۷۰: ۱۹ تا ۲۵)

پہنچتی ہے تو بہت ڈرجاتا ہے جب فارغ البالی حاصل ہوتی ہے تو حقوق ادا کرنے سے بخل کرنے لگتا ہے، بجز نمازیوں کے جو اپنی نماز کے پابند ہیں اور جن کے مال میں سوالی اور بے سوالی سب کا حق ہے۔

اِسی قسم کی آیتیں دیکھ کر زاہد لوگ، مال اور دنیا سے بیزار ہو کر غلو کا شکار ہو گیے ہیں، حالانکہ جو چیز مذموم ہے، وہ مال و دولت کی وجہ سے غرور و سرکشی اور حق سے دوری ہے، اِسی لیے بعض آیتوں میں مال کے ساتھ اولاد کو بھی ذکر کیا ہے۔ اسی طرح کنجوسی اور ناجائز طریقوں سے لوگوں کا مال کھانے کی مذمت کی ہے، جس کے شواہد حسب ذیل ہیں:

(۳۔ بخل، اور مال خرچ کرنے میں ریاکاری)

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ هُوَ خَيْرًا لَهُمْ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَهُمْ، سَيُطَوَّقُونَ مَا بَخِلُوا بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ

جو لوگ اللہ کے بخشے ہوئے فضل کو خرچ کرنے میں بخل کر رہے ہیں، ہرگز نہ سمجھیں کہ یہ بخل اُن کے حق میں اچھا ہے، بلکہ یہ بہت برا ہے۔ قیامت کے دن اُسی چیز کے طوق میں گرفتار

(۳: ۱۸۰)	کیے جائیں گے جس کا بخل کر رہے ہیں۔

اور ترغیب دی ہے کہ اللہ کی راہ میں اپنا حلال مال خرچ کرو، اور اخلاص کے ساتھ خرچ کرو۔ نہ ریاکاری سے کام لو نہ احسان جتاؤ، چنانچہ فرمایا:

اَلشَّیطَانُ یَعِدُکُمُ الْفَقْرَ وَیَاْمُرُکُمْ بِالْفَحْشَاءِ وَاللّٰہُ یَعِدُکُمْ مَغْفِرَۃً مِنْہُ وَفَضْلًا، وَاللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیْم (۲: ۲۶۸)	شیطان تمھیں غربت سے ڈراتا اور بدکاری کا حکم دیتا ہے، لیکن اللہ تم سے اپنی مغفرت و فضل کا وعدہ کرتا ہے، اللہ، واسع ہے اور بہت علم والا۔

اور والدین، قریبی رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، اور پڑوسیوں سے اچھے برتاؤ کا حکم دے کر فرمایا:

وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ کُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ، الَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ وَیَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ (۴: ۳۵)	خدا اکڑنے والوں اور فخر کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا جو بخل کرتے اور لوگوں کو بخل کرنے کا حکم دیتے ہیں۔

اور اُس شخص کے بارے میں ارشاد ہوا ہے جس نے خدا سے عہد کیا تھا کہ اگر اُسے اپنے فضل سے تونگر بنا دے گا تو اپنے مال میں سے ضرور خیرات کرے گا:

فَلَمَّا آتَاھُمْ مِنْ فَضْلِہٖ	جب خدا نے اپنا فضل بخشا، تو بخل کرنے

بَخِلُوا بِهٖ وَتَوَلَّوا وَّهُم مُّعرِضُونَ فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِیْ قُلُوبِهِمْ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ بِمَا اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوهُ وَبِمَا كَانُوا يَكْذِبُونَ (۹ : ۷۷)	لگے اور اعراض کی راہ سے پھر گیے۔ اِس پر خدا نے یہ سزا دی کہ اُن کے دلوں میں قیامت تک کے لیے نفاق ڈال دیا، کیونکہ اُنہوں نے اللہ سے وعدہ خلافی کی اور جھوٹ بولا کرتے تھے۔

اور فرمایا:

هٰاَنْتُمْ هٰۤؤُلَاءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوا فِیْ سَبِيلِ اللّٰهِ فَمِنْكُمْ مَّنْ يَّبْخَلُ، وَمَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ، وَاللّٰهُ الْغَنِىُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَاۤءُ، وَاِنْ تَتَوَلَّوا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ، ثُمَّ لَا يَكُونُوۤا اَمْثَالَكُمْ (۴۷ : ۳۸)	تم وہ ہو کہ تمھیں دعوت دی جارہی ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔ مگر تم میں ایسے بھی ہیں جو بخل کرتے ہیں۔ جو بخل کرتا ہے تو اپنے ہی حق میں بخل کرتا ہے۔ اللہ تونگر ہے اور تم لوگ فقیر ہو۔ اگر تم روگردانی کرو تو خدا تمھاری جگہ دوسری قوم کھڑی کردے گا اور وہ تمھاری جیسی نہ ہوگی۔

یعنی اگر راہ خدا میں خرچ کرنے سے روگردانی کرو گے تو خدا تمھارا دَور ختم کرکے تمھیں برباد کر ڈالے گا اور دوسرے لوگوں کو تمھاری جگہ کھڑا کردے گا جو قوم کی عام مصلحتوں پر، ملک کی مدافعت پر، اور حق و انصاف قائم کرنے پر اپنا روپیہ خرچ کریں گے۔

اور فرمایا:

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا لَا تَاكُلُوا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّا اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ (۴: ۲۹)	اے ایمان والو، اپنا مال آپس میں ناجائز طریقہ سے نہ کھاؤ الا یہ کہ باہمی رضامندی سے تجارت ہو۔

اور فرمایا:

وَلَا تَاكُلُوا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوا بِهَا اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاكُلُوا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۲: ۱۸۸)	آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طور پر نہ کھاؤ اور (جھوٹا مقدمہ بنا کر) حکام کے پاس نہ لے جاؤ تاکہ اس طرح جان بوجھکر گناہ کی راہ سے لوگوں کا کچھ مال کھا جاؤ۔

اور یہودیوں کے حق میں فرمایا:

فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا، وَاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا (۴: ۱۶۰، ۱۶۱)	یہودیوں کے ظلم کی وجہ سے ہم نے اُن پر وہ ستھری چیزیں حرام کر دیں جو حلال تھیں، اور اس وجہ سے کہ وہ اللہ کی راہ سے بہت روکتے تھے، اور سود کھاتے تھے، حالانکہ اس کی انہیں ممانعت تھی، اور ناجائز طریقہ پر لوگوں کا مال کھاتے تھے۔ اُن میں سے کفر کرنے والوں کے لیے ہم نے سخت عذاب طیار کر رکھا ہے۔

اور فرمایا:

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اِنَّ كَثِیْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَیَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَیَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ، وَالَّذِیْنَ یَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا یُنْفِقُوْنَهَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ، یَّوْمَ یُحْمٰى عَلَیْهَا فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ، هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ (۹: ۳۴ تا ۳۵)	اے ایمان والو، بہت سے عالم اور درویش ناجائز طریقہ پر لوگوں کا مال کھاتے اور اللہ کی راہ سے روکتے ہیں۔ جو لوگ سونا چاندی جمع کرتے ہیں اور اللہ کی راہ میں اُسے خرچ نہیں کرتے، اُنہیں دردناک عذاب کی بشارت سنادو، جب دوزخ کی آگ میں تپایا جائیگا یہ سونا چاندی اور داغے جائیں گے اُس سے اِن کے ماتھے اور پہلو، اور پیٹھیں، پھر کہا جائےگا دیکھو یہ ہے جو تم نے اپنے لیے جمع کیا تھا۔ اب چکھو اپنے خزانوں کا مزہ!

(۴ ـــ مال، اللہ کی نعمت ہے اور ایمان و عمل صالح کا معاوضہ)

سورۂ نوح میں حضرت نوح علیہ السلام کا یہ قول نقل فرمایا ہے:

فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا، یُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَیْكُمْ مِّدْرَارًا، وَّیُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِیْنَ وَیَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ	میں نے اُن سے کہا کہ اپنے پروردگار سے گناہ بخشواؤ، وہ بڑا بخشنے والا ہے۔ کثرت سے تم پر بارش بھیجے گا اور تمہارے مال و اولاد میں ترقی دیگا اور تمہارے لیے باغ لگادے گا

وَيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهَارًا۔	اور نہریں جاری کر دے گا۔

اور سورۂ ہود میں ہود علیہ السلام کا قول نقل فرمایا ہے:

وَيَا قَوْمِ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوبُوا اِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُمْ مِدْرَارًا وَيَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِيْنَ (۱۱: ۵۲)	اے میری قوم والو، گناہ بخشاؤ اپنے پروردگار سے پھر اُس کی طرف رجوع کرو، وہ تم پر خوب برسائے گا مینھ اور تمھاری قوت میں اور بھی اضافہ کر دیگا۔ گناہ گار بن کر اُس سے منھ نہ موڑو۔

اور آدم و حوا، اور اُن کی اولاد پر دینی ہدایت کے احسان کا ذکر کر کے سورۂ طٰہٰ میں فرمایا:

قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى۔ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى۔ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْٓ اَعْمٰى وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا، قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا وَ	خدا نے فرمایا، اُترے چلے جاؤ یہاں سے اکٹھے۔ رہو گے ایک دوسرے کے دشمن۔ لیکن جب کبھی میری طرف سے تمھارے پاس ہدایت آئے تو میری ہدایت کی جو پیروی کرے گا وہ نہ بہکے گا نہ تکلیف میں پڑے گا۔ اور جو میری یاد سے روگردانی کرے گا اُس کی گذران تنگ ہوگی اور ہم اُسے قیامت کے دن اندھا اٹھائیں گے۔ وہ کہے گا اے پروردگار، تو نے مجھے اندھا کر کے کیوں اٹھایا حالانکہ میں [illegible] خدا

وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى ۔ (۲۰: ۱۲۲ تا ۱۲۴)	فرمائے گا جس طرح ہماری نشانیاں تیرے پاس پہنچی تھیں، مگر تو اُنہیں بھول گیا تھا اُسی طرح آج ہم تجھے بھلا دیں گے۔

اِس سے معلوم ہوا کہ دین کی ہدایت پر چلنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی دنیا کی بدبختی سے محفوظ رہتا اور کشادہ معیشت حاصل کرتا ہے، لیکن جو کوئی دین کی ہدایت سے اعراض کرتا ہے، اُس کی معیشت تنگ ہو جاتی ہے۔

اسی کے ہم معنی سورۂ جن میں ہے:

وَاِنَّا لَمَّا سَمِعْنَا الْهُدٰى اٰمَنَّا بِهٖ فَمَنْ يُّؤْمِنْ بِرَبِّهٖ فَلَا يَخَافُ بَخْسًا وَّلَا رَهَقًا (۷۲: ۱۳)	ہم نے جب ہدایت کی بات سنی تو اُس پر ایمان لے آئے۔ جو کوئی اپنے پروردگار پر ایمان لاتا ہے، اُسے نہ کسی کمی کا اندیشہ ہوگا نہ کسی زیادتی کا۔

یعنی ایسے آدمی کا کوئی حق تلف نہیں ہوتا اور نہ اُسے ذلت اٹھانا پڑتی ہے، کیونکہ ایمان کی عزت اُسے بچاتی اور محفوظ رکھتی ہے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

اور خاص دنیا کے بارے میں فرمایا:

وَاَنْ لَّوِ اسْتَقَامُوْا عَلَى	اگر یہ لوگ ہدایت کے راستہ پر استوار ہو جاتے

الطَّرِيْقَةِ لَاَسْقَيْنٰهُمْ مَّآءً غَدَقًا لِّنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ وَمَنْ يُّعْرِضْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهٖ يَسْلُكْهُ عَذَابًا صَعَدًا۔ (۷۲: ۱۶ و ۱۷)	تو ہم اُنہیں فراغت کے پانی سے سیراب کرتے تاکہ اِس میں اُن کی آزمائش کریں۔ اور جو شخص اپنے پروردگار کی یاد سے روگردانی کریگا تو خدا اُسے سخت عذاب میں داخل کرے گا۔

یہی حقیقت جس سے مفسروں نے غفلت کی ہے، اُس آیت میں بھی بیان فرمائی گئی ہے جس میں بت پرستوں کو مسجد حرام میں داخل ہونے سے منع کیا ہے۔ فرمایا:

وَاِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيْكُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖٓ اِنْ شَآءَ (۹: ۲۸)	اگر تم فقر سے ڈرتے ہو تو خدا چاہے گا تو اپنے فضل سے تمھیں خوشحال بنا دے گا۔

یعنی اگر تم اِس بات سے ڈرتے ہو کہ مشرکوں کے نہ آنے سے مکّہ اپنی اُس آمدنی سے محروم ہو جائے گا جو موسم حج وغیرہ میں اُن سے حاصل ہوتی ہے، تو ڈرو نہیں، کیونکہ خدا تمھیں اسلام اور اُس کی غنیمتوں اور فتوحات سے مالامال کر دے گا۔

اِسی طرح اُن لوگوں سے فرمایا جو بدر میں قید ہو کر آئے تھے اور اپنی آزادی کے لیے اُنہیں فدیہ دینا پڑا تھا:

اِنْ يَّعْلَمِ اللّٰهُ فِيْ	اگر خدا تمھارے دلوں میں نیکی جانے گا تو

قُلُوبِکُمْ خَیْرًا یُّؤْتِکُمْ خَیْرًا مِّمَّا اُخِذَ مِنْکُمْ (۸: ۱۰۰)	نعمیں اُس سے بہتر دے دیگا جو تم سے چھین گیا ہے۔

اور ہوا بھی یہی۔ خدا نے فاقہ مست عربوں کو اسلام کی برکت سے تونگر کر دیا اور وہ دنیا کی سب سے زیادہ دولتمند قوم بن گیے (دیکھو تفسیر جلد ۱)۔

خود اپنے نبی اعظم صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی اِسی مال کا احسان جتایا ہے "وَوَجَدَکَ عَائِلًا فَاَغْنٰی" اور ایک الگ سورۃ میں آپ کی قوم پر اِسی چیز کا احسان جتایا ہے کہ خدا ہی نے اِن لوگوں کو جاڑے اور گرمی میں تجارتی سفر کی توفیق بخشی ہے۔ بکثرت مال کو لفظ "خیر" سے موسوم کیا ہے "وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَیْرِ لَشَدِیْدٌ" اور "اِنْ تَرَکَ خَیْرًا اَلْوَصِیَّةُ لِلْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ" خدا کے مومن و متقی و شکر گزار بندے، دنیاوی نعمتوں کے اُن لوگوں سے زیادہ مستحق ہیں جو کفران نعمت اور فسق و ظلم سے آلودہ ہیں۔ اور یہ اِس لیے کہ مومن بندے ہی اِن نعمتوں کا پورا پورا شکر ادا کر سکتے ہیں، اور شکر یہی ہے کہ نعمت اُس حکمت کے بموجب استعمال کی جائے جس کی بنا پر بخشی گئی ہے، چنانچہ حق، انصاف، نیکی، احسان، اور دنیا کی آبادی کے لیے خرچ کی جائے۔ خدا بھی اِسی بات سے خوش ہوتا ہے اور اُس کا قانون یہ ہے کہ شکر، نعمت کو بڑھاتا اور بُرے استعمال کی صورت

میں ناشکری اُسے گھٹاتی ہے۔ پوری نعمت کو اور اُس کے فوائد کو چھین لیتی ہے۔ چنانچہ فرمایا:

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ (۱۴:۷)	اور خدا نے اعلان کر دیا کہ اگر شکر ادا کرو گے تو تمیں اور زیادہ دوں گا، اور اگر ناشکری کرو گے تو میرا عذاب بہت سخت ہے۔

اور فرمایا:

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (۸:۵۳)	خدا کسی قوم پر اپنی مبذول نعمت کو اُس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ قوم خود اپنی حالت کو بدل نہ ڈالے۔

زراعت، صناعت، تجارت وغیرہ اسبابِ رزق میں مومن و کافر سب شریک ہیں، کیونکہ یہ دنیاوی اسباب ہیں اور دین کے اختلاف سے اُن میں کمی بیشی نہیں ہوتی، جیسا کہ فرمایا:

كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا۔ (۱۷:۲۰)	تیرے رب کی بخشش سے ہم دیتے رہتے ہیں اِنہیں بھی اور اُنہیں بھی، اور تیرے رب کی بخشش پر پابندی عائد نہیں کی گئی ہے۔

یعنی خدا کی بخشش کا دروازہ سب کے لیے یکساں طور پر کھلا

ہوا ہے، اُن لوگوں کے لیے بھی جو دنیا کی ناپائیدار زندگی کی راحتیں چاہتے ہیں اور اُن کے لیے بھی جو آخرت کی شادکامیوں کے طالب ہیں، مگر ہاں مال کے استعمال میں لوگ ایک دوسرے پر فضیلت پاتے ہیں۔ چنانچہ فسق و شر، ظلم و اسراف، اور اِترانے کے لیے مال خرچ کرنا، ناشکری ہے، اور اِس نعمت یا اُس کی برکت کی بربادی کا موجب، نیز اِس بے جا استعمال سے بکثرت نقصان و فساد پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہ مشاہدہ ہے کہ اکثر مُسرف و فاسق دولتمند، مفلس و قلاش ہو جاتے ہیں یا خوفناک بیماریوں کا شکار بن جاتے ہیں۔ اِسی طرح مُسرف و ظالم قومیں کمزور ہو کر اپنی آزادی و خودمختاری کھو بیٹھتی ہیں۔ لیکن مال کو بھلائی اور نیکی کے کاموں میں خرچ کرنے سے اُس میں افزونی ہوتی ہے۔ اِس موضوع کی ہم دوسرے مقامات میں پوری تحقیق لکھ چکے ہیں۔ اور اِس آیت کی تفسیر میں بھی:

قُلْ هِيَ لِلَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ (۷: ۳۵)	آپ کہہ دیجئے کہ یہ نعمتیں مومنوں کے لیے دنیا کی زندگی میں ہیں اور خالص اُنہی کی ہونگی قیامت کے دن۔

یعنی مومنوں کو یہ نعمت، دنیا میں مستحق ہونے کی وجہ سے ملتی ہے، اور اسباب کے اقتضاء سے دوسرے لوگ بھی اِس میں اُن

کے شریک بن جاتے ہیں، لیکن آخرت میں یہ خاص مومنوں ہی کے لیے ہوگی، کیونکہ وہ شکر کے ذریعہ آخرت کی کامل ولازوال سعادت اُس سے طلب کرتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا، تو خدا، دنیا کی زینت کو صرف کافروں ہی کے لیے خاص کر دیتا، جیسا کہ فرمایا:

وَلَوْلَا أَنْ يَكُونَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً لَجَعَلْنَا لِمَنْ يَكْفُرُ بِالرَّحْمَٰنِ لِبُيُوتِهِمْ سُقُفًا مِنْ فِضَّةٍ وَمَعَارِجَ عَلَيْهَا يَظْهَرُونَ ۔ وَلِبُيُوتِهِمْ أَبْوَابًا وَسُرُرًا عَلَيْهَا يَتَّكِئُونَ وَزُخْرُفًا وَإِنْ كُلُّ ذَٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا، وَالْآخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِينَ ۔

(۴۳ : ۳۲)

اگر یہ بات نہ ہوتی کہ لوگ ایک ہی امت بن جاتے تو ہم رحمان سے کفر کرنیوالوں کے گھروں کی چھتیں چاندی کی کر دیتے اور بلند زینے جن پر وہ چڑھتے اور اُن کے گھروں میں پھاٹک لگا دیتے اور تخت دیتے جن پر یہ لوگ آرام سے بیٹھتے اور سونے کی چیزیں دیتے، مگر یہ سب چیزیں دنیا کی زندگی ہی کے چوچلے ہیں، اور آخرت تیرے پروردگار کے پاس پرہیزگاروں ہی کے لیے ہے۔

(۵ ـــــ مال کی حفاظت اور کفایت شعاری)

خداوند جل وعلا فرماتا ہے:

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ | بے عقلوں کو اپنا مال نہ دو جسے خدا نے تمھاری

أَمْوَالَكُمُ الَّتِي جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيَامًا وَّارْزُقُوهُمْ فِيهَا وَاكْسُوهُمْ وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوفًا ۔ وَابْتَلُوا الْيَتَامٰى حَتّٰى إِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ فَإِنْ آنَسْتُم مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوا إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ وَلَا تَأْكُلُوهَا إِسْرَافًا وَّبِدَارًا أَن يَّكْبَرُوا ، وَمَن كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ وَمَن كَانَ فَقِيرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوفِ ، فَإِذَا دَفَعْتُمْ إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ فَأَشْهِدُوا عَلَيْهِمْ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيبًا (۴: ۵و۶)

گزران (کا ذریعہ) بنایا ہے اُنہیں اس میں سے کھلاؤ اور پہناؤ اور اُن سے اچھی بات کہو۔ اور سدھارتے رہو یتیموں کو یہاں تک کہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں۔ اب اگر اُن میں ہوشیاری دیکھو تو اُنہیں اُن کا مال دے دو اور اُن کا مال اُڑا کر اور اِس ڈر سے گھبرا کر نہ کھا جاؤ کہ کہیں بڑے نہ ہو جائیں۔ جو شخص خوشحال ہے اُسے اُن کا مال کھانے سے بچنا چاہیے اور جو فقیر ہے تو بھلائی کے ساتھ کھائے۔ اور جب اُنہیں اُن کا مال سپرد کرو تو گواہ قائم کر لو اور اللہ حساب کرنے والا کافی ہے۔

اِس آیت میں حکم دیا ہے کہ یتیموں کی جانچ کرو اور اُن کا مال اُن کے سپرد اُس وقت تک نہ کرو جب تک دیکھ نہ لو کہ وہ اپنے کاموں میں پوری طرح سمجھدار ہو گئے ہیں، تاکہ مال کو نقصان دہ کاموں میں یا بے فائدہ طور پر ضائع نہ کر دیں۔

مومنوں کی صفتیں بیان کرتے ہوئے خدا فرماتا ہے:

وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا (۲۵: ۶۷)	اور جب خرچ کرتے ہیں، تو نہ اسراف کرتے ہیں نہ بخل سے کام لیتے ہیں، بلکہ اعتدال کی راہ اختیار کرتے ہیں۔

اور فرمایا:

لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّآ اٰتٰىهُ اللّٰهُ (۶۵: ۷)	اور مال دار اپنے مال میں سے خرچ کریں اور جس کا رزق تنگ ہے، وہ اُس میں سے خرچ کرے جو خدا نے اُسے دیا ہے۔

یہ آیت اُس مطلّقہ عورت کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو عدّت میں ہو۔ عام خرچ کے بارے میں فرمایا:

وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (۲: ۲)	ہم نے اُنہیں جو کچھ دیا ہے اُس میں سے وہ خرچ کرتے ہیں۔

اِس آیت کی رُو سے ہر مومن کے لیے ضروری ہے عام اِس سے کہ مال دار ہو یا فقیر، کہ جو کچھ بھی خدا نے اُسے دیا ہے، سب نہیں، بلکہ اُس میں سے کچھ خرچ کرے، اور یہ کفایت شعاری کا سب سے بڑا اصول ہے، کیونکہ جو شخص اپنی کمائی کا کچھ حصہ خرچ کرتا اور کچھ بچاتا ہے وہ شاذ و نادر ہی فقیر ہوتا ہے۔ سورۂ اسراء کی تفسیر میں اِس بحث پر ہم گفتگو کر چکے ہیں کہ اسراف اور بخل کی خرابیاں کیا ہیں۔

(۴) ۔راہ خدا میں مال خرچ کرنا، ایمان کی نشانی، قوم کی زندگی، سلطنت کا دبدبہ اور انسانی سعادت کا ذریعہ ہے'

یہی وہ اصلی بنیاد ہے جس پر تمام مالی آیاتِ قرآنی کا مدار ہے، اور اسی بارے میں زیادہ تر آیتیں نازل ہوئی ہیں۔ جن چیزوں کا ذکر گزر چکا ہے، وہ اِسی اصل کے وسائل ہیں، اور اس کے بعد جو کچھ آئے گا اِسی کی شرح و بیان ہوگا۔ دلیل یہ ہے کہ خدا نے اِسی چیز کو ایمان کی اصلی میزان بتایا ہے۔ جو اس میزان میں پورا اترے گا، اُسے سچا مومن سمجھا جائیگا بغیر عملی دلیل و ثبوت کے ایمان کا دعویٰ، باطل ہے، اگرچہ اسلام کا زبان سے دعویٰ بھی قبول کر لیا جائے گا، کیونکہ اسلام کے عملی احکام کی بنیاد ظواہر پر ہے، اور نیتوں کا معاملہ اللہ کے ہاتھ میں ہے، جن کے بموجب آخرت میں جزا یا سزا مقرر ہوگی۔ اسلام، ایک ایسے عمل کا نام ہے جو محض ظاہری بھی ہو سکتا ہے، اور جس کی پشت پر سچا ایمان و عقیدہ ہونا ضروری نہیں، لیکن ایمان، قلبی یقین کا نام ہے جس کے ساتھ اعمال اسلام کا ہونا لازمی ہے، گو نفاق کے بغیر نیک نیتی کے ساتھ ظاہری اِسلام بھی، ایمان کے قریب ہوتا ہے۔ اِس بارے میں آیتِ ذیل بنیاد کا حکم رکھتی ہے:

قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا قُلْ لَمْ تُؤْمِنُوا وَلَٰكِنْ قُولُوا أَسْلَمْنَا	بدوی لوگ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں۔ اے پیغمبر، آپ کہہ دیجئے کہ تم ایمان نہیں

وَ لَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِیْ قُلُوْبِكُمْ وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْـًٔا، اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ، اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ۔(۱) (۴۹ : ۱۴ و ۱۵)	لائے ہو، بلکہ یوں کہو کہ ہم اسلام لائے ہیں۔ ایمان تو اب تک تمھارے دلوں میں داخل ہی نہیں ہوا۔ اگر تم اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت کروگے تو وہ تمھارے عمل کے ثواب میں کوئی کمی نہیں کریگا۔ اللہ غفور رحیم ہے۔ مؤمن تو وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے ہیں، پھر شک میں نہیں پڑے اور اللہ کی راہ میں اپنے مال و جان سے جہاد کیا۔ یہی لوگ سچے ہیں۔

دیکھو، مالی جہاد کو جان کے جہاد پر مقدم رکھا اور اسی کو ایمان کی سچائی اور دعوائے ایمان کی صداقت کی کسوٹی قرار دیا ہے۔

اب وہ آیت دیکھیے جس میں بتایا گیا ہے کہ اللہ کی محبت میں روپیہ خرچ کرنا، ایمان کی سب سے بڑی نشانی ہے۔ اِس کے بعد نماز کا

---

(۱) اعراب: صرف بدوی یعنی صحرائی لوگوں کو کہتے ہیں۔ یہ آیتیں، قبیلۂ بنی اسد کے بارے میں نازل ہوئی ہیں جو قحط کی وجہ سے اسلام لے آئے تھے تاکہ مسلمان اُنہیں خیرات دیں، بعد میں یہ لوگ سچے مسلمان بن گئے۔

پھر زکاۃ کا ذکر آتا ہے جسے مسلمانوں کا امام ہر شخص سے لازمی طور پر وصول کرے گا۔ اِس کے بعد دوسری بنیادی نیکیاں اور اعلیٰ اخلاق آتے ہیں۔ یہ آیت حسب ذیل ہے:

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّيْنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتَامٰى وَالْمَسَاكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَ	یہ بھلائی نہیں ہے کہ اپنا منھ پورب اور پچھم کی طرف کرو، لیکن بھلائی یہ ہے کہ آدمی، اللہ پر، روزِ آخرت پر، فرشتوں پر، آسمانی کتابوں پر، پیغمبروں پر ایمان لائے، اللہ کی محبت پر، رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، سائلوں، اور غلاموں کو آزاد کرنے کے لیے مال دے۔ نماز قائم کرے۔ زکاۃ ادا کرے، اور وہ لوگ بھلائی پر ہیں جو عہد کرکے عہد پورا
الْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عَاهَدُوْا وَالصَّابِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ، اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ (۲: ۱۷۷)	کرتے ہیں، اور مستقل مزاج رہتے ہیں تنگدستی میں، بیماری، اور جنگ میں، یہی لوگ سچے ہیں اور یہی لوگ پرہیزگار ہیں۔

"وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ" کی تفسیر میں مفسّرین وعلماء کے دو قول ہیں: ایک یہ کہ آدمی اُس چیز کو اللہ کی راہ میں خرچ کرے جس سے محبت رکھتا ہے، جیسا کہ فرمایا "لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ"، (تم ہرگز بھلائی

حاصل نہیں کر سکتے جب تک اپنی محبوب چیز خرچ نہ کرو) اور دوسرا قول یہ ہے کہ ایثار دینا اُن کاموں میں خرچ کرے جنہیں اللہ پسند کرتا ہے جیسے کہ فرمایا "وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا" (اللہ کی محبت میں کھلاتے ہیں مسکین کو اور یتیم کو اور قیدی کو) اس بارے میں کہ دولت اور دنیا کی ہر چیز پر اللہ اور اُس کے رسول کی محبت کو ترجیح دینا ضروری ہے، یہ آیت قابل غور ہے:

قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ	کہہ دیجئے کہ اگر تمہارے ماں باپ، تمہارے لڑکے
وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ	تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں، تمہارا خاندان
وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا	اور وہ مال جو تم نے کما رکھا ہے، اور تجارت
وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا	جس کے بند ہونے سے ڈرتے ہو، اور حویلیاں
أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ	جنہیں پسند کرتے ہو، تمہیں اللہ و رسول سے
فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ	اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ
وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ	محبوب ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ بھیجے
(۹ : ۲۴)	اللہ اپنا حکم۔ اللہ نافرمانوں کو راہ نہیں دیتا۔

[illegible] خرچ کرنے والے مومنوں کو دوسرے مومنوں پر فضیلت دینے والی آیتوں میں سے ایک آیت حسب ذیل ہے:

لَا يَسْتَوِي الْقَاعِدُونَ مِنَ	برابر نہیں وہ مسلمان جو بغیر کسی عذر کے گھر

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجَاهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقَاعِدِيْنَ دَرَجَةً وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجَاهِدِيْنَ عَلَى الْقَاعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا۔

(۴: ۹۵)

بیٹھے رہے اور وہ لوگ جو اپنے مال و جان سے اللہ کی راہ میں جہاد کریں۔ اللہ نے مال و جان سے جہاد کرنے والوں کا درجہ اُن لوگوں سے بہت زیادہ کر دیا ہے جو گھر میں بیٹھنے والے ہیں۔ سب سے اللہ نے اچھائی کا وعدہ کیا ہے مگر مجاہدوں کو بیٹھنے والوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ ثواب کا مستحق بنا دیا ہے۔

اِس آیت کے بعد کی آیتیں بھی غور سے پڑھنا چاہیے۔

اور فرمایا:

وَمَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ، اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْ بَعْدُ وَقَاتَلُوْا، وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى (۴: ۹۵)

اور تمہیں کیا ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرو، حالانکہ آسمان اور زمین اللہ ہی کی ہے۔ جن لوگوں نے فتح (مکہ) سے پہلے خرچ کیا اور لڑائی لڑی ہے، کوئی اُن کے برابر نہیں۔ ان لوگوں کا درجہ اُن سے کہیں بڑا ہے جنہوں نے فتح کے بعد خرچ کیا اور لڑائی لڑی ہے۔ اور دونوں گروہوں سے خدا نے اچھائی کا وعدہ کیا ہے۔

اِس بارے میں بکثرت آیات وارد ہوئی ہیں، جن کی تفصیل ہماری تفسیر کی جلد ۲۔ اور جلد ۱۰ میں دیکھنی چاہیے۔

راہِ خدا میں خرچ کرنے کی ترغیب، اِس کے ثواب کی افزونی، اور اِس کے آداب کے بارے میں بیس آیتیں سورۂ بقرہ کے آخر میں نازل ہوئی ہیں۔ پڑھو اور غور کرو:

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ أَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ أَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَاءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ۔ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ أَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَا أَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَا أَذًى لَّهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَا

جو لوگ اللہ کی راہ میں اپنا مال خرچ کرتے ہیں اُن کی مثال ایسی ہے کہ ایک دانہ ہو جو سات بالیں پیدا کرے اور ہر بال میں سو دانے ہوں۔ اللہ یہ افزونی جسے چاہتا ہے بخش دیتا ہے۔ اللہ بڑی وسعت والا جاننے والا ہے۔ جو لوگ اللہ کی راہ میں اپنا مال خرچ کرتے ہیں پھر اپنے خرچ کے بعد نہ احسان جتلاتے ہیں اور نہ آزار پہنچاتے ہیں، تو ایسے لوگوں کا اجر اُن کے پروردگار کے پاس ہے۔ نہ اُن کے لیے کوئی ڈر ہے اور نہ وہ رنجیدہ ہوں گے۔ مناسب بات کہہ دینا اُس خیرات سے بہتر ہے جس کے بعد آزار پہنچایا جائے۔ اللہ غنی

أَذًى وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيمٌ. يَا أَيُّهَا الَّذِينَ
آمَنُوا لَا تُبْطِلُوا صَدَقَاتِكُمْ بِالْمَنِّ
وَالْأَذَىٰ كَالَّذِي يُنْفِقُ مَالَهُ
رِئَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ
بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ، فَمَثَلُهُ
كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ
فَأَصَابَهُ وَابِلٌ فَتَرَكَهُ صَلْدًا
لَا يَقْدِرُونَ عَلَىٰ شَيْءٍ مِمَّا
كَسَبُوا وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ
الْكَافِرِينَ. وَمَثَلُ الَّذِينَ
يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمُ ابْتِغَاءَ
مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيتًا مِنْ
أَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍ بِرَبْوَةٍ
أَصَابَهَا وَابِلٌ فَآتَتْ أُكُلَهَا
ضِعْفَيْنِ فَإِنْ لَمْ يُصِبْهَا
وَابِلٌ فَطَلٌّ، وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُونَ
بَصِيرٌ. أَيَوَدُّ أَحَدُكُمْ أَنْ تَكُونَ

ہے بردبار۔ ایمان والو، تم احسان جتلا کر
اور ایذا پہنچا کر اپنی خیرات کو رائیگاں
نہ کرو اُس شخص کی طرح جو دکھاوے کے لیے
اپنا مال خرچ کرتا ہے اور اللہ اور روزِ آخرت
پر ایمان نہیں رکھتا۔ ایسے آدمی کی مثال
چکنے پتھر کی سی ہے جس پر کچھ مٹی آ گئی ہے۔ پھر
اُس پر زور کی بارش پڑی اور اُسے بالکل
صاف کر گئی۔ یہ لوگ اپنی کمائی پر کچھ بھی
اختیار نہ رکھیں گے۔ اللہ ناشکروں کو راہ
نہیں دکھاتا۔ اور جو لوگ اللہ کی رضا جوئی
اور اپنے نفسوں کو ثابت قدم بنانے کے لیے
اپنا مال خرچ کرتے ہیں، اُن کی مثال اُس
باغ کی سی ہے جو ٹیلے پر ہو۔ اُس پر زور کی
بارش ہوتی ہے اور وہ باغ دوگنے پھل
لاتا ہے۔ اگر زور کی بارش نہ ہو تو ہلکی پھوار بھی
اُسے کافی ہوتی ہے۔ اللہ تمہارے کاموں کو
خوب دیکھتا ہے۔ کیا تم میں سے کوئی آدمی

لَهُ جَنَّةٌ مِنْ نَخِيلٍ وَأَعْنَابٍ
تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ لَهُ
فِيهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ وَأَصَابَهُ
الْكِبَرُ وَلَهُ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَاءُ
فَأَصَابَهَا إِعْصَارٌ فِيهِ
نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ، كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ
اللَّهُ لَكُمُ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ
تَتَفَكَّرُونَ. يَا أَيُّهَا الَّذِينَ
آمَنُوا، أَنْفِقُوا مِنْ طَيِّبَاتِ
مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُمْ
مِنَ الْأَرْضِ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيثَ
مِنْهُ تُنْفِقُونَ وَلَسْتُمْ بِآخِذِيهِ
إِلَّا أَنْ تُغْمِضُوا فِيهِ، وَاللَّهُ
غَنِيٌّ حَمِيدٌ. الشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ
الْفَقْرَ وَيَأْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَاءِ
وَاللَّهُ يَعِدُكُمْ مَغْفِرَةً مِنْهُ
وَفَضْلًا، وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ

اِسے پسند کریگا کہ اُس کا کھجوروں اور انگوروں
کا باغ ہو جس میں نہریں بہتی ہوں اور جس
میں ہر قسم کے پھل پھلاری ہوتے ہوں، خود
وہ آدمی بوڑھا ہو چکا ہو اور اُس کے بال
بچے کمزور ہوں، ایسی حالت میں باغ پر آتشیں
بگولہ آجائے اور اُسے جلا ڈالے۔ اللہ اسی طرح
تمھارے لیے نظائر بیان کرتا ہے تاکہ تم سوچا
کرو۔ اے ایمان والو، اپنی کمائی میں سے
اور اُس میں سے جو ہم نے تمھارے لیے زمین
سے پیدا کیا ہے، ستھری چیزیں خرچ کیا کرو۔
بُری چیزوں کی طرف نیت نہ لے جاؤ کہ
اُن میں سے خرچ کرو، حالانکہ تم خود بھی اُنہیں
لینے والے نہیں اِلّا یہ کہ دھوکہ کھا جاؤ۔ خدا
کسی کا محتاج نہیں اور تعریف والا ہے شیطان
تمھیں فقر سے ڈراتا اور بے حیائی کا حکم دیتا
ہے، اور اللہ اپنی بخشش و فضل کا وعدہ کرتا
ہے۔ اللہ وسعت والا ہے اور سب جانتا

يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَشَاءُ وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ. وَمَا أَنْفَقْتُمْ مِنْ نَفَقَةٍ أَوْ نَذَرْتُمْ مِنْ نَذْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُهُ. وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنْصَارٍ. إِنْ تُبْدُوا الصَّدَقَاتِ فَنِعِمَّا هِيَ وَإِنْ تُخْفُوهَا وَتُؤْتُوهَا الْفُقَرَاءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَكُمْ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِنْ سَيِّئَاتِكُمْ، وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ. لَيْسَ عَلَيْكَ هُدَاهُمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ. وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَلِأَنْفُسِكُمْ، وَمَا تُنْفِقُونَ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللَّهِ، وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ

ہے۔ جسے چاہتا ہے، دانائی دے دیتا ہے اور جسے دانائی مل جاتی ہے اُسے بہت خوبی حاصل ہو جاتی ہے۔ عقل والے ہی اِسے سمجھیں گے۔ تم جو کچھ بھی خرچ کرو یا اللہ سے کوئی منّت مانو تو خدا اُسے جانتا ہے اور گنہگاروں کا کوئی مددگار نہیں۔ اگر خیرات کھلی دو تو کیا ہی اچھی بات ہے، اور اگر اُسے چھپاؤ اور فقیروں کو چپکے سے دیدو تو یہ تمھارے حق میں زیادہ بہتر ہے، اور اس سے تمھارے کچھ گناہوں کا کفّارہ ہو جاتا ہے۔ تم جو کچھ کرتے ہو خدا اُس سے آگاہ ہے۔ اے پیغمبر، تیرے ذمہ اُنہیں راہ راست دکھا دینا نہیں، لیکن وہ اللہ ہی ہے جو جس کو چاہتا ہے راہ راست دکھا دیتا ہے۔ تم جو کچھ مال خرچ کرو، اور صرف اللہ کے لیے خرچ کرو تو تمھارے اپنے ہی فائدہ کے لیے ہوگا، اور تم جو کچھ بھی خرچ کروگے تمھیں خدا کے

وَأَنْتُمْ لَا تُظْلَمُونَ ۔ لِلْفُقَرَاءِ
الَّذِينَ أُحْصِرُوا فِي سَبِيلِ
اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا
فِي الْأَرْضِ يَحْسَبُهُمُ
الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ
تَعْرِفُهُمْ بِسِيمَاهُمْ لَا يَسْأَلُونَ
النَّاسَ إِلْحَافًا، وَمَا تُنْفِقُوا
مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللّٰهَ بِهِ عَلِيمٌ
الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ
بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَعَلَانِيَةً
فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ
وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ
الَّذِينَ يَأْكُلُونَ الرِّبَا لَا يَقُومُونَ
إِلَّا كَمَا يَقُومُ الَّذِي يَتَخَبَّطُهُ
الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِّ، ذَٰلِكَ
بِأَنَّهُمْ قَالُوا إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبَا،
وَأَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا فَمَنْ

ہاں پورا پورا مل جائے گا اور تمھارا حق نہ
کاٹا جائے گا۔ اُن محتاجوں پر خرچ کرو جو اللہ
کی راہ میں اٹک گیے ہیں اور زمین میں چل
پھر نہیں سکتے، چونکہ وہ مانگتے نہیں اِس لیے
اُنہیں ناواقف آدمی، مالدار سمجھتا ہے (مگر)
تم اُنہیں اُن کے بُشرے ہی سے جان لوگے
وہ لوگوں سے اصرار کرکے نہیں مانگتے۔ تم
جو مال بھی خرچ کروگے، اللہ اُس سے
واقف ہے۔ جو لوگ خرچ کرتے ہیں اپنا
مال اللہ کی راہ میں رات کو دن کو خفیہ اور
علانیہ، تو اُن کے پروردگار کے پاس اُن کا اجر
ہے۔ نہ اُن پر کوئی خوف ہوگا نہ رنجیدہ ہونگے۔
جو لوگ سود کھاتے ہیں، قیامت کے دن بالکل
اُسی طرح اٹھیں گے جس طرح وہ اٹھے جس کے
حواس شیطان نے لپٹ کر کھو دیے ہوں،
اور یہ اس لیے کہ اُنھوں نے کہا سودا کرنا بھی
ویسا ہی ہے جیسا سود لینا، اور خدا نے

جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى
فَلَهٗ مَا سَلَفَ وَاَمْرُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ وَ
مَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ
هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ۔ يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا
وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ
كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ۔ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ
وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ، لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ
رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا، اتَّقُوا اللّٰهَ وَ
ذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا اِنْ كُنْتُمْ
مُّؤْمِنِيْنَ۔ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا
بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ، وَاِنْ
تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ لَا
تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ۔ وَاِنْ كَانَ
ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ، وَاِنْ
تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ

سودا کرنے کو جائز کیا ہے اور سود لینے کو
حرام کردیا ہے۔ پس جس کے پاس نصیحت
پہونچی اُس کے پروردگار کی طرف سے اور
باز آگیا، تو اُس کے ذمہ وہی رہے گا جو ہوچکا
اور اُس کا معاملہ اللہ کے اختیار میں ہے لیکن
جو لوگ اِس کے بعد پھر یہی کریں تو وہی لوگ
دوزخ والے ہیں، وہ اِسی میں ہمیشہ رہیں گے
گھٹاتا ہے خدا سود کو اور بڑھاتا ہے خیرات کو
اللہ پسند نہیں کرتا کسی ناشکر گنہگار کو۔ جو لوگ
ایمان لائے، عمل صالح انجام دیے، نماز قائم
کی، زکاۃ دی، تو اُن کا بدلہ اُن کے پروردگار
کے پاس ہے۔ اُن پر نہ کوئی خوف ہوگا نہ وہ
رنجیدہ ہونگے۔ اے ایمان والو ڈرو اللہ سے
جو کچھ سود باقی رہ گیا ہے، اُسے چھوڑ دو اگر تم
واقعی مومن ہو۔ اگر تم یہ نہ کرو تو طیار ہو جاؤ
اللہ اور اُس کے رسول سے لڑنے کے لیے۔
اگر توبہ کرو تو تمھیں تمھارا اصل مال مل جائیگا

تَعْلَمُوْنَ ۔ وَاتَّقُوْا یَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِیْہِ اِلَی اللّٰہِ ثُمَّ تُوَفّٰی کُلُّ نَفْسٍ بِمَا کَسَبَتْ وَھُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ۔

(۲: ۲۶۱ تا ۲۸۱)

نہ تمھارا کسی پر ظلم ہوگا نہ کسی کا تم پر ظلم ہوگا۔ اگر کوئی تنگی میں مبتلا ہے تو اُسے کشایش کے وقت تک مہلت دینی چاہیے، اور اگر خیرات کردو تو یہ تمھارے لیے بہتر ہے۔ اور ڈرو اُس دن سے جب کو ٹائے جاؤگے خدا کے پاس۔ پھر پورا ملے گا ہر شخص کو وہ سب جو اُس نے کمایا ہے اور اُن پر ظلم نہ ہوگا۔

اِن آیتوں کی تفسیر ہماری تفسیر کی جلد سوم میں دیکھو۔

یہ افسوسناک مصیبت ہے کہ اِس زمانہ میں مسلم قومیں، دوسری تمام قوموں سے کم راہ خدا میں اپنا روپیہ خرچ کرتی ہیں حالانکہ اسی سے اُن کی آزادی محفوظ رہ سکتی ہے، اُن کی قوت بڑھ سکتی ہے، اور دین الہی کی عزت تمام قوموں میں قائم ہوسکتی ہے۔ اگر مسلمان اپنے دینی احکام کے بموجب اللہ کی راہ میں خرچ کرتے تو آج اُن کی قوم ترقی یافتہ ہوتی اور تمام غیر مسلم قومیں یقین کرلیتیں کہ اُن کا دین ہی سب سے اچھا دین ہے جو ایسی مفید باتوں کا حکم دیتا ہے، اور تسلیم کرلیتیں کہ دولت کے پرستاروں سے تہذیب و تمدن کو بچانے کی صورت یہی ہے کہ اِس دین حق کو اختیار کرلیا جائے۔

(۷۔ فرض و مستحب مالی حقوق اور اسلام کی لائی ہوئی مالی اصلاحیں)

خدا فرماتا ہے:

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا۔ (۹: ۱۰۳)	اے پیغمبر، اُن کے مال میں سے خیرات وصول کیجئے اور اس طرح اُنہیں پاک صاف بنا دیجئے۔

اِس آیت کی تفسیر میں میں نے پوری ایک فصل لکھی ہے جس میں فرض زکاۃ، خیرات، مالی اصلاح، اور اِس بارے میں تمام دینوں پر اسلام کی فضیلت ثابت کر دی ہے، اور بتایا ہے کہ انسان کی زندگی میں مال کی کیا اہمیت ہے، اور بغاوتوں، جنگوں اور دنیا کی آبادی میں اُسے کیا درجہ حاصل ہے۔ بعض جماعتوں نے اُسے جمع کرنے اور اُس کا نظم بنانے میں کس غلو سے کام لیا ہے۔ کس طرح کروڑوں انسانوں کو غلام بنا ڈالا ہے۔ یہ جماعتیں اِس زمانہ میں سرمایہ دار کہلاتی ہیں۔ اِن کے مقابلہ میں کچھ اور لوگ اٹھے ہیں، جو اپنے آپ کو بالشویک کہتے اور انسانوں کے بین الاقوامی نظام کو توڑ کر ایک ایسا نظام قائم کرنا چاہتے ہیں جس میں سب لوگ برابر کے شریک ہوں، پھر میں نے وہ تمام عداوتیں اور جھگڑے بھی بیان کر دیے ہیں جو اِن جماعتوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔

آخر میں دکھایا ہے کہ دنیا میں جتنے فتنے پھیلے ہوئے ہیں اور بربادیوں

کے جو خوفناک دیو ہر طرف منڈلا رہے ہیں، اُن کا دفعیہ صرف اسلام کی لائی ہوئی مالی اصلاح ہی سے ممکن ہے۔

اِس اصلاح کا خلاصہ میں نے چودہ دفعات یا اصول میں بیان کر دیا ہے:

ا ــــ اسلام نے شخصی ملکیت کو تسلیم کیا ہے، مگر ناجائز طریقہ پر لوگوں کا مال کھانا حرام قرار دیا ہے۔

۲ ــــ سود خواری اور قمار بازی حرام کر دی ہے۔

۳ ــــ روپیہ کو مالداروں ہی کے ہاتھوں میں گردش کرنے سے روکا ہے۔

۴ ــــ نا سمجھوں کو اُن کے مال میں آزادی نہیں دی تاکہ اُسے مُضر کاموں میں ضائع نہ کر دیں۔

۵ ــــ ابتدا ہی سے زکاۃ فرض کر کے اُسے اشتراکیت قرار دے دیا جس کی بنیاد دل کے عقیدے پر تھی نہ کہ حکام کے جبر پر۔ ظاہر ہے جہاں اسلامی حکومت نہ ہو، وہاں زکاۃ، دل کے عقیدے ہی کی بنا کر ادا کی جا سکتی ہے۔

۶ ــــ جب اسلام کی حکومت قائم ہو گئی تو یہ اختیاری صورت منسوخ کر دی اور زکاۃ کی مقدار مقرر کر دی کہ ہر سال دونوں نقدوں اور

تجارت پر نصاب پورا ہونے کی صورت میں عُشر کا ربع (چوتھیائی) ہے۔ زرعی غلّوں پر عُشر اور نصفِ عشر ہے۔ مویشی کی زکاۃ معلوم ہے، اور دفینہ پر خُمس ہے۔

۷۔ زوجیت و قرابت کا خرچ فرض کر دیا ہے۔

۸۔ بے کسوں کی خبر گیری واجب کر دی ہے، عام اس سے کہ کسی مذہب و ملّت کے ہوں، نیز پردیسیوں کی تواضع ضروری قرار دی ہے۔

۹۔ بعض گناہوں کے کفّارے میں مال خرچ کرنا ضروری ٹھہرایا ہے۔

۱۰۔ محتاجوں پر صدقہ مستحب رکھا ہے۔

۱۱۔ اسراف اور بخل، دونوں کی مذمت کی ہے۔

۱۲۔ خوش پوشی و خوش خوری معلوم شرطوں کے ساتھ مباح رکھی ہے۔

۱۳۔ کفایت شعاری اور میانہ روی کی تعریف کی ہے۔

۱۴۔ شکر کرنے والے دولتمند کو صبر کرنے والے فقیر سے افضل بتایا ہے۔ (دیکھو تفسیر ج ۱۱ ص ۲۷-۳۱)

اِس سے پہلے میں نے آیتِ زکاۃ کی تفسیر بھی اسی کتاب کی دسویں جلد میں کر دی ہے۔

پھر اِسی سورۂ توبہ کے آخر میں ایک فصل لکھی ہے جس میں اسلام کے مالی احکام جمع کر دیے ہیں۔ اِن تمام مباحث کی تفصیل ہماری تفسیر ہی میں پڑھنا مناسب ہے۔ یہاں اُن کی گنجائش نہیں۔

غرضکہ مال و دولت کی اصلاح کے لیے اسلام نے جو عملی علمی قواعد مقرر کیے ہیں، اُنہی کی پیروی سے مال و دولت، خیر و برکت کا ذریعہ بن سکتی ہے، جیساکہ اللہ نے اپنی کتاب میں اُسے موسوم فرمایا ہے۔ اِنہی اصول و قواعد کے ذریعہ لوگوں کے باہمی جھگڑے دور ہو سکتے اور وہ اپنی دنیا و دین میں شادکامی حاصل کر سکتے ہیں۔ ایسے اصول و قواعد نہ کسی دین میں مل سکتے ہیں نہ انسانی قانون و حکمت کی کسی کتاب میں۔

مال و دولت کی وجہ سے جو صورت حال پیدا ہوگئی ہے اُس نے انسانیت کے لیے نہایت ہی سخت خطرے لاحق کر دیے ہیں، اور بڑے بڑے دانشمند و مدبّر حیران ہیں کہ کیونکر اِن خطروں کو دور کریں، حالانکہ مخلصی و نجات کا راستہ اُن کے سامنے کھلا ہوا ہے، مگر وہ اُسے نہیں دیکھتے۔ یہ راستہ اسلام اور قرآن کی ہدایت ہی کا ہے:

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (۲: ۲۵۱)	اگر خدا لوگوں کی زیادتیاں ایک دوسرے کے ذریعہ دور نہ کرتا تو زمین میں فساد پھیل جاتا، لیکن اللہ تمام جہانوں پر فضل کرنے والا ہے۔

اِس تمام گفتگو سے غرض یہ دکھانا ہے کہ وحی محمدی، دراصل وحی الٰہی ہے، اور یہ کہ عقل ہرگز باور نہیں کر سکتی کہ محمدؐ، نبیٔ اُمیّ نے، جن کی تاریخ ہم جان چکے ہیں، اپنے دل کی وحی و الہام سے اِن حقائق کا سراغ لگایا ہو جو تمام آسمانی اور انسانی کتابوں سے بلند ہیں اور جن کی نظیر، علم و حکمت و قانون کے اِس سب سے زیادہ ترقی یافتہ زمانہ میں بھی مل نہیں سکتی۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ حکمت و رحمت و تدبیر والے خدا پر ایمان رکھنے والے ہر آدمی کے نزدیک معقول اور سچی بات یہی ہو سکتی ہے کہ یہ سب اُسی اللہ عزوجل کی طرف سے وحی ہے جو اپنے خاتم النبیین پر اُس نے اُس وقت نازل کی جب انسان اُسے قبول کرنے کے لیے مستعد ہو چکے تھے اور جس کے بعد اُنہیں کسی اور وحی کی ضرورت باقی نہیں رہی ہے۔

قرآن کا آٹھواں مقصد

(نظامِ جنگ کی اصلاح، اور جنگ کو انسانی بھلائی کیلیے خاص کردینا)

روزی کی راہیں تلاش کرنے اور مال وجاہ کے ذریعے نکالنے میں باہم تصادم پیش آنا، انسانی زندگی کی فطرت ہے۔ اِس تصادم کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جماعتیں اور قومیں آپس میں زیادتی اور لڑائی شروع کر دیتی ہیں۔ اجتماعی زندگی کا یہی قانون اور اُس کی ناگزیر ضرورت ہے، جو کبھی

کبھی آبادی و ترقی کا ذریعہ بن جایا کرتی ہے۔ چنانچہ جب کبھی حق و باطل میں تصادم ہوتا ہے، فتح حق ہی کو حاصل ہوتی ہے۔ اسی طرح علم و جہل کی کشمکش میں ہمیشہ جیت علم ہی کی ہوتی ہے۔ نظم و بے نظمی کی لڑائی میں نظم ہی کو غلبہ ملتا ہے۔ نیکی ہمیشہ بدی پر غالب آجایا کرتی ہے۔ خدا فرماتا ہے:

بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ۔ (۲۱: ۱۸)	ہم پھینک مارتے ہیں حق کو باطل پر اور حق، باطل کا سر توڑ ڈالتا ہے پھر باطل مردہ ہو کر رہ جاتا ہے۔

اور حق و باطل کی مثال یہ دی ہے:

أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَالَتْ أَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَابِيًا، وَمِمَّا يُوقِدُونَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَاءَ حِلْيَةٍ أَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِثْلُهُ، كَذَٰلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ، فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً، وَأَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ، كَذَٰلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ (۲۱: ۱۷)	خدا نے اتارا آسمان سے پانی پھر بہے نالے اپنے اندازے سے، پھر بہاؤ اوپر لے آیا جھاگ پھولا ہوا۔ اور زیور یا اسباب بنانے کے لیے جس چیز کو آگ پر دھونکتے ہیں، اُس میں سے بھی ایسا ہی جھاگ اٹھتا ہے۔ اسی طرح ٹھہراتا ہے اللہ حق اور باطل کو، لیکن جھاگ سوکھ کر جاتا رہتا ہے اور جو چیز آدمیوں کو فائدہ پہنچاتی ہے، سو وہ زمین میں رہتی ہے۔ اسی طرح اللہ کہاوتیں بتاتا ہے۔

باطل خواہشوں کے لیے، ظالمانہ اقتدار کے لیے، کمزوروں کو غلام بنانے کے لیے، دنیا میں غرور و تکبر قائم کرنے کے لیے باہمی سرکشی و جنگجوئی کا نقصان ناقابل بیان ہے۔ خونریزی سے دلوں میں کینے پیدا ہوتے اور انتقامی جذبات بھڑکتے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں یہ خرابیاں بہت زیادہ بڑھ گئی ہیں اور سخت اندیشہ پیدا ہوگیا ہے کہ تھوڑی مدت میں یہ شاندار تہذیب برباد ہوکر رہ جائے گی، کیونکہ علم کی ترقیوں نے ایسے تباہ کن آلاتِ جنگ پیدا کر دیے ہیں کہ چند گھنٹہ میں بڑے بڑے آباد شہر، خاک سیاہ کر ڈالے جا سکتے ہیں۔

جنگی قوتوں کی مالک تمام سلطنتیں اِس اندیشہ سے بے حد پریشان ہیں، حتیٰ کہ جن کے پاس سامان جنگ سب سے زیادہ ہے، بڑے بڑے بحری اور ہوائی بیڑے رکھتی ہیں، وہ اور بھی ہراساں ہیں کہ کہیں کوئی دشمن آکر اُن کی ہتھیار بند آبادیوں کا خاتمہ نہ کر ڈالے۔ یہی سبب ہے کہ وہ آپس میں امن و امان کی بحالی کے لیے کانفرنسیں منعقد کرتیں ہیں، معاہدے طے کرتی ہیں، قسمیں کھاتی ہیں، مگر اس سب کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خالی ہاتھ لَوٹتی ہیں۔ جو کچھ طے کرتی ہیں، شرارت اور فریب کی راہ سے خود ہی اُسے توڑ بھی ڈالتی ہیں۔

اِن سلطنتوں کی اِس حیرتناک ناکامی کا سبب خدا نے قرآن میں

بیان فرما دیا ہے۔ ذیل کی آیت اگرچہ بُت پرست عربوں کے حق میں نازل ہوئی تھی، مگر اس وقت کی یورپین سلطنتوں پر اس طرح منطبق ہوتی ہے گویا خاص انہی کے بارے میں اُتری ہے۔ اور یہ بھی قرآن کے لفظی و معنوی عجائبات میں سے ایک اعجوبہ ہے جسے ہر آنکھ خود دیکھ لے سکتی ہے۔ عہد کی پابندی کا حکم دینے اور بدعہدی سے منع کرنے کے بعد فرمایا ہے:

وَلَا تَكُونُوا كَالَّتِي نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِن بَعْدِ قُوَّةٍ أَنكَاثًا تَتَّخِذُونَ أَيْمَانَكُمْ دَخَلًا بَيْنَكُمْ أَن تَكُونَ أُمَّةٌ هِيَ أَرْبَىٰ مِنْ أُمَّةٍ (۱۶:۹۲)

اُس عورت کی طرح نہ بنو جو اپنے سوت کو بٹ چکنے کے بعد ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتی ہے کہ اپنی قسموں کو آپس میں فریب کا ذریعہ ٹھہراؤ اِس غرض سے کہ ایک گروہ دوسرے سے بڑھا چڑھا ہو جائے۔

آیت سے غرض یہ ہے کہ قوموں کے مابین صلح و اتفاق کے معاہدے، اصلاح، انصاف، مساوات کے لیے ہونے چاہئیں، اور یہ اُسی وقت ممکن ہے جب اُن کی بنیاد، اخلاص اور نیکی پر ہو نہ کہ فریب و دغل پر کہ ایک قوم دوسری سے زیادہ نفع اٹھا کر قوت حاصل کرلے۔

یورپ کے ناخدا اگر اس ہولناک خطرے سے مخلصی و سلامتی کے واقعی خواہشمند ہوتے، تو یہ چیز اُنہیں اِسلام میں موجود ملتی، جو حق، عدل، اور امن داماں کا دین ہے۔

قرآن میں جنگ وامن کے جو اصول وقواعد بیان کیے گئے ہیں، اُن میں سے بعض ذیل میں ملاحظہ ہوں:

(اسلام میں امن وجنگ کے اہم قواعد واصول)

سورۂ انفال کی آیتوں سے ہم نے جنگ وصلح اور معاہدوں سے متعلق ایک جنگی اصل استنباط کر کے اِسی سورۃ کی تفسیر کے خلاصہ میں بیان کردی ہے۔ اِسی طرح سورۂ توبہ کی آیات سے بھی ایک اہم اصل مستنبط کی ہے جسے بہت ہی شرح وبسط کے ساتھ اپنی تفسیر میں لکھا ہے۔ یہاں ہم تفصیل سے گریز کر کے صرف چند اصول بطور شواہد کے پیش کیے دیتے ہیں، کیونکہ یہاں دکھانا یہی ہے کہ یہ تمام عظیم الشان علوم ناممکن ہے کہ محمد نبی اُمیؐ نے اپنی رائے سے بنا لیے ہوں جو نبوت سے پہلے تنہائی اور گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرتے تھے: بچپن میں اُنھوں نے گلّہ بانی کی تھی اور جوانی میں تجارت لیکن اس کے باوجود جو علوم وہ لائے ہیں، اُن کی بلندی تک نہ آسمانی کتابیں پہنچ سکیں، نہ انسانی حکمت وقوانین کے دفتر۔

۱۔ اسلام میں کیسی جنگ فرض ہے؟

زیادتی کرنے والوں سے اسلام نے جنگ کرنے کا حکم دیا ہے تاکہ فساد دور ہو اور نیکی قائم کی جا سکے۔ ساتھ ہی ظلم وسرکشی کی راہ سے جنگ کرنے سے منع کیا ہے۔ فرمایا:

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ (۲: ۱۹۰)	اللہ کی راہ میں اُن لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں۔ زیادتی نہ کرو، اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

اِس آیت میں سرکشی و زیادتی کی نیت سے لڑائی کو اِس بنا پر منع کیا ہے کہ خدا، زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ یہ اِس بات کی دلیل ہے کہ ایسی جنگ کی ممانعت قطعی ہے اور منسوخ نہیں ہو سکتی۔ اِسی آیت کی تفسیر میں ہم نے دکھایا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کفّار سے جتنی لڑائیاں کیں، سب مدافعانہ تھیں نہ کہ جارحانہ۔ پھر سورۂ توبہ کی آیتِ سیف میں تفصیل کے ساتھ بتایا ہے کہ عرب بُت پرستوں سے جنگ اور فتح مکہ کے بعد اُن سے معاہدے منسوخ کرنیکا معاملہ بھی اِسی اصول پر مبنی تھا، حالانکہ معلوم ہے عرب میں اسلام کی سیاست، باقی قوموں میں اُس کی سیاست سے جدا ہے، کیونکہ اِسلام، عربوں کو مسلمان بنانا اور اُن کے شرک کی بیخ کنی کرنا چاہتا تھا جو کسی شریعت کے پابند نہ تھے۔ نیز جزیرۃ العرب کو اسلام کا گہوارہ اور قلعہ بنانا تھا جہاں کسی مخالف تحریک کو باقی رہنے دینا اِس مقصد کے منافی تھا۔ لیکن عربوں کے سوا باقی تمام قوموں کے ساتھ اسلام کا برتاؤ یہ تھا کہ اُن کے وطن اور اُن کے دین کو برقرار رکھتا تھا۔

اسی بحث میں میں نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ بعض صحابہ پر یہ بات گراں گزری تھی کہ بُت پرستوں کے ساتھ جو معاہدے ہو چکے تھے، اُنہیں توڑ دیا جائے، اگرچہ یہ بُت پرست، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنے معاہدے بارہا شکست کر چکے تھے، کیونکہ عہد کی پابندی ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ اس بارے میں اُن کا نہ کوئی دلی عقیدہ تھا نہ کوئی مقررہ ضابطہ اسی لیے خدا نے فرمایا وَهُمْ الَّذِيْنَ بَدَءُوكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ یعنی انہی لوگوں نے مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرنے اور عہد شکنی کرنے میں پیش قدمی کی ہے۔

جنگ کے آخری احکام میں بعینہٖ وہی بات کہی گئی ہے جو جنگ کی اجازت والی اولین آیت میں فرمائی گئی تھی۔ یہ آیت سورۂ حج میں موجود ہے اور حسب ذیل ہے:

اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ. اَلَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّا اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَ	اُن لوگوں کو جنگ کرنے کی اجازت دی جاتی ہے جن سے جنگ کی جا رہی ہے کیونکہ یہ لوگ مظلوم ہیں۔ اللہ ان کی مدد کرنے پر قادر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اُن کے گھروں سے اس بات پر نکال دیا گیا ہے کہ وہ کہتے تھے ہمارا پروردگار اللہ ہے۔ اگر

صَلَوٰتٌ وَّمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيرًا ۗ وَلَيَنصُرَنَّ اللّٰهُ مَن يَنصُرُهُ ۗ إِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ ۞ الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ ۗ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ

(۲۲: ۳۹تا ۴۱)

خدا لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ نہ روکتا تو ڈھادی جاتیں خانقاہیں (عابدوں کی) تعلیم گاہیں (عیسائیوں کی) عبادت خانے (یہودیوں کے) اور مسجدیں (مسلمانوں کی) جن میں اللہ کا نام بہت ذکر کیا جاتا ہے۔ اللہ ضرور اُن کی مدد کریگا جو اُس کی مدد کرینگے بے شک اللہ زبردست ہے زور والا۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم اُنہیں زمین میں مضبوط کر دیں تو نماز قائم کریں۔ زکاۃ ادا کریں۔ نیکی کا حکم دیں۔ برائی سے منع کریں۔ اور معاملات کے نتائج تو اللہ ہی کے ہاتھ میں ہیں۔

۲۔ جنگ سے غرض اور اُس کا نتیجہ

اِسلام نے ضروری ٹھہرایا ہے کہ اگر جنگ کی جائے، تو سرکشی و ظلم دور کرنے اور امن بحال کرنے کے بعد اُس کی غرض ایجابی ہونی چاہیے، اور وہ غرض یہ ہے کہ مسلمان تمام دینوں اور مذہبوں کی حفاظت کریں۔ اللہ وحدہ کی ہی عبادت کریں۔ تمام انسانوں کی بھلائی کا خیال رکھیں۔ سب کے ساتھ نیکی کریں۔ کسی پر سرکشی اور ظلم نہ کریں۔ چنانچہ جنگ کی

اجازت دینے کے بعد ہی فرمایا ہے، جیسا کہ ابھی بیان بھی ہو چکا ہے:

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ۗ وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ۗ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۔ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۗ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ

(۲۲: ۴۰ تا ۴۱)

اگر خدا لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ نہ روکتا تو ڈھادی جاتیں خانقاہیں، تعلیم گاہیں عبادت خانے، اور مسجدیں جن میں اللہ کا نام بہت ذکر کیا جاتا ہے۔ اللہ ضرور اُن کی مدد کریگا جو اُس کی مدد کریں گے۔ بے شک اللہ زبردست ہے زور والا۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم اُنہیں زمین میں مضبوط کر دیں تو نماز قائم کریں۔ زکاۃ ادا کریں۔ نیکی کا حکم دیں۔ برائی سے منع کریں۔ اور معاملات کے نتائج تو اللہ ہی کے ہاتھ میں ہیں۔

جنگ کی اجازت خدا نے جن وجوہ کی بنا پر دی ہے، وہ تین ہیں:

۱ــــ مسلمان مظلوم تھے۔ اُن پر زیادتی کی گئی تھی۔ اُن کے دین و ایمان کی وجہ سے اُنہیں ستایا گیا تھا۔ لوٹا گیا تھا۔ جلاوطن کیا گیا تھا۔ یہ وجہ خاص مسلمانوں سے تعلق رکھتی ہے، شخصی و وطنی حیثیت سے، یا دینی و دنیاوی حیثیت سے۔

سورۂ انفال کے قواعد میں ہم نے اِس مقصد کو ایک مستقل قاعدہ قرار دے کر لکھا ہے کہ دین کی آزادی حاصل ہونی چاہیے، اور کسی شخص کو بھی اُس کے دین سے پھیرنے کے لیے ستانا اور تکالیف میں ڈالنا نہیں چاہیے، اور دلیل میں یہ آیت کریمہ پیش کی ہے :

وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلّٰهِ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُونَ بَصِيرٌ (۸ : ۳۹)	کافروں سے لڑو یہاں تک کہ زبردستی موقوف ہو جائے اور دین کا معاملہ سراسر اللہ ہی کے لیے ہو جائے۔ اگر وہ باز آجائیں تو اللہ اُن کے کاموں کو اچھی طرح دیکھتا ہے۔

عرب کے بُت پرست مسلمانوں کو ہر ممکن تکلیف پہنچاتے تھے۔ طرح طرح کی سختیوں میں مبتلا کرتے تھے تاکہ اُن کے دین سے اُنہیں پھیر دیں۔ لیکن مسلمانوں نے اقتدار حاصل کر کے یہ روش اختیار نہیں کی، اور اگر کسی نے کبھی اختیار کی ہو، تو اُس نے احکام اسلام کی مخالفت کی ہے جس نے دین کے معاملہ میں سب آدمیوں کو آزادی بخشی اور زور و زبردستی کی ممانعت کر دی ہے۔

۲ —— اگر خدا اس جنگی مدافعت کی اجازت نہ دیتا تو یہودیوں عیسائیوں اور مسلمانوں کے عبادت خانے برباد کر ڈالے جاتے، جن میں پیغمبروں کے ماننے والے یہ لوگ یادِ الٰہی کرتے ہیں۔ اگر مدافعانہ جنگ کی اجازت نہ

ہوتی تو ظاہر ہے بتوں کے پجاری اور روز قیامت کے منکران عبادت خانوں کو ہرگز باقی نہ چھوڑتے۔ یہ عالمگیر دینی سبب ہے جو اس بات کا صاف ثبوت ہے کہ اِسلام میں عام دینی آزادی کا لحاظ رکھا گیا ہے، اور مسلمانوں کے لیے ضروری ٹھرایا گیا ہے کہ دینی آزادی کی حمایت کریں اور ہر دین کی عبادت گاہیں محفوظ رکھیں، سچے مسلمانوں نے اِس تعلیم پر عمل بھی کیا تھا۔

اگر کہا جائے کہ اسلام نے بت پرستوں کو بھی اُن کے دین پر اُسی طرح کیوں رہنے نہ دیا جس طرح یہودیوں، عیسائیوں، اور مجوسیوں کو رہنے دیا تھا؟

جواب یہ ہے کہ دوسرے دینوں کی طرح، اگرچہ کتنے ہی بگڑ گیے ہوں، عرب کی بُت پرستی کوئی ایسی ملّت نہ تھی جس کی بنیاد، عبادتِ الٰہی پر ہو اور جس میں بندگانِ خدا کے ساتھ بھلائی کرنا ضروری ہو، عرب نہ قیامت کے قائل تھے، نہ جزا، و سزا کے۔ وہ نہیں مانتے تھے کہ "نیکی کا اچھا بدلہ ملے گا اور برائی کا بُرا بدلہ ملے گا،، وہ عمل صالح کو اور برائیوں سے بچنے کو ضروری نہیں سمجھتے تھے، حالانکہ دین کے عام اصول یہ ہیں کہ:

مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ	جو لوگ اللہ اور روز آخرت پر ایمان لائے اور نیکوکار بنے اُن کا بدلہ اُن کے پروردگار کے پاس ہے۔ نہ اُن پر خوف ہوگا نہ وہ رنجیدہ

یَحْزَنُوْنَ ۔ | ہوں گے

۳ــــــ جنگ سے اسلام کی تیسری غرض یہ ہے کہ مسلمان ، زمین میں اقتدار و حکومت حاصل کرنے کے بعد نماز قائم کریں جو نفس کو پاک کرنے والی ، برائیوں سے باز رکھنے والی ، اور خشیت و محبت الٰہی پر آمادہ کرنے والی ہے ۔ ہر قسم کی نیکی کا اور تمام آدمیوں سے بھلائی کا حکم دیں ۔ ہر اُس بات سے منع کریں جس میں خرابی ہے اور جس سے خود اُس کے مرتکب کو یا کسی دوسرے کو نقصان پہنچ سکتا ہے ۔

تمام جنگی سلطنتیں ، ریاکاری کی راہ سے نیک نامی حاصل کرنے کے لیے اِسی طرح کے اعلیٰ مقاصد کا دعویٰ کرتی ہیں ، لیکن اُن کا عمل ، اُن کی تکذیب کرتا ہے ، خصوصًا نیکی کے حکم اور بدی کی ممانعت کے دعوے کی ۔ کیونکہ یہ سلطنتیں اپنے محکوموں کے لیے تمام برائیاں اور بدکاریاں جائز کر چکی ہیں ، علم ، تہذیب ، اور نیکی سے حتی المقدور منع کرتی ہیں ۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اپنی زبان ، اپنی عظمت اور اپنے قومی دین کی تعلیم پھیلا رہی ہیں ، مگر نیکی کے خیال سے نہیں بلکہ بدی کے ارادے سے ۔ اُن کا مقصد یہ ہے کہ اِس تعلیم کے ذریعہ محکوموں کی ملّی و قومی بنیادیں ڈھا دیں تاکہ وہ ملک گیروں کے پنجہ سے کبھی نکل نہ سکیں ۔ یہ سلطنتیں ہرگز گوارا نہیں کر سکتیں کہ محکوم قومیں ، علم ، دولت ، اقتدار ،

قوت میں ملک گیر فاتحوں کے ہم پلّہ ہو جائیں۔ یہ واقعہ تمام یورپین مقبوضات اور نو آبادیوں میں ہر آنکھ جب چاہے دیکھ سکتی ہے۔

۳۔ امن کو جنگ پر ترجیح

اس اصل کی بنا پہلی دو اصلوں پر ہے۔ اُن میں بتایا جا چکا ہے کہ جنگ، بھلائیاں حاصل کرنے اور برائیاں دور کرنے کے لیے ضروری ہو۔ اور یہ کہ امن ہی وہ اصلی چیز ہے جس پر سب لوگوں کو استوار ہونا چاہیے، اسی لیے خدا نے ہمیں حکم دیا ہے کہ جب دشمن، امن و صلح کی طرف مائل ہو، تو ہم امن کو جنگ پر ترجیح دیں۔ چنانچہ فرمایا:

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (۸: ۶۱)[۱]	اگر وہ لوگ امن کی طرف جھکیں تو تم بھی جھک جاؤ اور اللہ پر بھروسہ رکھو۔ وہ خوب سننے جاننے والا ہے۔

۴۔ جنگ روکنے کیلیے جنگی طیاریاں

اسلامی سلطنت کے لیے ضروری ہے کہ قوم کو ہر قسم کی جنگی طیاریوں سے آراستہ رکھے۔ اس آراستگی سے غرض یہ ہونی چاہیے کہ دشمن کو مرعوب رکھا جائے تاکہ وہ ڈرے کہ اس قوم پر، یا اُس کے افراد

(۱) دیکھو تفسیر جلد ۱۰ صفحہ ۶۹ و ۱۴۰

پر، یا اُس کے مال پر، اگرچہ ملک غیر ہی میں کیوں نہ ہو، دست درازی کا بہت ہی خطرناک نتیجہ نکلے گا۔ اسی جنگی طیاری کی بدولت قوم اپنے وطن میں مطمئن اور اپنے افراد و مصالح و مال کی طرف سے بے فکر رہ سکتی ہے۔ اسی چیز کو آج کل کی بول چال میں "مسلح امن" یا "پُرامن ہتھیار بندی" کہتے ہیں، لیکن موجودہ جنگی حکومتیں اس کا دعویٰ بالکل جھوٹا کرتی ہیں۔ خود اُن کا عمل اس کی تکذیب کر رہا ہے۔ البتہ صرف اسلام ہی ایک ایسا دین ہے جس نے اس چیز کو مسلمانوں کے حق میں فرض کر دیا ہے، چنانچہ یہ فرما کر جنگی طیاری مکمل رکھنے کا حکم دیا ہے:

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهِ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ (۸ : ۶۰)	دشمنوں کے لیے جو کچھ بھی تم سے ہو سکے قوت طیار کر رکھو اور گھوڑے جمع کرو۔ اس طرح تم اللہ کے دشمن اور اپنے دشمن کو مرعوب کر دو گے۔

۵۔ جنگ میں رحم و شفقت

جب جنگ میں مسلمانوں کو غلبہ حاصل ہو جائے جسے لفظِ "اِثْخَان" سے تعبیر کیا گیا ہے، اور مسلمانوں کو یقین ہو جائے کہ اب دشمن بے بس ہو گیا ہے اور اُن پر فوقیت حاصل نہیں کر سکتا، تو خدا کا حکم یہ ہے کہ خونریزی موقوف کر دی جائے اور دشمن کو قید کر لینا ہی کافی سمجھا جائے۔

پھر اجازت دی ہے کہ قیدیوں کو یا تو احسان کر کے چھوڑ دو، یا فدیہ لے کر آزاد کر دو۔ چنانچہ سورۂ محمدؐ کی نص صریح حسب ذیل ہے:

فَإِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا[1] فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتَّىٰ إِذَا أَثْخَنتُمُوهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً حَتَّىٰ تَضَعَ الْحَرْبُ أَوْزَارَهَا ذَٰلِكَ وَلَوْ يَشَاءُ اللَّهُ	جب تم بھڑو کافروں سے تو گردنیں مارو، یہاں تک کہ جب کشت کر چکو تو انہیں قید کرلو اس کے بعد احسان کر کے انہیں چھوڑ دو یا فدیہ وصول کرو، یہاں تک کہ لڑائی ختم ہو جائے۔ اگر خدا چاہے تو ان سے بدلہ لے

(۱) دشمنوں نے اسلام کو بدنام کرنے کے لیے مشہور کر رکھا ہے کہ اس آیت میں قرآن نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ کافروں کو جہاں بھی پائیں، مار ڈالیں، حتیٰ کہ مصر میں سابق برطانی ہائی کمشنر، لارڈ کرومر نے بھی اپنی تقریر میں یہی ہذیان بکا ہے، حالانکہ اس آیت کا تعلق اُن محارب دشمنوں سے ہے جن سے میدان جنگ میں مقابلہ ہو۔ شریعت اسلام میں کافروں کو تین قسموں پر بانٹ دیا گیا ہے: محارب ــــ ان کا حکم اِس اصل اور اِس سے پہلی اصلوں میں بتایا جا چکا ہے۔ معاہد ــــ اِن کے احکام بعد میں بتائے گئے ہیں۔ مُستامن اور ذِمّی ــــ یہ وہ لوگ ہیں جو مسلمانوں کی حکومت میں آجاتے ہیں، اور یہ بات پہلے ہی واضح کی جا چکی ہے کہ اسلام نے اِن لوگوں کو اور مسلمانوں کو تمام عدالتی اور شہری احکام میں بالکل برابر کر دیا ہے۔ مسلمانوں پر اُن کی حمایت ضروری ٹھہرائی ہے، حتیٰ کہ اگر کوئی اُن کے دین پر، جان پر، مال پر دست درازی کرے تو مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ اُنہیں بچانے کے لیے اُس سے جنگ کریں۔

لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ وَلٰكِنْ لِّيَبْلُوَا بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ، وَالَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَنْ يُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ۔ (۴۷ : ۴)	لے، مگر وہ چاہتا ہے جانچ تم میں سے بعض کی بعض کے ذریعہ۔ جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں، خدا اُن کے اعمال رائیگاں نہیں کرے گا۔

اس آیت کے معنی ہم نے اپنی تفسیر میں ذیل کی آیت پر گفتگو کرتے ہوئے بیان کر دیے ہیں:

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِى الْاَرْضِ، تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ، وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (۸ : ۶۷)	نبی کے لیے مناسب نہیں کہ قیدی اُس کے ہاں آئیں اور وہ زمین میں خون نہ کرے۔ تم دنیا کی جنس چاہتے ہو اور اللہ آخرت چاہتا ہے۔ اللہ زورآور ہے حکمت والا۔

۷۔ معاہدوں کی پابندی اور خیانت کی تحریم

اسلام نے قطعی طور پر حکم دے دیا ہے کہ جس طرح کسی مادّی یا معنوی امانت میں خیانت روا نہیں، اُسی طرح جنگ اور امن کے معاہدوں سے بے وفائی جائز نہیں، اور یہ کہ اُن کی سرّاً و علناً پابندی ضروری ہے۔ اس بارے میں متعدد محکم آیات نازل ہوئی ہیں جنہوں نے معاہدے توڑنے، انہیں ردی کا غذ سمجھنے اور حیلے بہانے سے شکست کر دینے کی کوئی گنجائش ہی نہیں چھوڑی ہے۔ چنانچہ فرمایا:

وَاَوْفُوا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عَاهَدْتُّمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَيْكُمْ كَفِيْلًا، اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ (۱۶: ۹۱)	جب عہد باندھو تو اللہ کے عہد کو پورا کرو۔ قسمیں پکی کر چکنے کے بعد نہ توڑ دو حالانکہ تم خدا کو اپنا ضامن ٹھہرا چکے ہو۔ اللہ جانتا ہے تم جو کچھ کرتے ہو۔

اس آیت میں عہد کی پابندی کا حکم دیا اور بدعہدی سے منع کیا ہے۔ پھر ایک بلیغ مثل دے کر اس کی اور زیادہ تاکید کر دی ہے۔ فرمایا:

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّتِيْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا (۱۶: ۹۲)	اُس عورت کی طرح نہ ہو جاؤ جو بٹ چکنے کے بعد اپنے سوت کو توڑ کر ٹکڑے کر ڈالتی ہے۔

اس آیت پر ہم اس مقصد کے مقدمہ میں گفتگو کر چکے ہیں۔ پھر ذیل کی آیت میں مومنوں کا یہ وصف بتایا ہے:

وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عَاهَدُوْا (۲: ۱۷۷)	اور اپنا عہد پورا کرتے ہیں جب عہد باندھ لیتے ہیں۔

یہودیوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بدعہدی کی تھی۔ اُن کی مذمت فرمائی اور اُنہیں بدترین جانور قرار دیا ہے:

اِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِنْدَ اللّٰهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ، اَلَّذِيْنَ عَاهَدْتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنْقُضُوْنَ	خدا کے نزدیک بدترین جانور وہ ہیں جنہوں نے کفر کیا ہے چنانچہ ایمان نہیں لاتے۔ جن سے اے پیغمبر آپ نے عہد جوڑا ہے، مگر وہ اپنا

عَهْدَهُمْ فِي كُلِّ مَرَّةٍ وَّهُمْ لَا يَتَّقُوْنَ (۸: ۵۵ و ۵۶) | عہد ہر مرتبہ توڑ دیتے ہیں اور ڈرتے نہیں۔

پھر جب مسلمانوں کو اُن مشرکوں سے معاہدے توڑ دینے کا حکم دیا جنہوں نے نبیؐ سے اور مومنوں سے بدعہدی کی تھی تو ان میں سے بھی اُن مشرکین کو مستثنیٰ کر دیا جنہوں نے بدعہدی نہیں کی تھی، حالانکہ وہ سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے تھے۔ فرمایا:

إِلَّا الَّذِيْنَ عَاهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْـًٔا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ أَحَدًا فَأَتِمُّوْا إِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ إِلٰى مُدَّتِهِمْ، إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ (۹: ۴)	بجز اُن مشرکوں کے جن سے تم نے عہد باندھا اور اُنہوں نے تم سے نہ کوئی بدعہدی کی، نہ تمہارے مقابلہ میں کسی کی مدد کی، تو اُن کا عہد اُن کی مدت تک پورا کرو۔ خدا پرہیزگاروں کو پسند کرتا ہے۔

پھر فرمایا:

كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ رَسُوْلِهٖ، إِلَّا الَّذِيْنَ عَاهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ، إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ۔ (۹)	اللہ اور اُس کے رسول کے نزدیک مشرکوں کا عہد کیونکر قابل تسلیم ہو سکتا ہے، بجز اُن لوگوں کے جن سے تم نے مسجد حرام کے پاس عہد باندھا، تو تم اُس پر قائم رہو جب تک وہ قائم رہیں۔ اللہ پرہیزگاروں کو دوست رکھتا ہے۔

عہد کی پابندی پر اس قدر زور دیا گیا ہے کہ معاہدے والے کافروں کے مقابلہ میں ہمیں اپنے اُن مسلمان بھائیوں کی مدد سے بھی منع کر دیا ہے جو ہماری حکومت میں داخل نہیں ہیں۔ فرمایا:

وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ (۸ : ۷۲)	اور اگر وہ دین کے معاملہ میں تم سے مدد مانگیں تو اُن کی مدد تم پر لازم ہے، بجز اُن لوگوں کے مقابلہ میں جن سے تمھارا معاہدہ ہو چکا ہے۔

۷۔ جزیہ، جنگ کا مقصد ہے نہ کہ اُس کا موجب

اہل کتاب سے جنگ کے متعلق آیت جزیہ "حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صَاغِرُوْنَ"، کی تفسیر میں ہم نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے۔

"یہ اہل کتاب سے جنگ کا مقصد ہے اور اُس کے حاصل ہوتے ہی جنگ بھی ختم ہو جاتی ہے۔ یعنی اہلِ کتاب سے جنگ کرو جب جنگ کی مجبوری پیش آجائے۔ جیسے وہ تم پر یا تمھارے ملک پر دست درازی کریں، یا دین سے برگشتہ کرنے کے لیے تمھیں تکلیف دیں، یا تمھارے امن وسلامتی کو خطرے میں ڈالیں، جیسا کہ صدر اول میں رومیوں نے کیا تھا، اور جس کی وجہ سے غزوۂ تبوک پیش آیا تھا، غرضکہ جب ایسے حالات پیش آئیں تو ان لوگوں سے جنگ کرو یہاں تک کہ اُن کی عداوت سے محفوظ ہو جاؤ، اور یہ اِس طرح کہ وہ تمھیں جزیہ ادا کریں، مگر دو [illegible] کے ساتھ: پہلی قید یہ ہے کہ

وہ جزیہ اس حال میں ادا کریں کہ ادا کرنے کی مقدرت رکھتے ہوں۔ "عَنْ یَدٍ" کا یہی مطلب ہے۔ اسلام نے اُن لوگوں پر جزیہ نہیں رکھا ہے جن میں ادا کرنے کی مقدرت نہیں ہے۔ دوسری قید یہ ہے کہ وہ "صاغرون" کے ساتھ ادا کریں۔ اس لفظ سے مقصود یہ ہے کہ اُن کا زور ٹوٹ جائے اور وہ تمہاری برتری و حکمرانی کے سامنے بالکل جھک جائیں۔ اس صورت حال کا نتیجہ یہ بھی ہوگا کہ اسلام کی طرف اُن کی رہنمائی آسانی سے ہو جائے گی، کیونکہ جب وہ تمہارا انصاف، خوبی، اور نیکی دیکھیں گے تو سمجھ جائیں گے کہ تم اُن کے پیغمبروں کی ہدایت سے خود اُن سے بھی زیادہ قریب ہو۔ اس طرح اُن کے دل میں دین الٰہی کا اثر بیٹھ جائے گا۔ اس کے بعد اگر وہ مسلمان ہو جائینگے، تو ہدایت، انصاف، اتحاد عام ہو جائے گا۔ اگر مسلمان نہ ہوں تو بھی اُن کے لیے یہ کیا کم نعمت ہے کہ وہ تمہارے ساتھ انصاف میں برابر ہو جائیں گے، اور دارالاسلام میں انصاف و مساوات کو روک نہ سکیں گے۔ لیکن اگر جنگ کو فرض کرنے والے مذکورۂ بالا اسباب موجود نہ ہوں اور جنگ شروع ہو جائے تو ایسی جنگ کو جزیہ ادا ہونے کی صورت میں بدرجۂ اولیٰ ختم ہو جانا چاہیے۔ جب اہل کتاب جزیہ ادا کرنے پر آمادہ ہو جائیں، تو مسلمانوں کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ اُنہیں امن بخشیں، اُن کی حمایت کریں، اُن کی اور اُن کے دین کی آزادی کی حفاظت کریں، اور اُن سے بالکل مسلمانوں ہی کا سا منصفانہ و مساویانہ

برتاؤ کریں۔ یہ لوگ شرع کے بول چال میں "ذمّی" کہے جاتے ہیں، کیونکہ اُنہیں یہ تمام حقوق، اللہ اور اُس کے رسول کی ذمہ داری پر حاصل ہوئے ہیں۔ لیکن جن لوگوں سے اِس بنیاد پر معاہدہ ہوتا ہے کہ طرفین کی خود مختاری محفوظ رہے گی، تو یہ لوگ "معاھد" کہلاتے ہیں، اور اِن کا بیان، سورۂ انفال کی تفسیر میں گزر چکا ہے،،

پھر یاد رکھنا چاہیے کہ اسلام میں جزیہ کبھی اُس طرح کا ٹیکس شمار نہیں کیا گیا جو فاتح، مفتوحوں پر لوٹ مار کے علاوہ لگا دیا کرتے تھے، بلکہ یہ ایک قلیل رقم تھی جو اُس خدمت کے عوض وصول کی جاتی تھی جو اسلامی حکومت، ذمیّوں کی کیا کرتی تھی۔ اُنہیں ہر قسم کی زیادتیوں سے بچاتی تھی، جیسا کہ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ سے ہر شخص معلوم کر لے سکتا ہے۔ ظاہر ہے صحابہ، شریعت کے مقاصد سب سے زیادہ جانتے اور اُنہیں پورا کرنے میں سب سے زیادہ عدل و انصاف برتتے تھے۔ اِس کے شواہد بکثرت موجود ہیں جنہیں ہم اپنی تفسیر میں اِسی آیت کے سلسلہ میں درج کر چکے ہیں۔

چنانچہ خالد بن الولید رضی اللہ عنہ جب فُرات میں فاتحانہ داخل ہوئے تو اُنہوں نے صلوبا بن نسطونا کو حسب ذیل عہد نامہ لکھ دیا تھا:

"یہ تحریر خالد بن الولید کی طرف سے صلوبا بن نسطونا اور اُس کی قوم کے نام ہے ——— میں نے تم سے جزیہ اور حمایت پر معاہدہ کیا ہے۔

تمھارے لیے ہمارا ذمہ ہے اور ہماری حمایت ہے۔ جب تک ہم تمھاری حمایت کریں گے تم سے جزیہ لیں گے۔ جب حمایت نہ کر سکیں گے تو جزیہ بھی تم ادا نہیں کرو گے۔ ماہ صفر سنہ ۱۲ھ میں یہ تحریر لکھی گئی،،

یہ معاہدہ اس بات کی صاف دلیل ہے کہ جزیہ، حمایت و حفاظت کا عوض ہے۔ جب تک حمایت رہے گی، جزیہ بھی رہے گا۔ جب حمایت باقی نہ رہے گی، جزیہ بھی باقی نہ رہے گا۔

اِس کی تائید اُس واقعہ سے بھی ہوتی ہے جسے بلاذری نے "فتوح البلدان" اور ازدی نے "فتوح الشام"(۱) میں لکھا ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے حضرت ابوعبیدہ کے حکم سے وہ تمام جزیہ واپس کر دیا تھا جو شہر حمص کے باشندوں سے وصول کر چکے تھے اور واپس کرتے وقت صاف کہہ دیا تھا کہ ہم نے تم سے جزیہ محض اس لیے لیا تھا کہ تمھاری حفاظت و حمایت کریں گے، مگر چونکہ اب تمھاری حفاظت و حمایت نہیں کر سکتے، اس لیے تمھارے جزیہ کی رقم واپس کر دینا ضروری ہے۔ یہ واقعہ جنگ یرموک سے پہلے پیش آیا تھا اور حمص کے باشندوں کو اس پر بہت تعجب ہوا تھا، عیسائیوں کو بھی اور یہودیوں کو بھی۔ اور یہ اس لیے کہ فاتح ہونے کے باوجود مسلمانوں نے اس قدر اچھا برتاؤ کیا تھا چنانچہ وہ اپنے ہم مذہب رومیوں کے مقابلے میں مسلمانوں کے فتحمندی کی دعائیں کرنے لگے تھے۔

(۱) ازدی کی "فتوح الشام" مترجمہ ملیح آبادی شائع ہو چکی ہے (مترجم)

اِس تفصیل سے ظاہر ہوجاتا ہے کہ اسلام نے، سرکشی و ظلم کی راہ سے جنگ کو حرام قرار دیا ہے، اور جنگ کا مقصد صرف یہ قرار دیا ہے کہ دنیا سے برائیاں دور کی جائیں اور بھلائیاں قائم کی جائیں۔ یعنی اسلام نے جنگ کو محض ایک ضرورت اور مجبوری کی چیز قرار دیا ہے جسے اُس کی قدرتی حدوں ہی تک محدود رکھنا چاہیے۔ نیز اِس تفصیل سے یہ حقیقت بھی ثابت ہوجاتی ہے کہ سچا اور شریفانہ امن، صرف اسلام ہی کی راہ سے دنیا کو مل سکتا ہے، بشرطیکہ اُس کے ٹھہرائے ہوئے اصول پر جنگ کے قواعد و قوانین مقرر کیے جائیں۔

اسلام کے یہ اصول دیکھ کر ہر کس و ناکس معلوم کرے سکتا ہے کہ اس بارے میں کوئی دین، کوئی بین الاقوامی قانون، کوئی فلسفی یا اخلاقی ضابطہ اور کوئی قوم بھی اپنے عمل و قانون سے اسلام پر فوقیت نہیں رکھتی۔ صرف یہی ایک بات ہر اُس شخص کے لیے جو علیم و حکیم پروردگار پر ایمان رکھتا ہے، اِس حقیقت کی کھلی دلیل ہے کہ یہ سب کچھ محمدؐ عربی نبی اُمّی نے اللہ عزوجل کی وحی سے ہی معلوم کیا ہے، اور یہ کہ آپ کی عقل و ذہانت، اِن اجتماعی پیچیدگیوں کو وحی الٰہی کے بغیر سلجھا نہیں سکتی تھی۔ لیکن اِس اعلیٰ ہدایت کے ساتھ جب مذکورۂ بالا حقائق کو اور آیندہ بیان ہونے والے روحانی، اخلاقی، اجتماعی معارف اور غیب کی خبروں کو دیکھا جائے تو پھر آپ کی نبوت مان لینے میں کیسے تامل ہوسکتا ہے؟

قرآن کا نواں مقصد

عورتوں کیلیے تمام انسانی، دینی، اور شہری حقوق

اسلام سے پہلے تمام قوموں، تمام شریعتوں، تمام قانونوں، حتیٰ کہ اہل کتاب میں بھی عورتیں، مظلوم تھیں۔ حقیر تھیں۔ کنیزیں سمجھی جاتی تھیں۔ یہاں تک کہ اسلام آیا، اور خدا نے اپنے خاتم النبیین محمد علیہ الصلاۃ والسلام کو مبعوث کر کے اپنا دین کامل کر دیا۔ اپنی مقدس کتاب اور اپنے پیغمبر کی سنت کے ذریعہ، جو کتاب الٰہی کا قولی وعملی بیان ہے، عورتوں کو وہ تمام حقوق بخش دیئے جو مردوں کو حاصل تھے، بجز اُن باتوں کے جو عورت کے مخصوص مزاج اور فرائض سے تعلق رکھتی ہیں۔ اسلام نے اسی قدر نہیں کیا بلکہ عورت کی عزت کا خیال رکھا ہے، اور اُس سے مہربانی کے برتاؤ کا حکم دیا ہے، حتیٰ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے "عورتوں کی عزت وہی کرتا ہے جو شریف النفس ہے اور اُن کی توہین وہی کرتا ہے جو بدنفس ہے"۔ (ابن عساکر حدیث علی علیہ السلام)

صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین میں جو لوگ زیادہ عقلمند تھے، وہ محسوس کرتے تھے کہ اسلام نے عرب کے فساد، ظلم، بداخلاقی کی کتنی بڑی اصلاح کر دی ہے، چنانچہ وہ اس چیز کو بہت اہمیت دیتے اور اسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی

نبوت کا ایک ثبوت خیال کرتے تھے، کیونکہ اُنہیں معلوم تھا کہ نبوت سے پہلے آپ اُن میں نہ علم کے لحاظ سے ممتاز تھے نہ بلاغت کے لحاظ سے۔ آپ کو جو کچھ خصوصیت حاصل تھی وہ صرف اعلیٰ اخلاق اور پاک فطرت کی بنا پر تھی۔ اِسی لیے جلیل القدر مصلح، اسلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی روش کو جاری کرنے والے، قوموں کے نظم ونسق میں انصاف قائم کرنے والے عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے "اسلام کو شکست کر ڈالنے والی یہ چیز ہے کہ ہم جاہلیت میں اپنی حالت کو بھول جائیں!" حضرت عمرؓ کو اگر تاریخ اقوام سے واقفیت ہوتی تو جان لیتے کہ اسلام نے صرف عرب ہی کی نہیں بلکہ تمام قوموں کی اصلاح کر دی ہے، عام اِس سے کہ بُت پرست ہوں یا اہل کتاب۔ کسی ایک چیز میں نہیں بلکہ تمام چیزوں میں۔ میں یہاں عورتوں کی اصلاح سے متعلق بعض اہم اسلامی اصول کی طرف اشارہ کرتا ہوں جنہیں حقوقِ نسواں سے متعلق اپنی کتاب میں تفصیل سے بیان کر چکا ہوں۔ اِس کتاب کے مقدمہ میں بعثت محمدی سے پہلے تمام قوموں کی عورتوں کا حال اِس طرح لکھا ہے:

"عورت، مال واسباب اور چوپایوں کی طرح بیچی اور خریدی جاتی تھی۔ اُسے شادی کرنے اور بدکاری اختیار کرنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ اُس کے مال میں تو لوگ وارث بن جاتے تھے، مگر وہ کسی کے مال میں وارث بن نہیں سکتی تھی۔ لوگ اُس کے مالک بن سکتے تھے، مگر وہ کسی چیز کی مالک بن نہیں

سکتی تھی۔ اُسے حق نہ تھا کہ مرد کی اجازت کے بغیر اپنی کسی چیز میں بھی تصرف کر سکے، صرف شوہر ہی کو حق تھا کہ اپنی بیوی کے مال میں جو چاہے، کرے مگر خود بیوی کو اپنے مال میں کوئی اختیار حاصل نہ تھا۔ بعض ملکوں میں تو یہ بحث بھی بڑی سنجیدگی سے جاری تھی کہ آیا مرد کی طرح عورت بھی انسان ہے جس میں خدا کی لازوال روح جلوہ گر ہے؟ اور یہ کہ اُسے دین کی تعلیم دینا جائز ہے یا نہیں؟ اور یہ کہ اُس کی عبادت صحیح ہوتی ہے یا نہیں؟ اور یہ کہ وہ جنت میں داخل ہوگی یا نہیں؟ روم کی ایک دینی کانگریس نے فتویٰ دیا تھا کہ عورت، نجس حیوان ہے جس میں روح نہیں ہے، لیکن اُس پر عبادت اور خدمت فرض کر دی گئی ہے! اور یہ کہ اونٹ اور کتے کی طرح عورت کا منھ باندھ دینا چاہیے تاکہ وہ نہ ہنس سکے نہ بول سکے، کیونکہ وہ شیطان کا جال ہے! بڑی بڑی پرانی شریعتوں نے بھی باپ کے لیے جائز رکھا تھا کہ اپنی بیٹی کو بیچ ڈالے! بعض عربوں کے نزدیک باپ کو حق تھا کہ اگر اپنی بیٹی کو قتل کر ڈالے تو نہ اُس سے قصاص لیا جائے گا نہ خوں بہا وصول کیا جائے گا!"

اس کے بعد میں نے اسلام میں عورتوں کے حقوق پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے:

"اسلام نے آکر عرب و عجم کی اُن تمام زیادتیوں کو دور کر دیا جو وہ عورتوں سے جائز رکھتے تھے، جیسے اُنہیں حقِ ملکیت سے محروم کرنا، یا اپنے مال میں

بھی اُنہیں تصرف سے باز رکھنا۔ شوہروں کا اپنی بیویوں کی جائدادیں جو جی چاہے کرنا۔ اسلام نے اِن تمام مظالم کو دور کر کے عورت کو ملکیت کے تمام حقوق بخش دیئے۔ چنانچہ مردوں کی طرح عورتوں کو بھی حق دیا کہ اپنے مال میں آزادی سے وصیت کریں، اور اپنے رشتہ داروں کی جائداد کی وارث بنیں۔ اِسی قدر نہیں بلکہ مردوں سے زیادہ یہ حق بھی بخشا کہ اُن کے لیے مَہر مقرر کر دیا اور ضروری ٹھہرایا کہ شوہر اُن کا اور اُن کی اولاد کا نفقہ بھی ادا کریں، اگرچہ عورتیں، مالدار ہی کیوں نہ ہوں۔ نیز عورتوں کو تجارت کرنے کے، اجارہ دینے کے، ہبہ کرنے کے، صدقہ نکالنے کے، غرضکہ تمام جائز حقوق جو مردوں کو حاصل تھے، اُنہیں بھی دے دیے، حالانکہ فرانس کی عورتیں آج تک مالی اور قانونی معاملات میں اپنے شوہروں کی پابند ہیں،،

اپنی مذکورۂ بالا کتاب سے میں ذیل کے مسائل اختصار کے ساتھ یہاں درج کرتا ہوں:

ا ـــــ بہت سے یورپین اور دوسرے لوگ، عورت کو انسان نہیں بلکہ بے عقل جانور یا شیطان سمجھا کرتے تھے، یہاں تک کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے اور اللہ تعالیٰ کے اِس فرمان کا اعلان کیا:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَ	اے لوگو، ہم نے تمھیں ایک ہی نر اور مادہ سے پیدا کیا اور قوموں قبیلوں کی شکل میں

قَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا، إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ أَتْقَاكُمْ۔ (۴۹۔ ۱۳)	کر دیا تاکہ باہم شناخت کرو۔ خدا کے نزدیک عزت والا وہی ہے جو تم میں سے زیادہ پرہیزگار ہے۔

نیز اعلان فرمایا:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا (۴: ۱)	اے لوگو، ڈرو اپنے پروردگار سے جس نے تمھیں ایک ہی جان سے پیدا کیا اور اُس کا جوڑا بھی اُسی سے پیدا کیا، اور دونوں سے بہت مرد اور عورتیں پھیلا دیں۔ ڈرو اللہ سے جس کا آپس میں واسطہ دیتے رہتے ہو اور رشتوں کا خیال رکھو۔ اللہ تم پر نگراں ہے۔

۲۔۔۔۔ یورپ وغیرہ ممالک میں بہت سے لوگ سمجھتے تھے کہ عورت کا دین وایمان، صحیح نہیں ہو سکتا، حتیٰ کہ اُسے قانون کے زور سے مقدس کتابیں پڑھنے سے روکتے تھے، یہاں تک کہ اسلام آیا اور اُس نے تمام دینی معاملات میں مردوں اور عورتوں کو مومنین ومومنات، مسلمین ومسلمات کہہ کر یکساں طور سے مخاطب کیا۔ اس بارے میں قرآنی آیات سب کو معلوم ہیں۔

خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر سب سے پہلے ایمان لانے

والی ایک عورت ہی تھی، اور وہ آپ کی زوجہ، خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ عنہ تھیں
خود قرآن میں اللہ تعالیٰ نے عورتوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت
کا ذکر کیا ہے، پھر اسی بیعت کے بموجب آپ نے مردوں سے بیعت لی۔
اور جب قرآن باضابطہ طور پر ایک مجلّد کے اندر جمع کیا گیا تو ایک عورت ہی
کے پاس اُس کی جلد رکھی گئی تھی، اور وہ ام المومنین حفصہ تھیں۔ خلیفۂ اول
ابوبکر صدیق کے وقت سے خلیفۂ سوم عثمان بن عفان (رضی اللہ عنہم) کے
وقت تک قرآن کی جلد انہی کے پاس رہی؛ یہاں تک کہ اُن سے لے کر اُس
کی کئی نقلیں کرائی گئیں اور مختلف علاقوں میں بھیج دی گئیں تاکہ اُنہی کو اصل
قرار دیا جائے اور اُنہی سے مزید نقلیں کی جائیں۔

۳ــــــ بہت لوگوں کا عقیدہ تھا کہ عورت میں خدا کی روح نہیں
ہے، اس لیے وہ جنت میں مومنوں کے ساتھ نہیں رہے گی ــــــ یہ وہم اِس
غلط خیال پر مبنی تھا کہ عورت، دیندار نہیں ہو سکتی ــــــ لیکن قرآن نے
آکر فرمایا:

لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتَابِ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْۤءًا يُّجْزَ بِهٖ وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ۔ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى	نہ تمھاری آرزوؤں سے کچھ ہے نہ اہل کتاب کی آرزوؤں سے۔ جو شخص برائی کرے گا، اُسے سزا ملے گی اور خدا کے مقابلہ میں کسی کو حامی و مددگار نہ پا سکے گا۔ مرد ہو یا عورت، جو کوئی بھی

وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا۔	نیکوکار بنے گا، اس حال میں کہ مؤمن ہے، تو ایسے لوگ جنت میں داخل ہونگے اور اُن پر ذرا ظلم نہ کیا جائے گا۔

اور فرمایا:

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّىْ لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ۔	اُن کے پروردگار نے فرمایا، میں تم میں سے کسی نیکوکار مَرد یا عورت کا عمل ضائع ہونے نہیں دونگا۔ تم باہم ایک ہی ہو۔

اس آیت میں صاف وعدہ فرمایا ہے کہ عورتوں کو بھی بہتی ہوئی نہروں والی جنتوں میں داخل کیا جائے گا۔

۴ ــــــ بہت لوگ عورتوں کو حقیر سمجھتے تھے اور روا، نہ رکھتے تھے کہ مَردوں کے ساتھ دینی عبادت خانوں اور اخلاقی محفلوں میں شریک ہوں۔ نیز اجتماعی، سیاسی، اصلاحی کاموں میں حصہ لیں، مگر قرآن نے آکر یہ کہا کہ:

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَ	مومن مرد اور مومن عورتیں آپس میں ایک دوسرے کی مددگار ہیں۔ یہ سب مل کر نیکی کا حکم دیتے، برائی سے منع کرتے، نماز قائم کرتے، زکاۃ ادا کرتے، اور اللہ و رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔

رَسُولَهُ، أُولٰئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ، إِنَّ اللّٰهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ۔	اللہ عنقریب اُن پر رحم کرے گا۔ اللہ زبردست ہے حکمت والا۔

اِس آیت میں صاف طور پر فرما دیا ہے کہ مُومن عورتیں عام طور پر مومن مردوں کی مدد کریں گی۔ اِس میں جنگی مدد بھی داخل ہے، مگر شریعت نے عورتوں پر جہاد فرض نہیں کیا ہے، لہٰذا جنگوں میں اُن کی مدد یہ تھی کہ مجاہدوں کے لیے کھانا پکاتی تھیں۔ پانی لاتی تھیں۔ زخمیوں کی تیمار داری کرتی تھیں۔ اِسی قدر نہیں بلکہ مردوں کے ساتھ نماز جماعت پڑھتی تھیں۔ نیکی کا حکم دیتی تھیں۔ برائی سے منع کرتی تھیں، حتیٰ کہ اُن میں سے بعض تو خود امیرالمومنین عمر بن خطاب پر علی الاعلان اعتراض کر بیٹھتی تھیں، اور اگر امیرالمومنین غلطی پر ہوتے تھے تو اپنی رائے چھوڑ کر اُن کی بات مان لیتے تھے، حالانکہ معلوم ہے کہ حضرت عمر سے مَرد بھی لرزہ براندام رہتے تھے۔

اِس آیت کے بعد خدا نے وہ سب سے بڑی آیت نازل کی ہے جس میں مَردوں اور عورتوں، دونوں کے ثواب کو بیان کر دیا ہے، جسمانی ثواب کو بھی اور روحانی ثواب کو بھی۔ فرمایا:

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ جَنّٰتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَمَسَاكِنَ طَيِّبَةً	خدا نے مومن مردوں اور عورتوں سے ایسی جنتوں کا وعدہ کیا ہے جن میں نہریں بہتی ہونگی اور ستھرے مکانوں کا دائمی جنتوں میں وعدہ

فِی جَنّٰتِ عَدْنٍ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰہِ اَکْبَرُ، ذٰلِکَ ھُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ۔	کیا ہے۔ اللہ کی رضامندی سب سے بڑی چیز ہے، اور یہی بڑی کامیابی ہے۔

۵ ـــــ بہت لوگ عورتوں کو حقِ میراث سے محروم کرتے تھے۔ بہتیرے اُنہیں ملکیت کا بھی حق نہیں دیتے تھے۔ بلکہ جو کچھ اُن کے ہاتھ میں ہوتا تھا، اُس میں بھی اُنہیں تصرّف کا مجاز نہیں سمجھتے تھے۔ اسلام نے آکر اس ظلم کا قلع قمع کر ڈالا، اور یہ تمام حقوق عورتوں کو دائرۂ شریعت کے اندر بخش دیے۔ فرمایا:

لِلرِّجَالِ نَصِیْبٌ مِّمَّا تَرَکَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ وَلِلنِّسَآءِ نَصِیْبٌ مِّمَّا تَرَکَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْہُ اَوْ کَثُرَ نَصِیْبًا مَّفْرُوْضًا۔	والدین اور رشتہ دار جو کچھ چھوڑیں، اُس میں مردوں کا بھی حصہ ہے اور عورتوں کا بھی، چاہے وہ زیادہ چھوڑیں یا کم۔ یہ مقرر کیا ہوا حصہ ہے۔

اور فرمایا:

لِلرِّجَالِ نَصِیْبٌ مِّمَّا اکْتَسَبُوْا وَلِلنِّسَآءِ نَصِیْبٌ مِّمَّا اکْتَسَبْنَ۔	مردوں کے لیے اُن کے اعمال کا حصہ ثابت ہے اور عورتوں کے لیے اُن کے اعمال کا حصہ ثابت ہے۔

یہ اسلام نے آج سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے کیا ہے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ولایاتِ متحدۂ امریکا نے ابھی حال ہی میں عورتوں کو ملکیت

و تصرّف کا حق دیا ہے، لیکن فرانسیسی عورت آج بھی اِن معاملات میں اپنے شوہر کی خواہشوں کی پابند ہے۔ برخلاف اس کے مسلمان عورت کو یہ حقوق شروع سے حاصل ہیں!

۶ ——— بدوی قبیلوں اور متمدن قوموں میں شادی دراصل ایک قسم کی غلامی تھی۔ مَرد، عورتوں کو کنیزیں بنا لیا کرتے تھے۔ لیکن اسلام نے شادی کو ایک دینی شہری معاہدہ بنا دیا، تاکہ ایک طرف نفس کو اُس کا فطری حق حاصل ہو جائے۔ دوسری طرف زن و شو کی باہمی محبت کا دائرہ وسیع ہو کر اُن کے خاندانوں میں محبت عام ہو جائے۔ رحم و کرم کا انسانی جذبہ مکمل ہو جائے، اور والدین سے اولاد میں منتقل ہو، چنانچہ خود اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُم مَّوَدَّةً وَرَحْمَةً، إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ۔	خدا کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اُس نے تمہارے لیے تمہاری ہی قسم کے جوڑے بنائے تاکہ اُن کے پاس چین پاؤ اور رکھ دیا تمہارے بیچ پیار اور مہر۔ اس میں دھیان کرنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔

۷ ——— قرآن نے نیکی اور بھلائی کی بنیاد پر تمام واجبات و حقوق میں مردوں اور عورتوں کو برابر کر دیا ہے۔ مگر ہاں خانگی زندگی میں سرداری

مرد کو بخشی ہے، کیونکہ وہ کمانے اور حمایت کرنے کی عورت سے زیادہ قدرت رکھتا ہے۔ فرمایا:

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ۔	عورتوں کا حق بھی ویسا ہی ہے جیسا اُن کے ذمہ ہے نیکی کے ساتھ، اور مردوں کو اُن پر درجہ حاصل ہے۔

اِس "درجہ" کی تشریح یہ فرمائی:

اَلرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَبِمَا اَنْفَقُوا مِنْ اَمْوَالِهِمْ۔	مرد، عورتوں پر سردار ہیں، اِس لیے کہ اللہ نے بعضوں کو بعض پر فضیلت دی ہے، اور اِس لیے کہ مرد اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔

اِسی سرداری کی بنا پر شوہر کے ذمہ کر دیا گیا ہے کہ اپنی بیوی اور بچوں پر خرچ کرے۔ اِس خرچ کا کچھ بھی بار عورت پر نہیں رکھا، اگرچہ وہ اپنے شوہر سے زیادہ مالدار ہی کیوں نہ ہو۔ اِسی قدر نہیں بلکہ عورت کے لیے مہر کی رقم بھی مقرر کر دی ہے۔ معاہدے کے بموجب ہر مسلمان پر فرض ہے کہ اپنی بیوی کا مہر فوراً ادا کر دے، حتیٰ کہ اگر عقد کے وقت مہر کا ذکر نہیں کیا گیا ہے، تو بھی شوہر کو اُتنا مہر ضرور ادا کرنے پڑے گا جتنا سوسائٹی میں اُس کی بیوی جیسی عورت کو دیا جاتا ہے۔ نیز زن و شو کو یہ بھی حق دیا ہے کہ اگر چاہیں تو مہر کی رقم کو مؤجّل کر دیں، یعنی وہ بعد میں ادا کی جائے۔ برخلاف اِس کے

ہم آج بھی دیکھتے ہیں کہ غیر مسلم قومیں، عورتوں کو مجبور کرتی ہیں کہ اپنے شوہروں کو مہر ادا کریں!

اِسلام سے پہلے یہ دستور تھا کہ عورت کے سرپرست اُسے شادی پر مجبور کر دیا کرتے تھے، ایسے آدمی سے بھی جسے وہ ناپسند کرتی تھی یا یہ کرتے تھے کہ عورت کو شادی کرنے ہی سے روک دیتے تھے۔ یہ بھی ہوتا تھا کہ شوہر طلاق دے دیتے تھے، مگر مطلّقہ کو دوسرا نکاح کرنے نہیں دیتے تھے۔ اسلام نے اِن سب باتوں کو بالکل حرام کر دیا جیسا کہ کلام اللہ اور سنت رسول اللہ سے ثابت ہے اور سب کو معلوم۔

۸ ——— عرب، بنی اسرائیل، اور دوسری قوموں کے مرد جتنی عورتوں سے چاہتے تھے، شادی کر لیتے تھے۔ کسی تعداد کے بھی پابند نہ تھے۔ اپنی بیویوں میں انصاف بھی نہ کرتے تھے۔ اسلام نے آکر یہ کیا کہ بیک وقت چار عورتوں سے زیادہ شادی کرنے سے منع کر دیا، اور یہ بھی صاف کہہ دیا کہ جسے اندیشہ ہو کہ دو عورتوں میں بھی انصاف نہیں کر سکے گا، اُسے صرف ایک ہی عورت رکھنی چاہیے۔ اسلام نے ایک سے زیادہ شادی کی اجازت صرف اُسی شخص کو دی ہے جسے اِس کی واقعی ضرورت ہو اور خرچ بھی کر سکتا ہو۔ یہ اجازت درحقیقت ایک اجتماعی ضرورت ہے اور اکثر پیش آجاتی ہے، جیسے پہلی بیوی بانجھ ہو۔ یا اِتنی بوڑھی ہو گئی ہو کہ اولاد پیدا نہ کر سکے، یا ایسی بیماری میں مبتلا

ہو گئی ہو کر کام کی نہیں رہی، یا ایسی صورت حال ہو کہ شوہر کے لیے کافی نہ ہو۔ پھر کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کئی کئی شادیاں خود عورتوں کی مصلحت کے مطابق ہوتی ہیں، مثلاً جب وہ مردوں سے زیادہ ہو جائیں، جیسا کہ بڑی جنگوں کے بعد اکثر دیکھا جاتا ہے، یا یہ کہ جب بہت سے مرد کمائی کے لیے ہجرت کر جائیں۔

غور کرو زنا کو حرام قرار دینے والی شریعت کیونکر عورت کی یا انسانیت کی مصلحت اس میں تصور کر سکتی ہے کہ جب عورتیں، مردوں سے زائد ہو جائیں تو زوجیت کی زندگی سے، اُس کی پرہیزگاری سے، شوہر کی کفالت سے مادری رتبہ کی عزت سے محروم رہیں؟ کیا سوسائٹی کا فائدہ اس میں ہے کہ عورتوں کو بدکاری کی اجازت دے دی جائے، اور وہ اُن بدنی اور اجتماعی مصائب و آلام میں مبتلا ہو جائیں جن میں ہم آج کل یورپین ملکوں کی عورتوں کو اور اُن کے محکوم یا مقلّد ملکوں کی عورتوں کو مبتلا دیکھ رہے ہیں؟

ہم نے یہ بحث سورۂ نساء کی آیتِ تعدُّد میں صاف کر دی ہے، اس کے بعد اپنی کتاب "اسلام میں حقوقِ نسواں" کے اندر اور اضافہ کر دیا ہے جسے دیکھ کر ہر عاقل و منصف آدمی تسلیم کرے گا کہ اسلام نے تعدادِ ازواج کے بارے میں جو کچھ کیا ہے، وہی عینِ حق و انصاف ہے، اور انسانی مصلحت کے مطابق۔

۹ ــــــــ طلاق بھی کبھی زوجیت کی زندگی کی ایک ضرورت بن جاتی ہے، مثلاً جب زن و شوہر باہم حقوق زوجیت ادا نہیں کرسکتے۔ حدود الٰہی قائم نہیں کرتے۔ نیکوکاری پر استوار نہیں رہتے۔ نفقہ کا سامان نہیں ہوسکتا۔ اور اچھائی کے ساتھ یکجائی مشکل ہوجاتی ہے۔ اہل کتاب اور عرب بت پرست دونوں گروہوں کے ہاں طلاق جائز تھی، مگر اس طرح کہ عورتیں ہی ہمیشہ سخت نقصان میں رہتی تھیں۔ لیکن اسلام ایسی اصلاح لایا جیسی نہ کسی پچھلی شریعت میں موجود تھی نہ قانون میں۔ اہل فرنگ، طلاق کو حرام سمجھتے تھے اور اس کی وجہ سے اسلام پر حرف گیری کیا کرتے تھے، لیکن بعد میں مجبور ہوگئے کہ اُسے جائز کرلیں مگر ایسے بُرے طریقہ سے اور اس قدر اسراف و مبالغہ کے ساتھ کہ اُن کی خانگی زندگی کے درہم برہم ہوجانے اور خاندان و کنبہ کے رشتے ٹوٹ جانے کا اندیشہ پیدا ہوگیا ہے۔ اِن لوگوں کے ہاں طلاق کے جو اسباب اخباروں میں شائع ہوتے رہتے ہیں، نہایت مضحکہ خیز ہیں، مثلاً یہ کہ عورت سر پر پورے بال رکھتی ہے یا نہیں! اور یہ کہ مرد داڑھی منڈاتا ہے یا بڑھاتا ہے! یا یہ کہ شوہر گھر میں اخبار اور کتابیں پڑھا کرتا ہے! یا یہ کہ عورت بہت باتونی ہے حتیٰ کہ ٹیلیفون پر بھی باتیں کرتی رہتی ہے!

اسلام نے نکاح کا معاملہ مرد کے ہاتھ میں رکھا ہے، اس لیے طلاق کا حق بھی قدرتی طور پر اُسی کے ہاتھ میں ہونا چاہیے۔ چونکہ مرد ہی پر نکاح کرنے

اور نکاح توڑنے کا خرچ پڑتا ہے، اس لیے وہ عورت سے زیادہ نکاح کو برقرار رکھنے پر مجبور ہوتا ہے۔ پھر وہ عورت سے زیادہ بہادر ہوتا اور شدائد برداشت کرسکتا ہے۔ مزید برآں خدا نے اپنی کتاب میں یہ حکم دے کر مَردوں کو اور بھی زیادہ ضبطِ نفس کرنے اور عورتوں کی کمزوریاں سہنے پر آمادہ کر دیا ہے:

وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ فَإِنْ كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا۔

عورتوں کے ساتھ بھلائی سے رہو، اگر تم اُنہیں ناپسند کرتے ہو تو ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور خدا اُس میں تمہارے لیے بہت بھلائی رکھ دے۔

لیکن شریعت نے عورت کو حق دیا ہے کہ شوہر سے یہ شرط لے کہ دوسری شادی نہیں کرے گا، اور اگر کرے تو وہ اُس سے الگ ہوسکتی ہے نیز یہ حق بھی دیا ہے کہ اگر شوہر میں کوئی جسمانی نقص ہو یا بیمار ہو یا نفقہ کا متحمل نہ ہوسکے، تو عورت قاضی سے مطالبہ کرسکتی ہے کہ نکاح فسخ کر دیا جائے مطلّقہ کا خرچ شوہر کے ذمہ رکھا ہے جو اُسے عدّت کے زمانہ میں ادا کرتا رہے گا، یعنی جب تک عورت کے لیے دوسری شادی کرنے کی اجازت نہیں۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے طلاق کی مذمت کی ہے اور فرمایا ہے کہ خدا اُسے سخت ناپسند کرتا ہے، اور یہ اس لیے کہ مسلمانوں کو بھی اُس سے نفرت پیدا ہو: وغیرہ وغیرہ احکام جنہیں ہم نے اپنی تفسیر اور عورتوں سے متعلق اپنی نئی کتاب میں بیان

کر دیا ہے۔

۱۰ــــــ اسلام نے والدین سے نیکی کا برتاؤ کرنے کی بہت زیادہ تاکید کی ہے، اور اسے خود عبادت الٰہی کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ماں سے حسنِ سلوک کو باپ سے سلوک پر مقدّم رکھا ہے۔ اس کے بعد لڑکیوں کی تربیت اور بہنوں کی کفالت پر بہت زور دیا ہے۔ اسلام نے یہاں تک کیا ہے کہ ہر عورت کے لیے ایک سرپرست کا وجود ضروری ٹھہرا دیا ہے جو اُس کا خیال رکھے اور اُس کے کام آئے۔ جس عورت کا کوئی رشتہ دار ولی نہیں ہے، اُس کی سرپرستی مسلمان حکّام کے ذمہ واجب کر دی ہے۔

غرضکہ کسی دین، کسی شریعت، کسی قانون نے عورتوں کو وہ حقوق وہ عزت، وہ احترام نہیں بخشا، جو اسلام نے اُنہیں بخش دیا ہے۔ کیا یہ سب اس بات کی کھلی دلیل نہیں ہے کہ علیم و حکیم، رحمان و رحیم خدا کی یہ وحی ہے جو اُس نے اپنے نبی اُمّی پر نازل کی جسے امیوں ہی میں سے اٹھایا تھا۔ بے شک و شبہ یہ اللہ ہی کی وحی ہے اور ہم اس کے دلیل کے ساتھ گواہ ہیں،

والحمد للہ رب العالمین!

قرآن کا دسواں مقصد

غلاموں کی آزادی

طاقتوروں کا کمزوروں کو غلام بنا لینا، قدیم ترین زمانہ سے انسانوں میں رائج ہے، بلکہ یہ چیز اُن کیڑوں میں بھی پائی جاتی ہے جو اجتماعی اور تعاونی زندگی بسر کرتے ہیں۔ چنانچہ چیونٹیوں کے دو قبیلوں میں جب لڑائی ہوتی ہے تو فتح پانے والا گروہ قتل سے بچ جانے والی چیونٹیوں کو پکڑ لیتا ہے اور اپنے لیے گھر بنانے اور کھانا وغیرہ جمع کرنے کی خدمت پر لگا دیتا ہے۔

قدیم تمدن کی مالک قومیں، مصری، بابلی، ایرانی، ہندوستانی، یونانی، رومی، اور عرب وغیرہم کمزوروں کو غلام بناتے اور اُن سے سخت ترین محنت کے کام لیتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ سنگ دلی اور ظلم سے پیش آتے تھے۔ یہودی اور عیسائی شریعتوں نے بھی غلامی کو جائز رکھا ہے۔ فرنگیوں کے ہاں بھی غلامی برابر جاری رہی یہاں تک کہ اٹھارویں صدی عیسوی کے اواخر میں ولایات متحدۂ امریکا نے اپنے ہاں کے غلام آزاد کر دیے۔ اس کے بعد انیسویں صدی کے اواخر میں انگلستان نے مُہم شروع کی کہ تمام دنیا سے غلامی کو مٹا دیا جائے۔ لیکن ان دونوں حکومتوں نے یہ کام، انسانوں کی بھلائی اور اُن میں مساوات پیدا کرنے کے لیے نہیں کیا تھا۔ چنانچہ ولایات

متحدۂ امریکا کی حکومت ہنوز سفید فام آدمیوں کو امریکا کے اصلی سرخ فام باشندوں پر ترجیح دیتی اور اِن سے ایسا برتاؤ کرتی ہے جو دوسرے لفظوں میں سیاسی غلامی ہے، وہ غلامی جسے تمام فرنگی قومیں بالکل جائز سمجھتی ہیں۔
اِسی طرح انگلستان، ہندوستانیوں کی تحقیر کرتا اور اُنہیں ذلیل رکھنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے، اگرچہ حال میں ہندوستانیوں کی قومی بیداری نے اُس کے غرور و تکبّر پر کاری ضرب لگادی ہے اور اب وہ اُن سے ویسا ذلت آمیز برتاؤ نہیں کرسکتا جیسا شروع سے کرتا آیا تھا۔

لیکن جب دنیا میں اسلام آیا تاکہ اُس کا نور ہر ظلمت کو دور اور ہر فساد کو دفع کردے، تو اُس نے دوسرے مفاسد کے ساتھ اُس ظلم کو بھی دور کیا جو غلاموں پر ہر جگہ جاری تھا۔ اسلام نے یہ کیا کہ غلامی کو بتدریج موقوف کردینے والے احکام جاری کیے، کیونکہ بیک دفعہ موقوفی، غلاموں کی مصلحت کے بھی خلاف تھی اور اُن کے آقاؤں کی مصلحت کے بھی خلاف۔

حکومت ولایات متحدۂ امریکا نے دفعتاً غلامی موقوف کردی تھی، نتیجہ یہ نکلا کہ آزاد ہوکر غلام ہر طرف روزی کی تلاش میں مارے مارے پھرنے لگے، اور جب کہیں نہ ملی تو اپنے آقاؤں کے پاس واپس آگئے اور درخواست کی کہ پھر اپنی خدمت میں لے لیں!

یہی واقعہ سوڈان میں پیش آیا۔ انگریزوں نے تجربہ کرنا چاہا کہ نو

آزاد غلاموں کے لیے آزاد کام مہیا کریں جو اُن کی روزی کے لیے کافی ہوں، مگر وہ اِس تجربے میں ناکام رہے اور مجبوراً اجازت دینا پڑی کہ اپنے سابق آقاؤں کی خدمت میں اِس شرط کے ساتھ واپس چلے جائیں کہ وہ اُنہیں بیچ نہ سکیں گے۔

اسلام اور غلاموں کی آزادی

اسلام نے غلامی موقوف کرنے کے لیے دو طریقے اختیار کیے:
مستقبل میں نئے غلام نہ بنائے جائیں، اور پرانے غلاموں کو بتدریج آزاد کر دیا جائے تاکہ کسی کو کوئی نقصان یا پریشانی اٹھانا نہ پڑے۔

ا۔۔۔۔ اسلام نے اِس پرانے دستور کو بالکل منسوخ کر دیا کہ زبردست، کمزوروں کو غلام بنا لیں۔ ہاں اُس نے جنگ میں قید ہونے والے دشمنوں کو غلام بنانے کی اجازت دی ہے، مگر خود جنگ پر اُس نے اِتنی سخت پابندیاں عائد کر دی ہیں جو بُت پرست تو بُت پرست، کسی مہذّب قوم کے ہاں بھی نہ تھیں۔ پچھلے صفحوں میں دیکھ چکے ہو کہ اسلام نے جنگ کی اجازت اِسی شرط سے دی ہے کہ اُس سے غرض مصلحت قائم کرنا اور فساد دور کرنا ہو۔ نیز جنگ میں پورا پورا انصاف پیشِ نظر رکھا جائے اور ہرگز زیادتی نہ کی جائے۔ یہ بات نہیں ہے کہ اسلام نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ جنگ کے قیدیوں کو ضرور ہی غلام بنا لیں، جس طرح دوسری قومیں کیا کرتی

تھیں۔ بلکہ اُس نے مسلمانوں کے اولوالامر کو اختیار دیا ہے کہ اس بارے میں مصلحت کو دیکھیں، یا تو احسان کر کے قیدیوں کو چھوڑ دیں یا فدیہ لے کر آزاد کر دیں۔ فدیہ کی دو صورتیں رکھی ہیں: قیدی اپنے بدلے مال ادا کریں یا دشمن اُن کے عوض مسلمان قیدیوں کو رہا کر دے۔ یہ چیز اُس آیت میں بیان کی گئی ہے جسے ہم اصول جنگ میں درج کر آئے ہیں:

فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً۔	قید کر لو، اس کے بعد یا احسان کر دیا فدیہ قبول کر لو۔

اس آیت میں مسلمانوں کو اختیار دیا گیا ہے کہ قیدیوں کو بغیر کسی معاوضہ کے رہا کر دیں یا فدیہ لے کر چھوڑ دیں، اس لیے اسے نئے غلام بنانے کی ممانعت میں شریعت کی ایک اصل قرار دے دیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ دونوں صورتوں میں سے ایک کا اختیار دینے سے یہی مطلب نکلتا ہے کہ تیسری صورت، یعنی غلام بنانا جائز نہیں ہے۔ مگر نہیں۔ یہ ممانعت اُسی وقت ثابت ہو سکتی تھی جب دوسری قومیں، مسلمانوں کو غلام نہ بناتی ہوتیں ظاہر ہے اس سے بڑھ کر نقصان کی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ دشمن تو ہمارے آدمیوں کو غلام بنائے اور ہم اُس کے آدمیوں کو چھوڑ دیں، حالانکہ ہم مسلمان سب سے زیادہ رحم دل اور منصف ہیں جیسا کہ آئندہ معلوم ہو جائے گا۔ پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ آیت میں کوئی ایسا لفظ نہیں ہے جس

سے قطعی طور پر ثابت ہوتا ہو کہ مذکورۂ بالا دو صورتوں ہی پر عمل کیا جا سکتا ہے اور تیسری صورت پر عمل نہیں کیا جا سکتا۔ لہذا یہ آیت، غلامی کی حرمت پر قطعی دلیل نہیں ہے۔ دراصل یہ معاملہ اولوالامر کے اجتہاد سے تعلق رکھتا ہے، اور اُنہیں اختیار رہے کہ جنگ کے قیدیوں کو چاہیں غلام بنا لیں۔ چاہیں احسان کر کے چھوڑ دیں، چاہیں فدیہ لے کر آزاد کر دیں۔

اِن دونوں صورتوں کو چھوڑ کر غلام بنانے کی مصلحت، کم حالات میں پیش آسکتی ہے، اور یہ حالات بھی دائمی نہیں بلکہ عارضی ہو سکتے ہیں، مثلاً مسلمانوں سے لڑنے والوں کی تعداد کم ہو، جیسے بعض بدوی قبیلے جن کے تمام یا اکثر مرد قتل ہو جائیں۔ اب اگر اُن کی عورتیں، بچے، اور کمزور و لاچار لوگ یونہی چھوڑ دیے جائیں تو ظاہر ہے وہ زندگی بسر نہ کر سکیں گے، لہذا اُن کی بھلائی اِسی میں ہے کہ فاتح اُن کے کفیل ہو جائیں اور اُن کی روزی کا بندوبست کریں۔ اِس کے بعد اُن سے آزاد کرنے کے دوسرے طریقہ پر برتاؤ کیا جائے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ فاتح اِن غلام بننے والوں میں سے عورتوں کو اپنی حرم میں لے لیں، اور وہ اُن کی اولاد کی مائیں اور اُن کے گھروں کی مالک بن جائیں۔ کم سے کم اِتنا فائدہ تو مغلوبوں کو غلام بن کر ضرور ہی حاصل ہو جائے گا کہ اُن کی عورتیں اپنی روزی کی طرف سے بے فکر ہو کر شرمناک کمائی سے بچ جائینگی لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے لیے یہی نمونہ چھوڑا ہے کہ احسان

کرکے قیدیوں کو چھوڑ دیں۔ زبان سے بھی یہی فرمایا ہے اور عمل بھی یہی کیا ہے، چنانچہ غزوۂ بنی مصطلق، غزوۂ فتح مکہ، اور غزوۂ حُنین میں آپ نے یہی کیا تھا جیسا کہ کتبِ سیرت وغیرہ میں مفصل مذکور ہے، اور یہ آپ نے اس لیے کیا تھا کہ ان جنگوں میں دشمن کسی مسلمان کو بھی قید نہ کرسکے تھے، اور مسلمانوں نے اُنہیں بالکل بے بس کر ڈالا تھا۔ اِس سے معلوم ہوا کہ اسلامی شریعت نے قدرت واقتدار کے موقعہ پر نیکی واحسان ہی کو ترجیح دی ہے۔ نیکی واحسان میں یہ بھی داخل ہے کہ قیدیوں کو نہ حال کے کسی فائدہ کی خاطر، نہ مستقبل کے کسی خوف سے متاثر ہوکر، بلکہ محض نیکی واحسان کی خاطر آزاد کردیا جائے۔

غلاموں سے متعلق احکام اور اُن کی آزادی کے ضروری وسائل

۱ــــــ اسلام نے انسان کی آزادی کو اصل قرار دیا ہے، جیسا کہ امیر المومنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے مصر میں اپنے گورنر عمرو بن العاص کو لکھا تھا جن کی شکایت ایک قبطی نے آکر کی تھی "اے عمرو، تم نے آدمیوں کو کب سے غلام بنا لیا ہے، حالانکہ اُن کی ماؤں نے اُنہیں آزاد پیدا کیا ہے؟"، اِسی فاروقی مقولہ سے فقہاء نے یہ اصل بنائی ہے کہ غلامی اِس طرح ثابت نہیں ہوسکتی کہ کوئی اُس کا دعویٰ کر بیٹھے، بلکہ منکرِ غلامی کے قول کو مدّعی کے قول پر ترجیح دی جائے گی اور مدّعی سے ثبوت طلب کیا جائے گا۔

۲ــــــ شرعی جنگ کے قیدیوں کے سوا، جس کی شرطیں اوپر بیان

ہو چکی ہیں، اسلام نے باقی آزاد لوگوں کو غلام بنانا، حرام قرار دیا ہے اور اسے بہت بڑا گناہ بتایا ہے۔ چنانچہ بخاری میں ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے، قیامت کے دن میں تین آدمیوں سے جھگڑا کروں گا، اور جس سے میں جھگڑا کروں گا، اُسے پیس ہی ڈالوں گا: اُس آدمی سے جس نے میرے نام پر عہد کیا اور بے وفائی کی۔ اُس آدمی سے جس نے مزدور سے کام لیا اور اُس کی پوری مزدوری نہ دی"، ایک اور حدیث ہے کہ خدا اُس آدمی کی کوئی نماز قبول نہ کرے گا "جس نے آزاد آدمی کو ایسا بنا دیا ہے گویا وہ غلام ہے،" (سنن ابی داؤد و ابن ماجہ)

۳ــــــــ اللہ تعالیٰ نے غلام کو اجازت دی ہے کہ اپنے آپ کو اپنے مالک سے خرید لے، اور یہ اس طرح کہ اپنے عوض ایک مقررہ رقم ادا کر دے اگرچہ قسطوں ہی کی صورت میں ہو۔ شریعت کی بول چال میں اس چیز کا نام "کتاب" اور "مکاتبہ" ہے۔ اس کی اصل اس آیت میں موجود ہے:

وَالَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتَابَ مِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوْهُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْرًا وَّاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اٰتَاكُمْ ۔	تمھارے غلاموں میں سے جو لوگ اپنے بارے میں لکھا پڑھی کرنا چاہیں، تم اُن سے لکھا پڑھی کر لو اگر اُن میں بھلائی پاؤ۔ اور انہیں اپنے اُس مال میں سے مدد بھی دو جو خدا نے تمھیں دیا ہے۔

اِس آیت میں خدا نے حکم دیا ہے کہ اگر آقا سمجھے کہ اُس کا غلام، کمانے

کی قدرت رکھتا ہے، اپنا وعدہ پورا کرسکتا ہے، اور یہ کہ آزاد زندگی اُس کے حق میں بہتر ہوگی، تو آقا کو چاہیے کہ اپنے غلام سے معاہدہ کرلے، صرف معاہدہ ہی نہیں بلکہ اُس کی مدد بھی کرے۔ مدد کی صورت یہ بھی ہے کہ اُسے اپنا کچھ مال ہبہ کردے۔ ایک یا کئی قسطیں معاف کردے۔ اپنی زکاۃ میں اُس کا حصہ لگا دے۔ زکاۃ کے ذریعہ مدد دینے کی ترغیب آقا کو بھی دی گئی ہے اور دوسرے لوگوں کو بھی۔

بعض علماء نے کہا ہے کہ آیت میں جو دو حکم دیے گئے ہیں، وہ واجب ہیں: یعنی غلاموں سے اِس قسم کا معاہدہ کرنا اور اُن کی مدد کرنا۔ لیکن اکثر علماء کے نزدیک پہلا حکم مستحب ہے اور دوسرا واجب۔ ابن جریج کہتے ہیں میں نے عطاء سے پوچھا کیا مجھ پر واجب ہے کہ اپنے غلام سے اِس طرح کا معاہدہ کروں اگرچہ اُس کے پاس روپیہ موجود بھی ہو؟ عطاء نے جواب دیا، میرے خیال میں یہ واجب ہے۔ عمرو بن دینار کہتے ہیں، اس پر میں نے عطاء سے پوچھا کیا یہ مسئلہ آپ نے کسی سے سنا ہے؟ اُنھوں نے کہا نہیں۔ پھر کہنے لگے کہ موسیٰ بن انس نے مجھ سے بیان کیا ہے کہ سیرین (والد محمد بن سیرین مشہور تابعی) نے حضرت انس سے درخواست کی کہ اُن سے یہ معاہدہ کرلیں، کیونکہ سیرین کے پاس بہت روپیہ تھا۔ انس نے ایسا کرنے سے انکار کیا۔ اِس پر سیرین حضرت عمر کے پاس گیے اور شکایت کی۔ حضرت عمر نے انس کو بلا کر کہا، اِس سے معاہدہ

کر لو۔ اُنہوں نے پھر انکار کیا۔ حضرت عمرؓ نے اُنہیں درّے سے مارا اور یہ آیت پڑھی "فکاتبوھم ان علمتم فیھم خیرا"، یہ سن کر انسؓ نے سیرین سے معاہدہ کر لیا۔

۴۔۔۔۔ اگر غلام، دارالکفر سے بھاگ کر دارالاسلام میں آجائیں تو آزاد ہو جائیں گے۔ اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ اُنہیں آزاد تسلیم کرے۔ اس کا ثبوت کتب سنت میں معلوم و مشہور ہے۔

۵۔۔۔۔ اگر ایک غلام میں کئی آقا شریک ہیں، تو اگر ایک بھی اُسے اپنی غلامی سے آزاد کر دے گا تو وہ بالکل آزاد ہو جائیگا بشرطیکہ اُس کے پاس مال موجود ہو اور باقی شریکوں کو اپنی قیمت ادا کر سکے۔ اس بارے میں کئی حدیثیں موجود ہیں۔ ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اگر کسی نے غلام میں اپنا حصہ چھوڑ دیا ہے تو غلام آزاد ہے اگر مال رکھتا ہے، ورنہ اُس کی قیمت کا اندازہ کیا جائے، اور اُس پر زیادتی کیے بغیر قیمت اُس کی کمائی سے وصول کر لی جائے"، حضرت ابن عمرؓ کی حدیث مرفوع میں ہے "جس نے غلام کو اپنی شرکت سے آزاد کر دیا ہے تو وہ اپنی باقی قیمت دوسرے شریکوں کو انصاف سے ادا کر کے آزاد ہو جائے گا"

۶۔۔۔۔ جو کوئی اپنے غلام کو تکلیف میں ڈالے، یا اُس کی صورت بگاڑے، یا اُسے خصی کر دے، تو وہ غلام آزاد ہو جائے گا۔ چنانچہ امام احمد نے

روایت کیا ہے کہ زنباع ابو روح نے اپنے ایک غلام کو اپنی ایک لونڈی کے پاس دیکھ لیا اور غصہ میں آکر اُس کی ناک کاٹ ڈالی اور اُسے ہیجڑا بنا دیا۔ غلام نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جاکر شکایت کی۔ اُس کے مالک سے آپ نے باز پرس کی۔ اُس نے اپنے فعل کا اقرار کر لیا۔ آپ نے غلام سے فرمایا "جا، تو آزاد ہے"۔ اِس حدیث سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ ہیجڑا بنانا، اسلام میں ناجائز ہے اور غلام کی آزادی کا موجب۔ حاکم کا فرض ہے کہ اِس حکم کو جاری کرے۔ بنا بریں غلاموں کو خواجہ سرا بنانے کا جو رواج تھا، وہ اسلامی شریعت کے بالکل خلاف تھا، اور یہ کہ اُن کے ساتھ یہ حرکت ہوتے ہی وہ شرعاً آزاد ہو جاتے ہیں۔

امام احمد نے ایک اور حدیث روایت کی ہے جسے ابو داؤد اور ابن ماجہ نے بھی لیا ہے۔ اِس حدیث میں ہے کہ ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر چلّانے لگا۔ آپ نے پوچھا "تجھے کیا ہوا؟" اُس نے عرض کیا، مجھے میرے آقا نے دیکھا کہ اُس کی ایک لونڈی کا بوسہ لے رہا ہوں۔ اِس پر اُس نے مجھے خصی کر ڈالا ہے! نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ اُسے بلایا جائے، مگر وہ بھاگ گیا۔ تب آپ نے غلام سے فرمایا "جا، تو آزاد ہے"۔ جامع اصول میں سمرہ بن جندب اور ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جو شخص اپنے غلام کی شکل بگاڑے تو اُس کا غلام آزاد ...

ـــــــــ صورت بگاڑنا نہ سہی، دوسری سخت تکلیف بھی غلام کو دینا حرام ہے اور اس گناہ کا کفّارہ اِس کے سوا کچھ نہیں کہ اُسے آزاد کر دیا جائے۔

چنانچہ امام احمد، مسلم، اور ابو داؤد نے عبداللہؓ بن عمرؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جس کسی نے اپنے غلام کو مارا یا طمانچہ لگایا تو اس کا کفّارہ یہ ہے کہ اُسے آزاد کر دے"

بخاری و مسلم اور ترمذی نے سوید بن مقرن سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہمارے خاندان کے پاس صرف ایک ہی کنیز تھی۔ ہم میں سے ایک شخص نے اُسے طمانچہ مار دیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو فرمایا "اسے آزاد کر دو" ہم لوگوں نے عرض کیا، ہمارے پاس صرف یہی ایک کنیز ہے۔ اس پر آپ نے ہمیں اجازت دی کہ جب تک ضرورت رہے اُس سے کام لیں، جب ضرورت نہ رہے تو اُسے جانے دیں۔

مسلم وغیرہ نے ابو مسعود البدری سے روایت کیا ہے کہ میں اپنے ایک غلام کو کوڑے مار رہا تھا۔ دفعتاً پیچھے سے آواز آئی "ابو مسعود سمجھ لے" غصہ کی وجہ سے میں آواز پہچان نہ سکا۔ جب آواز قریب سے آئی تو کیا دیکھتا ہوں کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور فرما رہے ہیں "اے ابو مسعود، سمجھ لے، اے ابو مسعود، سمجھ لے" آپ کو دیکھ کر میرے ہاتھ سے کوڑا گر گیا

آپ نے فرمایا "ابومسعود سمجھ لے کہ جتنی قدرت تجھے اِس غلام پر حاصل ہے، خدا کو اُس سے زیادہ قدرت تجھ پر حاصل ہے!" میں نے عرض کیا، یا رسول اللہ خدا کے نام پر یہ آزاد ہے۔ فرمایا "اگر تو ایسا نہ کرتا تو تجھے دوزخ کی آگ میں جلنا پڑتا!"

۸ ــــ "تدبیر" سے غلام کی آزادی لازمی ہوجاتی ہے، اور اصطلاحِ شرع میں "تدبیر" یہ ہے کہ آقا اپنے غلام سے کہے میرے مرنے کے بعد تو آزاد ہے۔ اگر آقا نے ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں جن سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی تو ایسی حالت میں بھی بعض علماء نے کہا ہے کہ وہ آزاد ہوجائیگا، کیونکہ شریعت کا بنیادی مقصد یہی ہے کہ غلام آزادی پائیں، بعض علماء نے وصیت کے پہلو کو ترجیح دی ہے۔

"تدبیر" کے احکام میں یہ بھی ہے کہ جوں ہی کسی نے اپنے غلام سے کہا کہ میرے بعد تو آزاد ہے، تو یہ بات لازمی ہوجاتی ہے اور اس سے رجوع جائز نہیں رہتا جس طرح وصیت سے رجوع جائز ہوتا ہے، اور یہ کہ جب آقا نے اپنے غلام سے یہ کہہ دیا ہے تو امام ابوحنیفہ اور امام مالک کے نزدیک اب اُس آقا کے لیے جائز نہیں کہ اپنے اِس غلام کو فروخت کرے۔ اور یہ کہ اگر کوئی شخص غلام کا پورا مالک ہے اور اُس سے کہہ دے کہ میرے بعد تیرا کچھ حصہ آزاد ہے تو وہ پورے کا پورا آزاد ہوجائے گا۔ جمہور علماء کا قول ہے

کہ جس کنیز سے اِس قسم سے بات کہہ دی گئی ہے تو اُس کی تمام اولاد بھی اُس کے ساتھ آزاد ہو جائے گی۔

۹۔ جس کنیز کو اپنے آقا سے اولاد ہو جائے، تو وہ کنیز اُس کی یعنی آقا کی موت کے بعد آزاد ہو جائے گی۔ آقا کے رشتہ دار، اس کنیز کے وارث نہیں ہو سکتے، اور یہ کہ جمہور علما، سلف وخلف کے نزدیک خود آقا بھی اپنی زندگی میں کنیز کو فروخت نہیں کر سکتا۔ ان علماء میں پیش پیش حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما ہیں۔

امام مالک نے حضرت عمر کی یہ حدیث روایت کی ہے کہ "جب کنیز اپنے آقا کی اولاد کی ماں بن جائے تو آقا اُسے نہ بیچ سکتا ہے، نہ ہبہ کر سکتا ہے، نہ اُس کے رشتہ دار اُس کے وارث بن سکتے ہیں۔ زندگی بھر وہ آقا کے پاس رہے گی اور اُس کی موت کے بعد آزاد ہو جائے گی"، یہ اس لیے کہ اگر ایسی کنیزیں بھی وارثوں میں تقسیم ہوں تو خود اپنی اولاد کے حصہ میں آئیں گی اور معلوم ہے کہ یہ بات شریعت کے مقاصد واصول وآداب کے خلاف ہے۔

۱۰۔ اگر کسی شخص کی غلامی میں اُس کا کوئی رشتہ دار آجائے تو خود بخود آزاد ہو جائے گا۔ اس بارے میں سب سے زیادہ عام حدیث، سمرہ بن جندب کی مرفوع حدیث ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جو شخص اپنے کسی قریبی رشتہ دار کا مالک بن جائے تو وہ رشتہ دار آزاد ہے"، یہ

حدیث امام احمد نے اور نسائی و حاکم کے سوا اصحاب سنن نے روایت کی اور اس کی تصحیح کی ہے۔ یہ بھی اُسی معنیٰ میں ہے جس کا ذکر آقا کی اولاد کی ماؤں کے بارے میں ہو چکا ہے۔

غلاموں کے آزاد کرنے کا ایک ذریعہ، کفّارہ ہے

کفّارہ سے مقصود وہ عمل ہے جو گناہوں کو دور کر دیتا ہے۔ اِس قسم کا سب سے بڑا عمل، غلاموں کا آزاد کرنا ہے، اور اِس کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ جو شخص، غلام رکھتا ہے، اُس کے لیے واجب ہے کہ اگر غلطی سے کسی آدمی کو مار ڈالے، یا اپنی بیوی کو اپنی ماں کہہ دے، یا معلوم شرطوں کے ساتھ جان بوجھ کر اپنا روزہ خراب کر ڈالے، تو ایسے آدمی کا کفّارہ یہ ہے کہ غلام آزاد کرے۔

۲۔ واجب اختیاری۔ یہ قسم توڑ ڈالنے کا کفّارہ ہے۔ اِس کفّارے میں آدمی کو اختیار ہوتا ہے کہ دس مسکینوں کو کھانا کھلائے، یا کپڑا پہنا دے، یا غلام آزاد کرے، جیسا کہ خدا نے اپنی کتاب میں فرما دیا ہے۔ اِس اختیار دینے کی حکمت ظاہر ہے۔

۳۔ مستحب، اور یہ غیر معیّن گناہوں کا کفّارہ ہے اور اُنہیں سب سے زیادہ دور کر دینے والا۔

غلام آزاد کرنیکے وسائل

قرآن میں صاف طور پر فرما دیا گیا ہے کہ زکاۃ کا ایک مصرف یہ بھی ہے کہ غلاموں کے کام آئے۔ اس میں اُن کی آزادی بھی داخل ہے اور اپنی آزادی خریدنے میں اُن کی مدد بھی۔ معلوم ہے کہ مسلمانوں کی زکاۃ کروڑوں روپیہ تک پہنچ سکتی ہے، لہذا اگر صرف زکاۃ ہی میں اسلامی احکام نافذ کیے جائیں تو دار الاسلام کے تمام غلام آزاد ہو سکتے ہیں۔

رضاء الہی کیلیے غلام آزاد کرنا

کتاب و سنت میں غلاموں کو آزاد کرنے کی اس قدر ترغیبیں دی گئی ہیں کہ اگر جمع کی جائیں تو ضخیم کتاب بن جائے۔ اس کام کا ایک سب سے بڑی عبادت اور ایک بنیادی نیکی ہونا سورۂ بقرہ کی اس آیت کریمہ سے بھی ثابت ہے:

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَ اٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ

پورب اور پچھم کی طرف تمھارا منھ کر لینا نیکی نہیں ہے۔ نیکی یہ ہے کہ آدمی، اللہ پر، روز آخرت پر، فرشتوں پر، آسمانی کتاب پر، پیغمبروں پر ایمان لائے۔ اللہ کی محبت میں رشتہ داروں یتیموں، مسکینوں، مسافروں، سائلوں، اور غلام آزاد کرنے پر مال خرچ کرے۔ نماز قائم

وَالسَّائِلِیْنَ وَفِی الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَاٰتَی الزَّکٰوۃَ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ، اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ (۲: ۱۷۷)

کرے۔ زکاۃ ادا کرے۔ اور وہ لوگ جو عہد کرکے اپنا عہد پورا کرتے ہیں، اور تکلیف، مصیبت، اور جنگ میں ثابت قدم رہتے ہیں۔ یہی لوگ سچے ہیں اور یہی لوگ پرہیزگار۔

اِس بارے میں ایک مشہور حدیث یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جو آدمی کسی مسلمان[1] غلام کو آزاد کرتا ہے، تو خدا، غلام کے ہر عضو کے بدلے اُس آدمی کا ہر عضو، دوزخ کی آگ سے آزاد کر دے گا،، (متفق علیہ حدیث ابو ہریرہ) حضرت ابوذر کی حدیث ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا، سب سے افضل عمل کیا ہے؟ فرمایا "اللہ پر ایمان لانا اور اُس کی راہ میں جہاد کرنا،، پھر میں نے پوچھا، سب سے افضل کس غلام کا آزاد کرنا ہے؟ فرمایا "جو سب سے زیادہ قیمتی اور اپنے مالک کو سب سے

---

(۱) تمام علماء متفق ہیں کہ کافر غلام کو بھی آزاد کرنا مشروع اور موجب ثواب ہے۔ البتہ اس بارے میں اختلاف ہے کہ کفّارہ میں اُس کا آزاد کرنا کیسا ہے۔

زیادہ پسند ہو۔،،

حضرت ابوموسیٰ اشعری کی حدیث ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جس کے پاس کنیز ہو اور وہ اُسے خوب اچھی تربیت دے، اور خوب اچھی تعلیم سے آراستہ کرے، پھر اُسے آزاد کرکے اُس سے شادی کرلے، تو اُسے دہرا ثواب ملے گا،، بخاری میں ہے کہ حضرت ابوہریرہ نے جب یہ حدیث روایت کی کہ "صالح غلام کے لیے دو ثواب ہیں،، تو کہنے لگے، قسم اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اگر جہاد، حج، اور اپنی ماں سے نیک برتاؤ کا خیال نہ ہوتا، تو میں غلام بن کر مرنا پسند کرتا!

غلاموں کے بارے میں وصیت

یہ بھی یاد رہے کہ اللہ اور اُس کے رسول نے غلاموں کے بارے میں کیا کیا وصیتیں فرمائی ہیں۔ چنانچہ غلاموں پر واجبات کم رکھے ہیں۔ تعزیرات میں اُن کی سزا بھی آزادوں سے آدھی رکھی ہے، اور اللہ تعالیٰ نے والدین سے نیک برتاؤ کے ساتھ غلاموں کا بھی ذکر کیا ہے۔ اسی سے اُن کے معاملے کی اہمیت ظاہر ہے۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے منع کیا ہے کہ غلاموں کو "غلام یا کنیز،، کہہ کر پکارا جائے، بلکہ فرمایا تم یوں کہو "میرا بچہ"، میری بچی"،، اور حکم دیا ہے کہ خود آقا جو کھاتا ہے وہی اُنہیں کھلائے، جو خود پہنتا ہے، وہی اُنہیں پہنائے، اور اگر کام محنت کا ہو

تو اُن کی مدد بھی کرے"، جیسا کہ صحیحین وغیرہما میں حدیث ابو ذرؓ میں
صاف وارد ہوا ہے۔ اسی قدر نہیں بلکہ مرض الموت میں بھی آپ عورتوں
اور غلاموں کے بارے میں برابر وصیت فرماتے رہے یہاں تک کہ روح
پاک، رفیق اعلیٰ میں پہنچ گئی صلی اللہ علیہ وسلم۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے
آپ سے عرض کیا، خادم کو کتنی مرتبہ معاف کردوں؟ فرمایا "روزانہ ستر مرتبہ"
ستر دفعہ سے مقصود یہ ہے کہ جب جب غلطی کرے، معاف کردو۔

یہی سبب ہے کہ صدر اول کے مسلمان اپنے غلاموں کی انتہا
خاطر کرتے اور اُن سے غایت درجہ بردباری سے پیش آتے تھے،
جس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ غلام کام میں کوتاہی کرنے لگے تھے، مگر ہمیشہ انہیں
معاف کردیا جاتا تھا۔ قسم ہے حق کی کہ اُس زمانے کے اسلام کی نظر میں غلام
اُن تمام "آزادوں" سے کہیں زیادہ خوش و خرم اور ترقی پر رہے۔ کہتے ہیں
اس زمانے میں یورپین سلطنتوں کی نگاہ میں آزادی [illegible]
ہیں اخوۃ ولایات متحدہ امریکا کی حکومت [illegible]
کے لیے اُس نے سفید فاموں سے الگ قانون بنا رکھے ہیں اور [illegible]
نہایت ہی خراب برتاؤ کرتی ہے، حتیٰ کہ اگر کوئی سرخ فام آدمی، کسی سفید
فام عورت پر دست درازی کر بیٹھتا ہے تو حکومت نہ سہی، سفید فام
باشندوں کے ہاتھوں بدترین طریقہ پر قتل کر ڈالا جاتا ہے، لیکن اگر

یہی حرکت سفید فام آدمی کسی سرخ فام عورت سے کرتا ہے تو اُس سے کوئی باز پرس نہیں کی جاتی۔

(خلاصۂ بحث)

ہم نے وحی و نبوت پر، اپنے ہاں اور عیسائیوں کے ہاں پیغمبروں کے معجزوں پر جو گفتگو کی ہے، اُسے بغور پڑھو۔ نیز دل سے پھوٹنے والی وحی کے شبہہ اور قرآن کے لغوی و علمی اعجاز پر جو کچھ لکھا ہے، اُسے دیکھو، پھر قرآن کے یہ دسوں مذکورۂ بالا مقاصد سامنے رکھو جن سے اُس نے اصلاح اور نوع انسان کی تکمیل کی ہے، روحانی، اخلاقی، ادبی، اجتماعی، مالی، سیاسی ہر لحاظ سے بہتری چاہی ہے، یعنی اُس نے وہ سب کچھ بتا دیا ہے جس کی اس زمانہ میں قوموں اور سلطنتوں کو ہر زمانہ سے زیادہ ضرورت ہے، اور پھر یہ سب کچھ اسلام نے ایسے اصول و قواعد کے ساتھ بتایا ہے جو سب سے زیادہ صحیح، سب سے زیادہ مکمل، اور عام مصالح کے سب سے زیادہ کفیل ہیں، جن سے تمام پرانے اور نئے آنے والے فساد دور کیے جا سکتے ہیں، جو ہر زمانہ کے انبیاء کی تعلیمات سے، حکماء کے فلسفہ سے، بادشاہوں اور حکمرانوں کے قوانین سے افضل و اعلیٰ ہیں، حالانکہ قطعی طور پر معلوم ہو چکا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اَن پڑھ تھے۔ مزاج کے

خلوت پسند تھے۔ نہ کبھی اُنہوں نے پیغمبروں کی کتابیں پڑھیں نہ علم و قوانین کے دفاتر دیکھے۔ کسی علم کی جستجو نہیں کی۔ کسی علمی مسئلہ پر گفتگو نہیں کی۔ نیز یہ بھی معلوم ہے کہ وہ قرآن کو اُس وقت لے کر آئے جب اُن کی عمر پورے چالیس برس کی ہوچکی تھی ——— وہ عمر جس میں آدمیوں کی نفسی اور عقلی قابلیت ایسی نہیں ہوتی کہ کوئی ایسی بالکل نئی بات اپنے دل سے پیدا کرسکیں جس سے اُن کا سابقہ شروع عمر میں یا جوانی میں نہ ہوچکا ہو ——— ہاں ان سب باتوں کو از سرِ نو دیکھو، اور ایک ایک بات پر خوب غور کرو۔ جب تم بے لاگ ہوکر ایسا کرو گے تو اپنی عقل کو یہ یقین کرنے پر مجبور پاؤ گے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ لائے ہیں، انسانوں کی قابلیت سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے چاہے ان پڑھ ہوں یا پڑھے لکھے اور یہ کہ یہ سب اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے وحی ہے۔

اگر فرض کر لیا جائے کہ اِس قسم کی بعض باتیں آپ نے اپنی قوم کے دانشمندوں یا اُن لوگوں سے سُن لی تھیں جو آپ کو اپنے ایک دو سفروں میں ملے ہونگے، بلکہ یہ بھی فرض کر لیا جائے کہ خود آپ نے اپنی فطری ذہانت سے معلوم کر لیا تھا کہ انسانوں کو ایسی اصلاحوں کی ضرورت ہے، لیکن یہ سب فرض کر لینے کے بعد بھی کیا عقل تصوّر

کرسکتی ہے کہ اس طرح کی اُڑتی ہوئی باتوں سے یا ایسے اُچٹتے ہوئے خیالات سے دنیا کی تمام قوموں کی جملہ ضرورتوں کی اِتنی کامل و مکمّل تحقیق تک پہنچا جا سکتا ہے؟ اور یہ کہ یہ تمام اعلیٰ حقائق بچپن سے جوانی تک اور جوانی سے حُبِّ شہرت کی عمر تک برابر پردۂ راز میں رہیں، اور صرف ادھیڑ عمر میں اِس بے نظیر بیان کے ساتھ، دلوں کو موہ لینے والی بلاغت کے ساتھ، عقلوں پر چھا جانے والی حجت و برہان کے ساتھ ظاہر ہوں، اور عرب قوم میں ایسا زبردست انقلاب پیدا کردیں جو اُن کی طبیعتوں کی کایا پلٹ دینے والا، اُن کے تمام طریقوں کو بدل ڈالنے والا ثابت ہو، اُنھیں تمام متمدن قوموں کا آقا بنادے، اور اِس کے بعد دنیا پر وہ عظیم تبدیلی طاری کردے جس کا حال تاریخ بیان کرچکی ہے؟ کیا اس سے بھی زیادہ عجیب کوئی بات ہوسکتی ہے کہ اب اِس زمانہ میں یہ واقعہ معلوم ہو کہ علم اور حیرت انگیز تہذیب کی مالک موجودہ قومیں، پچھلی قوموں سے زیادہ اِس اصلاح و ہدایت کی محتاج ہیں؟ نہیں، ہرگز نہیں۔ اِس قسم کی بات نہ کبھی انسانوں میں دیکھی گئی ہے نہ سنی گئی ہے۔

اور اب جب کہ یہ حقیقت ثابت ہوچکی ہے تو جس انسان تک یہ دعوت پہنچے، اُس کا فرض ہے کہ اسے قبول کرلے اور اپنی انسانیت

مکمّل کرنے اور دنیا و آخرت کی شاد کامیاں حاصل کرنے کے لیے اُس کی پیروی کرے۔ اگر اس کے خلاف کوئی شبہہ پیدا ہو تو اُس کی جانچ کرے یا اُسے مُسترد کر دے۔ یہ اس لیے کہ کوئی عقلمند بھی جو علم طب کے نفع سے واقف ہو چکا ہے، کسی طبّی مسئلے میں اپنے شک یا کسی طبیب کے ناکام علاج کی وجہ سے اپنی تندرستی برقرار رکھنے اور اپنی بیماری دور کرنے کے لیے طب سے استفادہ چھوڑ نہیں سکتا، لیکن اسلام تو طب سے بھی زیادہ عجیب معجزہ ہے، اور ہر شخص کو تسلیم کر لینا چاہیے کہ وہ اللہ عزّ وجل ہی کی طرف سے وحی کیا ہوا علم ہے۔

قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ، فَلَوْ شَاۗءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ (۱۴۹:۶)

میں راضی ہوں کہ اللہ میرا رب ہے، اسلام میرا دین ہے، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم میرے لیے نبی اور رسول ہیں!

اور گواہی دیتا ہوں کہ ایک اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اور گواہی دیتا ہوں کہ محمد، اللہ کے رسول ہیں۔ خاتم النبیین ہیں — رحمۃٌ للعالمین ہیں۔ سلامتی ہو تمام رسولوں پر، اور ستائش ہو اللہ رب العالمین کے لیے۔

خاتمۂ کتاب

عام بدبختی سے نکلنے کے لیے مہذّب قوموں کو دعوتِ اسلام جو امن وانسانیت کا دین ہے

وحیِ محمدی کے مقدمات ومقاصد کی بنا پر چند تمہیدیں:

۱۔ پچھلے پیغمبروں کی زبانی دین اللہ

پچھلے صفحات سے معلوم ہو چکا ہے کہ تمام قوموں میں ایسے افراد گزر چکے ہیں جو اُن کے خالق وپروردگار کی طرف سے خبریں اور پیغام لائے تھے۔ یہ پیغام اِس لیے آئے تھے کہ فطرت انسانی کی تکمیل کا بندوبست ایک ایسی ہدایت سے کیا جائے جو معرفت الٰہی میں انسان کی اپنی عقل کی پہنچ سے اعلیٰ واکمل ہے، جو انسان کو بتا دے کہ اُس ذات واحد کی کس طرح عبادت کرنی چاہیے، کس طرح شکر ادا کرنا چاہیے، اور یہ کہ آپس میں ایک دوسرے کے حقوق وفرائض کیا ہیں، گناہ اور برائیاں ہونے کی وجہ سے کون کون باتیں حرام ہیں، اور یہ سب اس لیے کہ نفس پاک ہو جائیں۔ حالت سنور جائے۔ روحیں بلند ہو جائیں تاکہ بقاءِ الٰہی کے قابل، اُس کے کمالِ معرفت کی اہل، اور آخرت میں اُس کے حُسنِ ثواب کی مستحق بن سکیں۔ یہی پیغام، دین الٰہی ہے۔

نیز یہ بھی اِس کتاب سے معلوم ہو چکا ہے کہ وہ تمام دینِ حق کی بنیاد، ایمان باللہ، روزِ قیامت، اور عملِ صالح پر ہے، انہی پیغمبروں کے لائے ہوئے ہیں جنہیں خدا نے اپنی وحی کے ساتھ بھیجا تھا، عام اِس سے کہ اُن کی قوموں کی بول چال میں اُن کا نام، پیغمبر ہو یا نہ ہو۔ لیکن یہ تمام دین خاص تھے نہ کہ عام۔ عارضی تھے نہ کہ دائمی۔ پھر عالمگیر اسلام کے آنے سے اور اُس پر تمام دینوں کے ختم ہو جانے سے پہلے اُن میں تغیر و تبدّل ہو چکا تھا۔ بدعتیں داخل ہو گئی تھیں۔ بہت سی تعلیمات گم ہو چکی تھیں۔

تاریخ سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ انسانی قوموں کی جو کچھ بھی حالت درست ہوئی ہے، صرف اِنہی پیغمبروں کی لائی ہوئی ہدایت کی پیروی سے ہی درست ہوئی ہے۔ اور یہ کہ جتنے حکیم، معلّمِ اخلاق، مقنّن، اور عام نظام بنانے والے گزرے ہیں، اُن کی باتوں کا دلوں پر وہ اثر نہیں ہوا جو پیغمبروں کی اصلاح کا ہوا ہے۔ بلکہ اِن آخر الذکر رہبروں میں اکثر ایسے تھے جو خود ہدایت یاب نہ تھے۔ نیکی کی طرف بلاتے تھے، مگر خود نیکی سے دور تھے۔ اِنہی میں ایک وہ یوربین بھی ہے جس نے نیچرل دین قائم کیا ہے، مگر خود اُس کی اپنی یہ حالت تھی کہ باتیں تو اچھی تھیں اور اخلاق بُرے تھے۔ اُس کا دین دیکھنے میں بہت

خوبصورت ہے، اخلاق و قانون کی کتابوں سے ماخوذ ہے، مگر سراسر مادّی ہے اور اپنے اندر کوئی روح نہیں رکھتا، اسی لیے اُسے پسند کرنے والوں میں سے بھی کسی نے اُس کی پیروی نہیں کی۔ علم و فلسفہ میں ترقی کر جانے والی قومیں، جن میں خود اس شخص کی قوم بھی شامل ہے، ہنوز، پیغمبروں ہی کی وحی کی سخت محتاج ہیں۔ ان کے اکثر افراد، اس وحی پر ایمان بھی رکھتے ہیں، حالانکہ اُن کی مقدس کتابوں کا سلسلۂ اسانید منقطع اور اُن کی اصلیں گم ہو چکی ہیں۔ اُن کے ترجموں میں بہت کچھ کمی بیشی اور غلطی واقع ہو گئی ہے۔ پھر وہ خاص خاص قوموں اور خاص وقتوں کے لیے تھیں۔ دائمی اور عالمگیر نہ تھیں۔ مزید برآں ان کتابوں کی تعلیمات پر علماء و حکماء بہت سے وزنی اعتراض اور تردیدیں کر چکے ہیں، برخلاف دینِ اسلام کے جو ان تمام کمزوریوں سے [illegible] ہے۔ [illegible]

علماء تاریخ جانتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی نبی کی تاریخ صحیح طور پر اور تواتر کے ساتھ ہم تک نہیں پہنچی۔ اور یہ کہ اُن میں سے کسی کی کتاب بھی پورے طور پر اس طرح محفوظ نہیں رکھی گئی ہے کہ اُس کے تمام الفاظ و حروف، اُس کی تلاوت و القاء کا طریقہ، یہ سب آج تک محفوظ رہا ہو، بجز اس ایک قرآن کے جسے اللہ تعالیٰ

نے اپنے پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کیا ہے۔ پھر ان پیغمبروں میں سے کسی کی قوم نے بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم اور پیروؤں کی طرح اُن کے حالات کی جانچ، اُن کی سیرت، واقعات، اور سنتوں کو حفظ کیا ہو، اُن پر عمل کیا ہو، اُنہیں کتابوں میں مدوّن کیا ہو۔ اسی قدر نہیں بلکہ اُن کے راویوں کی پوری پوری جانچ کی ہو۔ صحیح کو غیر صحیح سے الگ کردیا ہو۔ پھر غیر صحیح کو بھی مختلف درجوں، مثلاً حسَن، شاذ، منکر، موضوع پر تقسیم کیا ہو۔ اس بارے میں بڑی بڑی کتابیں اور فرہنگیں لکھی ہوں۔

حدیث کے حافظوں اور راویوں کی جرح و تعدیل کے اماموں کی صداقت و امانت کا یہ حال تھا کہ اپنے اس فن کی خدمت کو بذاتِ خود عبادت سمجھتے تھے۔ حدیث کے نام سے اُن کے پاس جو کچھ بھی پہنچا اُسے روایت کر جاتے۔ عام اس سے کہ اس کا مضمون اُن کے ذاتی عقائد کے موافق ہو یا مخالف۔ عام اس سے کہ وہ حدیث رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی دشمن ہی کی بنائی ہوئی کیوں نہ ہو۔ وہ اپنا فرض سمجھتے تھے کہ ہر روایت کو نقل کردیں، پھر اپنے اصول کے مطابق اُس کی اسناد کی تصحیح کردیں۔ اگرچہ خود نصوص قرآن کے، اصول مقررہ کے، یا ثابت احکام کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ وہ روایت کو ایک مستقل فن تصوّر کرتے

تھے۔ جو روایت بھی اُنہیں پہنچتی، محفوظ کر دیتے۔ اور اُس کی تنقید و ترجیح کا معاملہ، درایت رکھنے والے فقہاء وغیرہم کے سپرد کر دیتے۔ یہ لوگ روایتِ حدیث میں اِس قدر بے لاگ تھے کہ اُنہوں نے بدعتی مذہبوں اور فرقوں کے داعیوں، نیز سیاسی پارٹیوں کا پروپیگنڈا کرنے والوں کو روایتِ حدیث میں غیر معتبر قرار دے دیا ہے، کیونکہ اِس قسم کے لوگ اپنے مذہب یا پارٹی کو اصل قرار دیتے تھے اور اُس کی تائید کے لیے روایتیں اور حدیثیں تلاش کرتے تھے۔ اگر کوئی روایت خود اُن کے اپنے خلاف پڑتی تھی تو اُس کی تاویل کرتے یا جدل کی راہ سے اُس کی تردید کر دیتے تھے۔ لیکن محدثین یہ حرکت جائز نہیں رکھتے تھے۔ مثلاً حفاظِ حدیث وعلماءِ جرح و تعدیل کے امام اکبر، امام احمد بن حنبل کو دیکھو۔ اِن کا کوئی خاص مذہب نہ تھا کہ جسے ثابت کرنے کے لیے حدیثیں تلاش کرتے بلکہ حالت یہ تھی کہ ایک بات کہتے تھے، پھر اُس کے خلاف کوئی حدیث صحیح ثابت ہو جاتی، تو اپنے قول سے رجوع کر لیتے اور حدیث کی پیروی شروع کر دیتے تھے۔ اِسی قدر نہیں بلکہ اگر کوئی بات محض اپنے اجتہاد درائے سے فرماتے اور اُس کے خلاف کوئی ایسی حدیث مل جاتی جو پورے طور پر صحیح ثابت نہ ہوتی، تو بھی اپنی رائے و اجتہاد پر اُس ضعیف حدیث کو ترجیح دے دیتے تھے، اِسی لیے امام ابوجعفر طبری نے کہا ہے کہ امام احمد،

محدّث تھے۔ فقیہ نہ تھے۔ یعنی اُن کا مذہب، حدیث پر تھا نہ کہ اجتہادی قواعد پر کہ جنہیں ثابت کرنے کے لیے حدیثیں توڑتے مروڑتے ہوں۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ فقہ کے عالم نہ تھے۔

اِس سے ثابت ہوا کہ محمدؐ کی تاریخ، محمدؐ کا لایا ہوا قرآن، محمدؐ کی سنت، محمدؐ کی اپنی دعوت و تشریع میں روش —— یہ سب چیزیں صحیح و متواتر روایت کے ساتھ اِس وقت تک چلی آئی ہیں، اور یہ کہ آپ سے جو اصول متواتر روایت ہوئے ہیں، قطعی ہیں، اور جن کی روایت و دلالت غیر قطعی ہے اُن میں اجتہاد کی گنجائش ہے اور اُن پر اسلام کی صحت کا دارومدار نہیں ہے۔ ظاہر ہے کسی اور نبی کی تاریخ، دین، کتاب، بلکہ کسی حکیم اور بادشاہ کے بھی حالات اتنی تدقیق و صحت کے ساتھ روایت نہیں ہوئے ہیں۔

۳۔ موجودہ زمانہ میں دین کی ضرورت

موجودہ زمانہ کی متمدّن قوموں کو ایک عام دینی ہدایت کی اُس سے کہیں زیادہ ضرورت ہے جتنی بعثتِ محمدیؐ سے پہلے انسانوں کو تھی جب کہ مغرب میں روم کی دونوں سلطنتوں کا، مشرق قریب میں ایران کی عظیم الشان سلطنت کا، مشرق بعید میں چین کی سلطنت کا، اور اِن کے علاوہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں کا فساد بہت بڑھ گیا تھا۔

ہر طرف فسق و فجور عام ہو گیا تھا۔ سرکشی اور خونریزی کا دَور دَورہ ہو گیا تھا۔
لیکن اِس زمانہ میں جنگ کی ہولناکیاں پچھلے زمانوں سے کہیں زیادہ سخت ہو گئی ہیں، کیونکہ اِس زمانہ میں علم و تہذیب کی نعمتوں کو سلطنتوں کی سرکشی نے مصیبتیں بنا دیا ہے، جیسا کہ خدا نے فرمایا:

وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِي الْاَرْضِ (۴۲ : ۲۷)	اگر خدا اپنے بندوں کے لیے رزق کشادہ کر دیتے تو زمین میں سرکشی شروع کر دیں۔

اِس زمانہ میں تمام دنیا باہم وابستہ ہو کر ایک شہر بن گئی ہے، لیکن اِس کے باوجود قوموں کی دشمنی بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ ایک دوسری کو برباد کرنے کی کوششوں میں لگی ہوئی ہے۔ علم نے اُنہیں موقع بخشا تھا کہ زمین کی دولتوں اور خزانوں سے فائدہ اٹھا کر خوش و خرم زندگی بسر کریں، مگر اِس کا نتیجہ الٹا نکلا۔ وہ اور بھی زیادہ بدبختی میں مبتلا ہو گئیں۔ جو قوم، علوم و فنون میں جتنی زیادہ ترقی یافتہ ہے، اُس کی بدبختی بھی اُتنی ہی زیادہ ہو گئی ہے۔

اِس صورتِ حال سے ثابت ہوا کہ انسانی علم، انسانوں کی اصلاح کے لیے ناکافی ہے، اِسی لیے موجودہ زمانہ میں علم و سیاست کے بہت سے علماء و ماہرین، دینِ الٰہی کی ضرورت محسوس کر رہے ہیں، اور بہتوں نے یہ آرزو ظاہر کی ہے کہ کاش کوئی نیا نبی پیدا ہوتا، لیکن خدا نے اپنی

اِس آخری وحی پر نبوت ختم کر دی ہے۔ اِس وحی میں وہ سب کچھ آگیا ہے جس کی نوعِ انسانی کو ضرورت ہو سکتی تھی، اور یہ اُس وقت تک باقی رہے گی جب تک آسمان و زمین باقی ہے۔ اِس بارے میں اہم حقائق میں اوپر بیان کر آیا ہوں۔ ذیل میں اُن کا خلاصہ پیش کرتا ہوں:

ثبوتِ وحیِ محمدی کے مقدمات

اِس موضوع کا خلاصہ میں چھ مقدمات میں پیش کرتا ہوں،

اِس کے بعد دعوتِ نبوت کا بیان ہو گا، پھر اُس کی دینی و شہری قانون سازی کے دس مقاصد کا بیان آئے گا۔ اِس کے بعد مقصود بالذات نتیجہ ظاہر کروں گا اور وہ اسلام کی طرف عام دعوت ہے:

۱۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نشو و نما، فقر، اور اُمیّت

تواتر و یقین کے ساتھ معلوم ہو چکا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی یتیمی سے شروع ہوئی تھی۔ آپ نے بالکل اَن پڑھ لوگوں میں نشو و نما پائی تھی۔ نہ کبھی کوئی کتاب پڑھی تھی۔ نہ کوئی سطر لکھی تھی۔ نہ کسی نے آپ کو کسی علم کی تعلیم دی تھی۔ آپ نے بدوی علاقہ میں قبیلۂ بنی سعد کے اندر اپنا بچپن گزارا، جہاں اپنے دودھ شریک بھائیوں کے

ساتھ بکریاں چراتے تھے۔ جب اپنے شہر (مکہ) میں واپس آئے تو یہاں بھی اُجرت لے کر لوگوں کی بکریاں چراتے تھے۔ پھر جوان ہوئے اور تجارت کرنے لگے ــــــــــ آپ کا جسم بہت تندرست تھا۔ خوبصورت تھے۔ قوی ہیکل تھے۔ اعلیٰ اخلاق رکھتے تھے۔ راست گو تھے۔ نہایت امین تھے۔ بہت مُروت رکھتے تھے۔ فیّاض تھے۔ رشتہ داری کا پاس کرتے تھے۔ خود دار تھے۔ نفس کی خواہشوں سے دور تھے۔ یہی وہ صفتیں تھیں جنہوں نے آپ کو خدیجہ بنت خُوَیلد کی نگاہ میں محبوب بنادیا تھا۔ خدیجہؓ، قریش کی سب سے افضل خاتون تھیں اور "طاہرہ" کے لقب سے پکاری جاتی تھیں۔ بیوہ تھیں۔ مالدار اور نیک نفس تھیں، مگر ادھیڑ ہو چکی تھیں۔ عمر چالیس برس کی تھی۔ اُنھوں نے آپ کو پیغام دیا کہ اُن سے شادی کریں۔ آپ نے یہ تجویز منظور کرلی، حالانکہ آپ کی عمر صرف پچیس برس کی تھی، یعنی وہ عمر جب کہ جسم مکمل ہوتا اور شباب اپنے عروج پر ہوتا ہے۔ آپ اُن کے ساتھ پچیس برس رہے۔ اُن کے سوا کوئی اور شادی نہیں کی یہاں تک کہ انتقال کر گئیں۔ اُنہی سے آپ کی اولاد ہوئی۔ اور وہی آپ کی سب سے زیادہ چہیتی بیوی تھیں حتیٰ کہ وفات کے بعد بھی۔

۲۔ خلوت پسندی، شہرت سے بیزاری، شعر وخطابت سے دوری

نیز تواتر و یقین سے معلوم ہو چکا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم، خلوت پسند تھے۔ اپنی قوم کے جوانوں، ادھیڑوں، اور بوڑھوں کی ہم نشینی پر گوشہ نشینی کو ترجیح دیتے تھے۔ نہ اُن کی بُت پرستانہ عبادتوں میں شریک ہوتے تھے، نہ لہو و لعب کی مجلسوں میں بیٹھتے تھے۔ نہ دارُالنَّدوہ میں جاتے تھے جہاں وہ اپنے سیاسی اور جنگی معاملات طے کیا کرتے تھے۔

آپ کو نہ شعر گوئی سے شوق تھا، نہ اشعار یاد کرنے اور سنانے سے۔ میلوں اور مجمعوں میں آپ نے کبھی تقریریں بھی نہیں کیں۔ کبھی کسی کے مقابلہ میں فخر و مباہات کے لیے کھڑے نہیں ہوئے۔ کبھی اپنے بزرگوں کی تعریفیں بیان نہیں کیں۔ غرضکہ آپ اپنی قوم کے نہ عالموں میں سے تھے نہ فصیح و بلیغ مقرّروں میں سے۔ اُس زمانہ میں وہاں علم وحکمت و فصاحت کی نمائش کا ذریعہ صرف شعر، خطابت، اور فخر و مباہات کی باتیں ہی تھیں۔ اِسی قدر نہیں، آپ کو اپنی قوم میں سرداری حاصل کرنے کی بھی خواہش نہ تھی۔ معلوم ہے کہ جو آدمی سرداری اور بڑائی کا دلدادہ ہوتا ہے، اُس کی طبیعت ہرگز گوارا نہیں کر سکتی کہ بھرپور جوانی اور عنفوان شباب میں گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کرے۔

اگر اِس قسم کی کوئی بات آپ سے کبھی سرزد ہوتی تو آپ کے

پیرو اُسے ضرور نقل کرتے، کیونکہ آپ سے متعلق ہر بات کی روایت کا اُنہیں حد درجہ اہتمام تھا اگرچہ اُن کے خیال میں صحیح نہ بھی ہو۔ پھر محدثوں کی جماعت پیدا ہوئی۔ انہوں نے ہر قسم کی روایتیں کتابوں میں جمع کر دیں، عام اِس سے کہ اُن کی اسناد، متصل ہو یا منقطع، صحیح ہو یا غلط اُنہوں نے سب کچھ مدوّن کر کے علماء نقد کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ اِن میں سے بہتوں نے آپ کی پیدائش وغیرہ سے متعلق عجائبات کا انکار کیا اور اُن کی تردید کی ہے۔ یہی وہ عجائبات ہیں جنہیں حدیث سے بے خبر عوام و خواص آج تک لیے بیٹھے ہیں اور اُنہیں معجزے اور نبوت کی دلیلیں سمجھتے ہیں۔

۳۔ منصب نبوت سے آپ خالی الذہن تھے اور اُس کی کوئی اُمید نہ رکھتے تھے

بعض روایات احادیث وارد ہوا ہے کہ آپ کی قوم کے لوگوں نے ملک شام میں اہل کتاب سے سنا تھا کہ عرب میں عنقریب ایک پیغمبر پیدا ہوگا جو بنی اسرائیل کے پیغمبروں کی طرح ہوگا اور ایک نئے دین کی دعوت دے گا۔ اِنہی اہل کتاب میں ایک بحیرا راہب بھی تھا جس نے آپ کو ابو طالب کے ساتھ شہر بصریٰ میں دیکھا اور اُن سے کہا تھا کہ اِس لڑکے کا معاملہ بہت اہم ہوگا، یہودیوں سے اِسے بچائیے۔ یہ سب باتیں ہم اوپر بیان کر آئے ہیں۔ اِنہی روایتوں

میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضرت خدیجہ نے یہ سب باتیں سنی تھیں اور اُنہیں
بڑی امید تھی کہ وہ نبیِ منتظر آپ ہی ہوں گے، اور یہ کہ اس چیز نے بھی
اُنہیں آپ سے شادی کر لینے کی ترغیب دی تھی۔ بلکہ بعض روایتوں
میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ خود آپ نے اس آنے والے نبی کا چرچا سُن
لیا تھا اور آپ کو امید پیدا ہو گئی تھی کہ وہ نبی آپ ہی ہونگے، کیونکہ
آپ اپنی قوم اور دوسرے لوگوں کے شرک و فساد سے بیزار تھے۔
لیکن ان سب روایتوں کے خلاف صحیحین کی وہ حدیث ہے
جس کا تعلق آغازِ وحی سے ہے، اور جس میں صاف کہہ دیا گیا ہے کہ آپ
نے جب فرشتہ کو پہلی مرتبہ دیکھا تو بے حد خوفزدہ ہو گئے تھے اور اپنے
اس ڈر کا حال، خدیجہ سے بیان کر دیا تھا جنہوں نے تسکین دی اور قسم کھا
کر کہا کہ خدا آپ کے جیسے نیک آدمی کو ہرگز رسوا نہیں کرے گا۔ پھر وہ
آپ کو اپنے رشتہ دار، ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں، جو عیسائی تھے
اور توراۃ و انجیل پڑھ چکے تھے۔ خدیجہ اُنہیں دانشمند سمجھتی تھیں۔ اُن کا
خیال تھا کہ وہ ایسی بات کہیں گے جس سے آپ کو اطمینان ہو جائے۔ پھر
ورقہ نے جب بتایا کہ آپ نے جو کچھ دیکھا ہے وہ وحی الٰہی ہے، وہی ناموس
ہے جو موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوتا تھا، تو آپ کو یہ سن کر بہت تعجب
ہوا، جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے۔

اِس کی تائید خود قرآن سے بھی ہوتی ہے، اور معلوم ہے کہ قرآن کے مقابلہ میں مذکورہ بالا کمزور روایتوں کی ذرّہ برابر وقعت نہیں۔ اللہ تعالیٰ سورۂ ضحیٰ میں فرماتا ہے:

اَلَمْ یَجِدْکَ یَتِیْماً فَاٰوٰی؟ وَوَجَدَکَ ضَآلًّا فَهَدٰی۔	اے پیغمبر، کیا خدا نے آپ کو یتیم نہیں پایا پھر ٹھکانا دیا، اور آپ کو بے خبر پایا تو راستہ بتایا۔

اِس کی تفسیر سورۂ شوریٰ کی اس آیت میں فرمادی گئی ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

وَمَا کَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّکَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْیًا اَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ اَوْ یُرْسِلَ رَسُوْلًا فَیُوْحِیَ بِاِذْنِهٖ مَا یَشَآءُ اِنَّهٗ عَلِیٌّ حَکِیْمٌ۔ وَکَذٰلِکَ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا مَا کُنْتَ تَدْرِیْ مَا الْکِتٰبُ وَلَا الْاِیْمَانُ وَلٰکِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِیْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا وَاِنَّکَ لَتَهْدِیْٓ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِیْ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ	کسی بشر کی یہ شان نہیں کہ اللہ اُس سے کلام کرے، مگر الہام کے ذریعہ، یا پردے کے پیچھے سے، یا کسی فرشتے کو بھیجے جو اُس کے حکم سے پیغام پہنچا دے، اللہ عالی شان ہے حکمت والا۔ اسی طرح اے پیغمبر، ہم نے آپ کے پاس بھی اپنے حکم سے وحی بھیجی۔ آپ نہیں جانتے تھے کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کیا ہے، لیکن ہم نے رکھی ہے یہ روشنی جس سے راہ دکھاتے ہیں اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں۔ اور بیشک آپ سیدھی راہ کی طرف رہنمائی کرتے ہیں، اللہ

وَمَا فِی الْاَرْضِ اَلَا اِلَی اللّٰہِ تَصِیْرُ الْاُمُوْرُ۔ (۴۲ - ۵۱)	کی راہ کی طرف جو مالک ہے اُس سب کا جو آسمانوں میں اور زمین میں ہے۔ اور ہاں تمام معاملات کا انجام اللہ ہی کی طرف ہے۔

اس سے بھی زیادہ صاف سورۂ قصص میں فرمایا ہے:

وَمَا كُنْتَ تَرْجُوْا اَنْ یُّلْقٰی اِلَیْكَ الْكِتَابُ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ ظَهِیْرًا لِّلْكَافِرِیْنَ۔ وَلَا یَصُدُّنَّكَ عَنْ آیَاتِ اللّٰہِ بَعْدَ اِذْ اُنْزِلَتْ اِلَیْكَ وَادْعُ اِلٰی رَبِّكَ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ۔ وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰہِ اِلٰهًا آخَرَ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ، كُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ، لَهُ الْحُكْمُ وَاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ۔ (۲۸: ۸۶ تا ۸۸)	اے پیغمبر، آپ کو امید نہیں تھی کہ کتاب آپ پر اُتاری جائے گی، مگر یہ آپ کے پروردگار کی مہربانی تھی، لہٰذا آپ کافروں کے مددگار نہ بنیے۔ اور ایسا نہ ہو کہ وہ آپ کو اللہ کے حکموں سے روک دیں جبکہ وہ آپ پر نازل ہو چکے ہیں، دعوت دیجیے اپنے پروردگار کی طرف اور مشرکوں میں شامل نہ ہو جائیے۔ اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو نہ پکاریے۔ اُس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ ہر چیز فنا ہو جانیوالی ہے بجز اُس کی ذات کے۔ اُسی کا حکم ہے اور اُسی کی طرف تم سب لوٹ جانے والے ہو۔

یعنی اے محمدؐ، تجھے ہرگز امید نہ تھی کہ خدا کی طرف سے تجھ پر کتاب وحی کی جائے گی اور تو پیغمبر ہوگا، لیکن پروردگار نے تجھ پر اور اپنے بندوں پر محض

اپنی رحمت وفضل کی وجہ سے تجھے اپنا پیغمبر بنایا اور کتاب اتار دی!
سورۂ انبیاء کے آخر میں بھی ایسی ہی آیت وارد ہوئی ہے:

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ (۲۱: ۱۰۱)	ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت ہی بنا کر بھیجا ہے!

۴۔ ادھیڑ عمر میں دفعتاً وحی کا نزول

متفق علیہ صحیح روایات سے معلوم ہو چکا ہے کہ سچے خوابوں کے ذریعہ جب خدا آپ کو مستعد وطیار کر چکا تو صفائی کے ساتھ وحی آپ پر دفعتاً نازل ہو گئی۔ اُس وقت آپ کی عمر پورے چالیس برس کی تھی، یہ وحی اپنے دامنوں میں اعلیٰ علوم لیے ہوئے تھی، جنھوں نے عظیم الشان کارناموں کا دروازہ کھولا اور تمام انسانوں کے اجتماعی، تمدنی، دینی حالات میں اتنا زبردست انقلاب پیدا کر دیا جس کی کوئی نظیر شروع تاریخ سے آج تک موجود نہیں، جیسا کہ ہم اوپر بتا آئے ہیں۔

۵۔ ادھیڑ عمر میں اعلیٰ علوم اور عالمگیر کارنامے دفعتاً پیش کرنا ممکن نہیں

نفسیات واجتماعیات کے موجودہ علماء کا فیصلہ ہے کہ آدمی جب ۳۵ برس کا ہو جاتا ہے اور علم وفن میں کمال یا کسی اور لائن میں نام پیدا نہیں کر سکتا تو اس عمر کے بعد دفعتاً نامور بن نہیں سکتا۔ علماء کہتے ہیں کہ تمام بڑے بڑے عالم، فلسفی، سیاسی مدبر، فاتح اپنی

جوانی ہی میں ہونہار ثابت ہو گیے تھے گو اُن کی برتری ادھیڑ عمر میں ظاہر ہوئی۔

پچھلے دنوں ایک بڑے عالِم[1] نے امریکن اکاڈیمی میں مفصل تقریر کی ہے اور اُس میں یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ عام خیال کے برخلاف دنیا کے معاملات میں فطری ذہانت و ذکاوت کو تجربوں پر ترجیح حاصل ہے۔ اِس عالِم نے اپنے دعوے کی بنیاد ایک ایسے قاعدے پر رکھی ہے جسے تازہ ترین مباحث و تحقیقات نے پہلے سے زیادہ ثابت کر دیا ہے۔ اُس نے اپنی تقریر میں کہا:

"سائیکالوجی کے بہت سے علماء کی جدید ترین تحقیقات سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان کی عقلی قوت اپنے آغاز میں، تکمیل میں، تنزّل میں، اُس کے جسمانی حالات کے مطابق ہوتی ہے۔ عقل کی نشوونما اُس زمانہ سے پہلے ہی مکمّل ہو جاتی ہے جسے عام لوگوں نے ٹھہرا رکھا ہے اور یہ کہ عقل کا تنزّل بھی اِن کے مفروضہ زمانہ سے پہلے ہی شروع ہو جاتا ہے۔ مشہور انگریز اہل قلم، جانسن کا قول ہے کہ آدمی کا بڑھاپا، ۲۵ سال کی عمر سے شروع ہو جاتا ہے، لہذا جسے اُبھرنے اور کمال حاصل

(۱) یہ ڈاکٹر وچلپ ہے جس کی تقریر کا خلاصہ، رسالہ الہلال نے شائع کیا ہے۔

کرنے کا ولولہ ہے، اُسے چاہیے کہ اس عمر سے پہلے ہی کوشش کرے، ورنہ بعد میں کوشش بے سود ہوگی۔ نیز مشہور مؤلف وادیب "سولیفٹ" تیس سال کی عمر کے بعد والے زمانہ کی بابت کہا کرتا تھا "دوسرے پہلو کی طرف جھکاؤ ہے"، یعنی بڑھاپے کا آغاز ہے۔

"لیکن اس کے باوجود بہت لوگ اس وہم میں مبتلا ہیں کہ بڑھاپا ۶۵ یا ستّر برس کی عمر میں شروع ہوتا ہے۔ بلاشبہ آدمی کی عمر جتنی بڑھتی جاتی ہے، اُس کی دانائی اور تجربے میں اضافہ ہوتا جاتا ہے — مگر وہ کوئی نئی بات پیدا نہیں کر سکتا"۔

آگے چل کر اسی ڈاکٹر نے کہا ہے "عقل کی چستی، اکیس برس کی عمر میں مکمل ہو جاتی ہے، اور عمر کی تیسری دہائی کے ساتھ عقل میں کمزوری و سستی پیدا ہونے لگتی ہے، اور یہ کہ بعض بڑے بڑے لوگ جنہوں نے علم و تحقیق میں بوڑھے ہو کر شہرت حاصل کی، اُنہوں نے بھی اپنا کام، جوانی ہی میں شروع کر دیا تھا جس کا نتیجہ بعد میں ظاہر ہوا" بڑھاپے میں شہرت حاصل کرنے والوں میں سے بہت لوگوں[1] کے نام ڈاکٹر نے مثالاً پیش

(۱) مثلاً ڈاروین جس نے اپنی کتاب کا مواد تیس برس میں جمع کیا تھا، اور اٹلی کا شاعر، ڈینٹی جس کا کمال مدتوں شاعری کرنے کے بعد ظاہر ہوا، اور موجودہ جرمن عالم انشٹین جس کا بچپن سے ریاضی اور علم ہیئت سے سابقہ رہا ہے اب اپنا نسبتی نظریہ پیش کر سکا ہے۔

کیے ہیں، مگر ان کی تعداد کم ہے۔ نیز ایسے لوگوں کے نام بھی گنائے ہیں جو جوانی ہی میں بڑے بن گیے تھے۔

۶۔ علوم و اعمالِ رسالت میں محمدؐ اور موسیٰ وغیرہم انبیاء کے مابین فرق

یہ بات طے شدہ ہے کہ کوئی آدمی ایسا نہیں گزرا جس نے بغیر کسی سابق علمی یا عملی طیاری کے ادھیڑ عمر یا بڑھاپے میں کوئی عظیم الشان عالمگیر کارنامہ کر دکھایا ہو اور اُسے تکمیل تک پہنچا دیا ہو۔ لیکن انبیاء علیہم السلام اس قاعدے سے مستثنیٰ ہیں، کیونکہ نبوت کا علم، کسبی نہیں ہوتا، بلکہ اللہ کی طرف سے وحی کیا جاتا ہے۔ پھر معلوم ہو چکا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے انبیاء میں سب سے مشہور اور سب سے زیادہ بڑے موسیٰ علیہ السلام گزرے ہیں۔ نیز یہ بھی تم جان چکے ہو کہ موسیٰؑ کی شریعت و عمل اور محمدؐ کی شریعت و عمل میں کہاں تک مناسبت ہے، حالانکہ دونوں کی تربیت اور سوسائٹی میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

اسرائیلی پیغمبروں میں حضرت موسیٰ کے بعد عیسیٰ مسیح علیہ السلام کا درجہ ہے، مگر یہ موسیٰ ہی کی شریعت کے پیرو تھے، گو اُس کی بعض سختیوں کو منسوخ کر گیے ہیں۔ مسیح کا کارنامہ صرف اس قدر ہے کہ کچھ وعظ فرمایے جن کی اُس وقت کے لوگوں کو سخت ضرورت تھی۔ اخلاق و اعمال میں فساد آگیا تھا۔ دنیا کی محبت اور مال کی پرستش عام ہو گئی تھی۔

حضرت عیسیٰ نے اِن چیزوں سے منع کیا۔ آسمانی بادشاہت کی اور اُس روحِ حق کی بشارت دی جو اُن کے بعد آنے والی تھی اور انسانوں کو سب کچھ سکھا دینے والی تھی۔ حضرت عیسیٰ کی بشارت، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اور کسی پر منطبق نہیں ہوتی۔

لیکن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں جو کارنامہ دنیا میں واقع ہوا ہے، اُس کی مثال چشم فلک نے کبھی نہیں دیکھی۔ نہ باکمال نوجوانوں میں، نہ ادھیڑوں میں، نہ بوڑھوں میں، نہ پیغمبروں میں، نہ کسی اور میں جیساکہ ہم بہ تفصیل بیان کر چکے ہیں اور ذیل میں اُس کا خلاصہ پیش کرتے ہیں:

سوال

محمد صلی اللہ علیہ وسلم، چالیس برس کی عمر کے بعد کیا چیز لائے؟ کس بات کی تعلیم دی؟ کیا عمل کیا؟ حالانکہ اِس عمر سے پہلے اِس قسم کی کوئی بات کبھی نہ آپ کی زبان سے سنی گئی، نہ فعل میں دیکھی گئی، نہ علم میں آپ کا کوئی مرتبہ تھا نہ عمل میں کوئی امتیاز رکھتے تھے؟

جواب

محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسا دین لائے جو معقول ہے۔ فطرت کے مطابق ہے۔ عالمگیر ہے۔ دائمی ہے۔ ایسی شریعت لائے

ومنصفانہ اور سب آدمیوں کے مابین مساوات قائم کرنے والی ہے۔
محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسی قوم کا شیرازہ باندھ دیا جو باہم شروع سے خانہ جنگی کرتی آئی تھی اور جس میں کبھی اتحاد نہیں ہوا تھا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام قوموں اور قبیلوں سے ایک متحد و مہذّب قوم پیدا کر دی۔
محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک زبردست و منصف حکومت و سلطنت قائم کر دی، اور یہ کیا کہ دینوں میں، اخلاق میں، اور تہذیبوں میں اُس تمام فساد کی اصلاح کر دی جو لوگوں نے ظلم، معصیت، اور خرافات کی راہ سے پیدا کر رکھا تھا!

محمدؐ کی دعوت کا موضوع اور اُنکی کتاب کی خصوصیتیں

محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دعویٰ کیا کہ خدا نے اُنہیں اُن کی قوم میں مبعوث فرمایا ہے، اُس قوم میں جو جاہل تھی، مشرک تھی۔ بُت پرست تھی۔ زمین میں فساد پھیلاتی تھی۔ اور اس لیے مبعوث فرمایا ہے کہ اپنی قوم کو پاک کر دیں۔ اُس کی تربیت کریں، اُسے کتاب و حکمت سکھائیں۔ تاکہ وہ آپ کی دعوت کو تمام قوموں تک پہنچا سکے۔ اصلاح کی علمبردار ہو زمین کی وارث و خلیفہ بن جائے۔
محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعویٰ کیا تھا اور یہ دعویٰ حرف بحرف پورا ہو گیا:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا

(۲۴: ۵۵)

تم میں سے جو لوگ ایمان لائے ہیں اور عمل صالح انجام دیتے ہیں، اُن سے خدا کا وعدہ ہے کہ انہیں زمین میں اُسی طرح خلیفہ بنا دیگا جس طرح اُن سے پہلے لوگوں کو بنا چکا ہے۔ اُن کے لیے اُن کا دین مستحکم کر دیگا جسے اُن کے واسطے پسند کر چکا ہے خوف کے بعد اُن کے لیے امن قائم کر دیگا، تاکہ وہ میری عبادت کریں اور میرے ساتھ کسی چیز کو بھی شریک نہ کریں۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دعویٰ کیا کہ تمام انسانی قومیں، کسی مذہب وملت کی ہوں، گمراہ ہیں اور گمراہ کن۔ اہل کتاب بھی پیغمبروں کی ہدایت سے ہٹ چکے ہیں۔ پروردگار سے شرک کرتے ہیں۔ دین الٰہی میں ایسی باتیں پیدا کرتے ہیں جو خدا نے مقرر نہیں کیں۔ آسمانی کتابوں کا کچھ حصہ گم کر چکے ہیں اور باقی میں تحریف کر دی ہے، اور یہ کہ آپ خدا کی طرف سے اِن سب قوموں کی ہدایت ورہنمائی کے لیے آئے ہیں، اور اس لیے آئے ہیں کہ سب کو ایک ایسی قوم بنا دیں جو آپس میں متفق ہو، محبت پر اُستوار ہو۔ جو قومیں اس برادری میں نہ

آئیں اُن کے ساتھ بھی انصاف کریں۔ اور یہ کہ آپ ہی کا دین سب کے دینوں پر اپنی حجت و برہان سے، عقل و وجدان سے، برتری و سربلندی کی راہ سے غالب آجائے گا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ دعویٰ تھا اور دنیا دیکھ چکی ہے کہ یہ دعویٰ حرف بحرف پورا ہو گیا:

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ (۹ : ۳۲)

وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اُسے تمام دینوں پر غالب کر دے، اگرچہ مشرکوں کو کتنا ہی ناگوار گزرے۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دعویٰ کیا کہ جو کتاب وہ لائے ہیں، اللہ کا کلام ہے، ایسا کلام جسے اللہ نے آپ پر وحی کیا ہے۔ خود آپ کا اُس میں کوئی دخل نہیں ہے۔ آپ اُس کے صرف مُبلّغ ہیں۔ وہ جس طرح آتا ہے اُسی طرح پہنچا دیتے ہیں۔ یہ دعویٰ تھا اور واقعات نے ثابت ہو گیا کہ اِس کتاب میں اور خود محمد کے کلام میں، اُس کے نازل ہونے سے پہلے اور نازل ہونیکے بعد کسی طرح کی کوئی مشابہت نہیں ہے، نہ اُس کی ترتیب میں، نہ اسلوب میں، نہ معانی میں، نہ بلاغت میں، نہ تاثیر میں، نہ اُس کی خبروں اور عقیدوں میں نہ اُس کی تشریع و احکام میں، نہ اُس کے کونی و اجتماعی معلومات میں نہ اُس کی حکمتوں اور ادب کی باتوں میں۔

قرآن

بعض دلائل جو ثابت کرتے ہیں کہ قرآن، خدا کی طرف سے ہے نہ کہ محمدؐ کی طرف سے

نبوت سے پہلے اور بعد محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ سے حاصل کی ہوئی عقلی دلیلوں سے ثابت ہے کہ آپ اس درجہ سچے تھے کہ جھوٹ بول ہی نہ سکتے تھے، اور ظاہر ہے کہ جو شخص آدمیوں کے مقابلہ میں جھوٹ نہیں بولتا وہ خدا کے مقابلہ میں کیونکر جھوٹ بول سکتا ہے، جیسا کہ خود آپ کے سخت سے سخت دشمنوں کو بھی عین جنگ و عداوت کے زمانہ میں بھی اعتراف تھا۔ اس واقعہ کی تائید اس آیت سے ہوتی ہے جو آپ کے دشمنوں سے متعلق اتری تھی:

اِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُونَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ (۶: ۳۳)	یہ لوگ آپ کو نہیں جھٹلاتے بلکہ ظالم، آیاتِ الٰہی کو جان بوجھ کر ٹھکراتے ہیں۔

آزاد خیال علماء فرنگ بھی قائل ہو چکے ہیں کہ آپ دروغ سے ... تھے، جیسا کہ ہم اوپر بتا آئے ہیں۔ یہاں بعض دوسری دلیلیں

پیش کی جاتی ہیں جن سے ثابت ہو جائے گا کہ اپنے دل سے گھڑنا تو درکنار، ناممکن ہے کہ قرآن آپ کی شخصی استعداد کے فیض سے پیدا ہو گیا ہو یا یہ کہ نیک نیتی کے ساتھ آپ کا یقین ہو کہ قرآن خدا کی طرف سے ہے، حالانکہ خود آپ ہی کی روح سے پھوٹ پڑا ہو، جیسا کہ بعضوں نے آج کل کہنا شروع کر دیا ہے۔

دلیل اوّل

خود قرآن بتاتا ہے کہ جب آپ پر وحی اُترتی تھی تو اس ڈر سے کہ کچھ بھول نہ جائیں، جلد جلد تلاوت کرنے لگتے تھے کہ یاد ہو جائے چنانچہ سورۂ قیامہ کے نزول کے دوران میں جب آپ نے یہی کیا تو خدا نے فرمایا:

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ۔ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ۔ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ۔ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ (۷۵: ۱۶ تا ۱۹)	اے پیغمبر، قرآن پڑھنے میں زبان اس طرح نہ چلایئے کہ جلد یاد ہو جائے۔ قرآن کو جمع کرنا اور آپ سے پڑھوانا تو ہمارے ذمہ ہے۔ جب ہماری طرف سے وہ پڑھا جائے تو اس پڑھنے کا ساتھ دیجئے۔

اِس آیت میں خود پروردگار نے ذمہ لیا کہ قرآن آپ کو یاد رہے گا، لہٰذا جس طرح نازل ہو، اطمینان سے پڑھیں۔ کوئی بات

حفظ سے رہ نہ جائے گی۔ نیز ذیل کی آیت میں ذمہ لیا ہے کہ آپ قرآن میں سے کچھ بھول نہیں جائیں گے:

سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى إِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ إِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفٰى (۸۷: ۶و۷)	عنقریب ہم آپ کو پڑھائیں گے اور آپ نہ بھولیں گے، الّا یہ کہ خدا چاہے۔ وہ کھلے اور چھپے سب کو جانتا ہے۔

یعنی ہم نے فرشتہ کے ذریعہ بھیجے ہوئے قرآن کے بھول جانے سے آپ کو بالکل محفوظ کر دیا ہے۔ آپ ہرگز کچھ نہیں بھولیں گے، لیکن اگر خدا چاہے گا کہ کچھ بھول جائیں تو بھول جائیں گے، کیونکہ کسی خاص مصلحت سے خدا کی مشیئت یہی ہوگی۔ مگر خود اپنے حافظہ کی کمزوری سے آپ کبھی بھول میں نہیں پڑیں گے جس کا آپ کو اندیشہ لگا رہتا ہے۔ اس طرح کے استثناء کو استثنائے منقطع کہتے ہیں اور اس سے یہ مطلب نہیں ہوتا کہ خدا چاہے گا بھی کہ آپ قرآن میں سے کچھ بھول جائیں، بلکہ یہ ویسا ہی استثنا ہے، جیسا ابراہیم علیہ السلام کے اُس جواب میں ہے جو انہوں نے اپنی قوم کو دیا تھا "وَلَآ أَخَافُ مَا تُشْرِكُوْنَ بِهٖٓ إِلَّآ أَنْ يَّشَآءَ رَبِّيْ شَيْـًٔا" (میں اُس سے نہیں ڈرتا جسے تم خدا کا شریک بناتے ہو، مگر ہاں کہ میرا رب کوئی چیز چاہے) بعضوں نے کہا ہے کہ تاکید نفی کے لیے یہ استثناء ہے۔ اور بعض کا قول ہے کہ اس سے غرض منسوخ ہونے والی آیات

ہیں۔

دلیل دوم

قرآن کو آپ اپنے الفاظ میں نہیں بلکہ اُنہی الفاظ میں پہنچا دیتے تھے جو خدا کے پاس سے نازل ہوتے۔ فرشتہ جو کچھ بھی القا کرتا تھا، بعینہٖ وہی سنا دیتے تھے، حتیٰ کہ لفظ "قُلْ" (کہو) بھی جیسے "قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَد" لیکن جب کبھی آپ اپنی گفتگو میں صرف معانی کی تبلیغ کرنا چاہتے اور قرآن کی تلاوت مقصود نہ ہوتی تو لفظ "قُلْ" ذکر نہیں کرتے تھے، بلکہ اُس کے بعد جو کچھ فرمایا گیا ہے، اُسے بیان کر دیتے تھے جیسا کہ ہرقل، قیصرِ روم اور دوسرے بادشاہوں کے نام اپنے خطوں میں آپ نے تحریر فرمایا تھا "یَا اَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا الخ"، حالانکہ اصلی آیت، لفظ "قل" سے شروع ہوتی ہے۔

دلیل سوم

خود قرآن سے معلوم ہو چکا ہے کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے علم ورائے سے نہیں ہوتا تھا، بلکہ خدا نے اُسی کے ذریعہ آپ کی تربیت کی تھی اور علم سکھایا تھا۔ چنانچہ فرمایا:

وَاَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا (۴: ۱۱۳)	خدا نے آپ پر کتاب وحکمت نازل کی اور آپ کو اس کی تعلیم دی جس کا آپ علم نہ رکھتے تھے۔ آپ پر خدا کا فضل بڑا ہے۔

اور یہ کہ قرآن ہی، تبلیغ و تنفیذ میں آپ کی اجتہادی فروگذاشتوں کو درست کرتا تھا، کبھی نرمی و لطف کے ساتھ، جیسا کہ فرمایا:

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ۔ (۹: ۴۳)	اللہ آپ کو معاف کرے، آپ نے انہیں اجازت کیوں دی۔ یہاں تک کہ آپ پر ظاہر ہو جاتا کہ سچے کون ہیں اور جھوٹے کون؟

اور کبھی وعظ اور سختی کے ساتھ جیسا کہ فرمایا:

وَلَوْلَا اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْئًا قَلِيْلًا۔ اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا (۱۷: ۷۴، ۷۵)	اگر ہم نے اے پیغمبر تمہیں ثابت قدم نہ رکھا ہوتا تو تم کافروں کی طرف کچھ جھک جاتے۔ تب بے شک ہم دونا مزہ چکھاتے زندگی میں اور دونا مرنے میں، پھر تم ہمارے مقابلہ میں کسی کو اپنا مددگار نہ پاتے۔

اور فرمایا:

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِى الْاَرْضِ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ۔ لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ	نبی کی شان سے بعید ہے کہ اس کے پاس قیدی آئیں اور خون نہ کرے، تم دنیا کی جنس چاہتے ہو اور اللہ آخرت چاہتا ہے۔ اللہ زور آور ہے حکمت والا۔ اگر خدا کا نوشتہ پہلے سے نہ

سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيمَا أَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ (۸: ۶۷و۶۸)	ہوتا تو تم پر قیدیوں سے فدیہ لینے کی وجہ سے بڑا عذاب نازل ہو جاتا۔

اور فرمایا:

وَإِذْ تَقُولُ لِلَّذِي أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَأَنْعَمْتَ عَلَيْهِ أَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللَّهَ، وَتُخْفِي فِي نَفْسِكَ مَا اللَّهُ مُبْدِيهِ وَتَخْشَى النَّاسَ وَاللَّهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْشَاهُ (۳۳: ۳۷)	اور اے پیغمبر، جب تم اُس شخص سے کہتے تھے جس پر خدا نے اور تم نے احسان کیا ہے کہ اپنی بیوی کو لیے رہ اور اللہ سے ڈر تو تم اپنے دل میں وہ بات چھپاتے تھے جسے خدا کھول دینے والا تھا، تم لوگوں سے ڈرتے تھے، حالانکہ اللہ اس کا زیادہ مستحق ہے کہ اُس سے ڈرو۔

اِس آیت کی نسبت حضرت عائشہ فرماتی ہیں، اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم قرآن میں سے کچھ چھپاتے ہوتے تو اِس آیت کو ضرور چھپا ڈالتے۔

اور فرمایا:

عَبَسَ وَتَوَلَّى۔ أَنْ جَاءَهُ الْأَعْمَى۔ وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهُ يَزَّكَّى۔ أَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرَى۔ أَمَّا مَنِ اسْتَغْنَى۔ فَأَنْتَ لَهُ تَصَدَّى	تیوری چڑھائی اور منہ موڑا اس بات پر کہ اُس کے پاس اندھا آیا۔ تجھے کیا معلوم کہ شاید وہ سنورتا، یا نصیحت قبول کرتا اور نصیحت اُسے فائدہ پہنچاتی۔ لیکن جو پروا

وَمَا عَلَيْكَ أَلَّا يَزَّكَّىٰ. وَأَمَّا مَنْ جَاءَكَ يَسْعَىٰ. وَهُوَ يَخْشَىٰ. فَأَنْتَ عَنْهُ تَلَهَّىٰ؟ (۸۰)	نہیں کرتا، تو اُس کی فکر میں ہے۔ حالانکہ تجھ پر کوئی الزام نہیں اگر وہ نہیں سنورتا ہے لیکن جو تیرے پاس دوڑ کر آیا اور جو ڈرتا ہے، سو تو اُس سے تغافل کرتا ہے!

اور فرمایا:

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ، وَلَا تَعْدُ عَيْنَاكَ عَنْهُمْ تُرِيدُ زِينَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَلَا تُطِعْ مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ وَكَانَ أَمْرُهُ فُرُطًا (۱۸ : ۲۸)	اور اے پیغمبر، اپنے آپ کو اُنہی لوگوں کے ساتھ رکھ جو پکارتے ہیں اپنے پروردگار کو صبح شام، طالب ہیں اُسی کی خوشنودی کے۔ نہ دوڑیں تیری آنکھیں انہیں چھوڑ کر دنیا کی رونق کی تلاش میں۔ اُس شخص کی اطاعت نہ کر جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے، جو اپنی خواہش کی پیروی کرتا ہے، اور جس کا کام بے اعتدالی ہے۔

اسی کے ہم معنی یہ آیت ہے:

وَلَا تَطْرُدِ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ، مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِنْ شَيْءٍ	اے پیغمبر، اُن لوگوں کو اپنے پاس سے نہ نکال جو اپنے پروردگار کو دن رات پکارتے ہیں طلب میں اُس کی خوشنودی کے۔ نہ اُن کے

حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ	حساب کا کچھ بوجھ ہوگا تجھ پر، نہ تیرے حساب کا
فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُونَ	کچھ بوجھ ہوگا اُن پر۔ اگر تو اُنہیں نکال دیگا تو
مِنَ الظّٰلِمِيْنَ (۶ : ۵۲)	ظالموں میں سے ہوجائیگا۔

یہ آخری آیت، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تعلیم دینے کے لیے نازل ہوئی تھی کہ غریب مومنوں کا خیال کریں اور قریشی امیروں اور سرداروں کی پروا نہ کریں جو غریبوں کو حقیر سمجھتے تھے۔ آیت نازل ہونے کی ضرورت یوں پیش آئی کہ آپ کا اجتہاد یہ تھا کہ دولتمند اور سربرآوردہ لوگوں کو اپنی طرف مائل کرلیں، کیونکہ جب وہ ایمان لے آئیں گے تو عام طور پر عرب بھی اُن کی پیروی میں اسلام قبول کریں گے۔

دلیل چہارم

قرآن نے عرب اور عجم، سب کو چیلنج دیا کہ اس کی جیسی کوئی چیز اگر لاسکتے ہوں تو لے آئیں، اور دعویٰ کیا کہ تمام انسان قطعاً مجبور اور بے بس ہیں کہ اس قرآن جیسی، یہاں تک اُس کی چھوٹی سے چھوٹی سورۃ جیسی بھی کوئی چیز پیش کرسکیں۔ یہ چیلنج بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک دلیل تھا کہ قرآن، خدا کی طرف سے ہے نہ کہ آپ کی اپنی بنائی ہوئی کتاب۔ چنانچہ یہ چیلنج دیا گیا۔ عرب اس کے سامنے بے بس ہو گئے۔ پھر عجم بھی بے بس ہو گئے، جیسا کہ ہم نے زبان، اسلوب، ترتیب (دیکھو صفحہ ۱۴۷) تاثیر، کیفیت

اور عالمگیر انقلاب پیدا کرنے کے لحاظ سے اُس کے معجزہ ہونے کی بحث میں بیان کر دیا ہے (دیکھو صفحہ ۱۴۴)

معلوم ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ذاتی قابلیت واستعداد سے ایسی حیرت انگیز چیز پیش نہیں کر سکتے تھے، جیسا کہ جوانی میں آپ کی سیرت سے ظاہر ہے۔

دلیل پنجم

قارئین ذیل کی آیت پر غور کریں:

وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ قَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا ائْتِ بِقُرْآنٍ غَيْرِ هَٰذَا أَوْ بَدِّلْهُ، قُلْ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أُبَدِّلَهُ مِنْ تِلْقَاءِ نَفْسِي، إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ، إِنِّي أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ. قُلْ لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا تَلَوْتُهُ عَلَيْكُمْ وَلَا أَدْرَاكُمْ بِهِ، فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِنْ قَبْلِهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ۔

جب اُن پر ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو کہتے ہیں وہ لوگ جو ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے کہ لے آ اس کے سوا اور کوئی قرآن یا بدل ڈال اسے۔ اے پیغمبر، تو کہہ دے کہ میرے بس کی یہ بات نہیں کہ اپنے دل سے اسے بدل دوں۔ میں تو اُسی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر وحی کیا جاتا ہے۔ میں ڈرتا ہوں بڑے دن سے عذاب سے اگر اپنے رب کی نافرمانی کروں۔ کہہ دے کہ اگر خدا چاہتا تو میں نہ اس کی تم پر تلاوت کرتا اور نہ تمہیں اس کی خبر

ہوتی۔ میں تو تم میں ایک عمر رہ بھی چکا ہوں۔ پھر کیوں نہیں سمجھتے؟	(۱۰: ۱۵ و ۱۶)

اِس آیت میں خدا نے آپ کو حکم دیا ہے کہ جو لوگ اِس قرآن کے علاوہ، جس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز آ چکے ہیں، دوسرا قرآن لانے کا مطالبہ کر رہے ہیں، اُن سے کہہ دیجئے کہ اِسے بدل ڈالنا میری قدرت سے باہر ہے، پھر میں ایسا کرنے کی اگر قدرت بھی رکھتا تو بدل نہیں سکتا تھا، کیونکہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ اِسی قرآن کی تبلیغ کروں، اور اگر ایسا نہ کروں تو خدا کا عذاب میرے لیے بھی طیار موجود ہے۔ پھر ذرا غور تو کرو۔ بھلا میں کیا ہوں؟ میں تم میں پورے چالیس برس سے جی رہا ہوں۔ نہ علم میں، نہ زبان میں، تم سے زیادہ واقفیت رکھتا ہوں، پھر تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ یہ قرآن میں نے اپنے دل سے بنایا ہے اور جب چاہوں اِسے بدل کر دوسرا قرآن پیش کر دوں!

دلیل ششم

صحیح ترین روایات میں آیا ہے، جن میں سے بعض متواتر ہیں کہ کبھی کبھی وحی نازل ہونے میں لمبا وقفہ پڑ جاتا تھا، اس سے آپ کا دل تنگ ہوتا اور تکلیف محسوس کرتے۔ ایک مرتبہ ایسا ہی معاملہ پیش آیا تو مشرکوں نے کہنا شروع کر دیا کہ آپ کا پروردگار آپ

سے ناخوش ہو گیا ہے۔ اُن میں سے ایک عورت نے کہا کہ آپ کا شیطان چھوڑ کر چلا گیا ہے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی "مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰی" (اے پیغمبر، آپ کے پروردگار نے نہ آپ کو چھوڑا ہے نہ آپ سے دشمنی کی ہے) اسی قدر نہیں بلکہ آپ بہت سے سوالوں کا جواب نہیں دیتے تھے بلکہ فرماتے تھے کہ وحی آنے دو۔ اس بارے میں سب سے زیادہ عبرت انگیز اور سب سے صاف دلیل، واقعۂ افک میں موجود ہے۔ منافقوں کے سردار، عبداللہ بن اُبَیّ بن سلول نے حضرت عائشہ ام المومنین پر، جو آپ کی سب سے چہیتی بیوی تھیں، تہمت لگائی تھی۔ بعض مومنوں نے بھی اس کا یقین کر لیا تھا اور چرچا کرنے لگے تھے۔ منافقوں اور کافروں نے اب تک آپ کو جتنی تکلیفیں دی تھیں، یہ تہمت آپ کے لیے سب سے زیادہ تکلیف دہ تھی۔ آپ اس قدر متاثر تھے کہ حضرت عائشہ کے والد، ابوبکر صدیق کی جلالتِ شان کے باوجود آپ نے خاص خاص لوگوں سے مشورہ بھی کیا کہ اُمُّ المومنین کو جدا کر دیں۔ خود اُن کی کنیز، بریرہ سے بھی سوال کیا تھا کہ کیا کبھی کسی مشتبہ بات کا اُن پر شک ہوا ہے۔ بریرہ نے قسم کھا کر کہا کہ کبھی اس طرح کی کسی بات کا وہم بھی نہیں گزرا۔ حضرت عائشہ رات دن روتی

تھیں۔ اُن کے آنسو کبھی نہ تھمتے تھے۔ اُنہیں یقین تھا کہ خدا ضرور اُنہیں بے گناہ ثابت کر دے گا، مگر خود کہتی ہیں "لیکن یہ گمان بھی میرے دل میں نہیں آیا تھا کہ خدا میرے بارے میں ایسی وحی نازل فرمائے گا جس کی ہمیشہ تلاوت کی جائے گی۔ میں اپنے آپ کو اس سے کہیں حقیر سمجھتی تھی"، لیکن اللہ کی حکمت دیکھو کہ پورے ایک مہینہ تک کوئی وحی نازل نہیں ہوئی۔ پھر حضرت عائشہ کی برأت میں سورۂ برأۃ کی مشہور آیتیں نازل ہو گئیں۔ اب اگر آپ کی ذاتی استعداد کو نزولِ وحی میں کچھ بھی دخل ہوتا، یا یہ بات ہوتی کہ خود آپ کی روح سے وحی پھوٹتی ہوتی اور آپ اُسے خدا کی طرف سے سمجھتے ہوتے، جیسا کہ گمان کرنے والوں نے گمان کر رکھا ہے، تو اس حادثہ بلکہ اس مصیبت عظمیٰ میں اتنے بہت دن وحی رُکی نہیں رہ سکتی تھی۔

دلیل ہفتم

صحیح ترین مرفوع احادیث میں بتایا گیا ہے کہ شروع شروع آپ پر وحی کا کتنا زیادہ رعب پڑتا تھا۔ آپ کی حالت بدل جاتی تھی سخت سردی میں پسینہ پسینہ ہو جاتے تھے۔ نزولِ وحی کے وقت آپ کا وزن بہت زیادہ ہو جاتا تھا۔ اس کی وجہ ہم بیان کر آئے

ہیں کہ جبریل روح الامین کے اتصال کے سبب سے آپ پر روحانیت کا غلبہ ہو جاتا تھا۔ جب لوگوں کے سامنے وحی نازل ہوتی تھی تو صحابہ آپ کی حالت دیکھکر جان جاتے تھے کہ وحی اُتر رہی ہے۔
حضرت عبادہ کہتے ہیں کہ جب وحی نازل ہوتی تو آپ سخت بے چین ہو جاتے اور آپ کے چہرہ کا رنگ بدل جاتا (مسلم) صحیحین اور نسائی میں ہے کہ یعلیٰ بن امیہؓ، حضرت عمر سے کہا کرتے تھے، کاش میں نزول وحی کے وقت رسول اللہ کو دیکھ سکتا۔ چنانچہ جب آپ جعرانہ میں تھے اور دھوپ سے بچانے کے لیے آپ پر ایک کپڑا تان دیا گیا تھا تو وحی اترنے لگی۔ حضرت عمر نے یعلیٰ کو اشارہ کیا کہ آکر دیکھو۔ اُنہوں نے کپڑے میں منھ ڈالا تو کیا دیکھتے ہیں کہ آپ کا چہرہ سرخ ہے اور خرّاٹے لے رہے ہیں۔ کچھ دیر یہی حالت رہی، پھر آپ ٹھیک ہو گیے۔
اسلام کے فرنگی دشمنوں اور اُن کے شاگردوں نے آپ کی اس حالت کی یہ تاویل کی ہے کہ آپ پر عصبی و تشنّجی یعنی ہسٹریا کے دورے ہوتے تھے۔ حالانکہ آپ کی اس حالت میں اور عصبی بیماروں کی حالت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ آپ کا مزاج معتدل تھا۔ شاید دموی سے زیادہ قریب تھا۔ عصبی دوروں کے بعد آدمی کو ایسی سخت جسمانی و عقلی کمزوری لاحق ہو جاتی ہے کہ دشمن بھی ترس کھانے

پر مجبور ہو جاتے ہیں، برخلاف اس کے آپ کی اس اعلیٰ روحانی حالت کی یہ کیفیت ہوتی تھی کہ اُس کے دُور ہونے کے بعد قرآن کی آیتیں یا کوئی پوری سورت تلاوت فرماتے تھے جس کے لفظی و معنوی اعجاز کا کچھ حال ہم اوپر بیان کر آئے ہیں۔ جس میں علم غیب، حکمت، اور قانون کی ایسی باتیں ہوتی تھیں جیسی انسانوں نے نہ اپنے حکماء سے کبھی سنی تھیں نہ انبیاء سے، اور امید نہیں کہ آیندہ نسلوں میں بھی کبھی ایسی باتیں سنیں گے، کیونکہ اسی وحی پر اللہ تعالیٰ نے نبوت اور وحی اعلیٰ کی تعلیم ختم کر دی ہے۔ ہم آج بھی ٹھیک اُسی طرح تمام انسانوں کو چیلنج کرتے ہیں کہ قرآن جیسی کوئی چیز پیش کر دیں، جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانہ کے لوگوں کو چیلنج دیا تھا۔ وہ خود اپنے غرور و تعصب میں مجنون ہے جو اس علمی اصلاحی کمال کو جنون کہتا ہے۔ ہاں یہ بات دوسری ہے کہ جنون سے اُس کے برعکس معنی مراد لیے جائیں یا اُس کمال کا نام، جنون رکھ دیا جائے جو ربوبیت سے نیچے اور انسانیت و ملکیت سے بالاتر ہے۔

دلیل ہشتم

نوعِ انسانی کی ترقی کے لیے جن قرآنی علوم و مقاصد کا ہم ذکر کر آئے ہیں، اُن سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ

اُن کے اصول کا علم تھا نہ جانتے تھے کہ انسانوں کو اُن کی ضرورت ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جب اِس درجہ ناواقف تھے تو ظاہر ہے کہ اِن علوم و مقاصد کے وسائل و فروع سے بھی بے خبر ہوں گے۔ یہ واقعہ ہے کہ آپ کو ہرگز معلوم نہ تھا کہ اجتماعی، سیاسی، انتظامی لحاظ سے صحیح روحانی عبادتیں کون ہو سکتی ہیں؟ اسلامی طہارت کے مسئلہ ہی کو لے لو، صرف یہی اکیلا مسئلہ، یورپ پر حجت ہے۔ اُس کی بُت پرستی کے زمانہ میں بھی، اُس کی عیسائیت کے زمانہ میں بھی، اور فلسفہ و ترقی کے موجودہ زمانہ میں بھی۔ یہ حقیقت ہر اُس شخص پر روشن ہے جو یورپ کی تاریخ سے واقف ہے، مگر ہم نے اُس کی تشریح اِس کتاب میں نہیں کی کیونکہ مشہور و معلوم ہے۔

نتیجہ

اِن مقدمات کا نتیجہ، اور اِن روشن دلائل کا مقصود یہ بتانا ہے کہ قرآن، اللہ تعالیٰ کی وحی ہے۔ ایسی وحی جس میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نہ ذاتی استعداد کو کوئی دخل ہے نہ تاریخی کو، نہ لغوی کو بلکہ آپ اس وحی کے صرف مُبلّغ ہیں۔ اُسے ٹھیک اُسی طرح انسانوں تک پہنچا دیتے تھے جس طرح وہ نازل ہوتی تھی۔ قرآن کے کلام اللہ ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خدا کے منھ ہے اور زبان ہے جس سے وہ

بولتا ہے، یا یہ کہ خدا، آدمی کی صورت میں آتا تھا اور باتیں کرتا تھا جیسا کہ توراۃ میں کہا گیا ہے، بلکہ ہم مسلمانوں کے ہاں اس کا مطلب یہ ہے کہ وحی، اللہ کی طرف سے ایک خاص طریقہ کی تعلیم ہے جو انسانی تعلیم کے طریقوں سے مختلف ہے، جیسا کہ خود خدا فرماتا ہے:

اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ	رحمان، جس نے قرآن کی تعلیم دی۔

اور فرمایا:

نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ	اس قرآن کو لیکر روح الامین تیرے دل پر اُترے ہیں تاکہ تو کھلی ہوئی عربی زبان کے ذریعہ لوگوں کو ڈرائے۔

ہم مسلمانوں کے ہاں اللہ کا کلام، اُس کی ایک شان اور اُس کے علم کی طرح اُس کے کمال کی ایک صفت ہے۔ اُس کا علم یہ ہے کہ ہر قسم کی معلومات اُس پر ہمیشہ سے منکشف ہیں اور کبھی کوئی بات اور کوئی چیز بھی اُس سے مخفی نہیں ہوئی نہ ہو سکتی ہے، اور یہ کہ اُس کے کلام سے مقصود یہ ہے کہ جو معلومات جس پر چاہتا ہے، ظاہر کر دیتا ہے۔ آدمی اپنا کلام دوسرے آدمی تک اپنی زبان سے، قلم سے، اشارے سے، آلات سے پہنچاتا ہے، مگر خدا اپنا کلام، وحی کے ذریعہ پہنچاتا ہے جس کی حقیقت فرشتوں اور پیغمبروں کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

وحی کی تین قسمیں ہیں جیسا کہ بیان ہو چکا ہے (صفحہ ۴۴۶) اللہ تعالیٰ کا علم، اُس کا کلام، اور اُس کا بات کرنا، اُس کی دوسری صفتوں کی طرح، انسانی صفات سے مشابہ نہیں ہے:

لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ وَّھُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ۔	اُس کی جیسی کوئی چیز نہیں ہے۔ وہ سمیع بصیر ہے۔

دعوتِ محمدی کے اصول اور عام مقاصد

اب ہم دعوتِ محمدی میں عام انسانی اصلاح کے اُن اصول کا خلاصہ پیش کرتے ہیں جن کی تفصیل پچھلے اوراق میں بیان کر آئے ہیں۔ یہ اصول اِس بات کی سب سے زیادہ روشن دلیلیں ہیں کہ قرآن اللہ تعالیٰ کا علم ہے نہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ذاتی علم۔

۱ــــ اہلِ کتاب جن کی تاریخ بحیثیت مجموعی معلوم ہے اور وہ پیروانِ انبیاء بھی جو اہلِ کتاب سے پہلے گزر چکے ہیں، اِن سب نے دین کے تینوں بنیادی ارکان میں جو خرابی ڈال دی تھی، اُس کی قرآن نے اصلاح کر دی ہے۔

دین کے وہ ارکان حسبِ ذیل ہیں:

اللہ پر ایمان، روزِ آخرت اور جزاء و سزا پر ایمان، اور عملِ صالح جس سے نفسِ انسانی پاکیزہ ہوتا ہے۔

غور کرنا چاہیے کہ ایک اَن پڑھ آدمی کیونکر اِن ارکان کو جان سکتا ہے؟ کس طرح اُسے معلوم ہو سکتا ہے کہ پیغمبروں کے نام لیوا اُن میں کیا کیا فساد پیدا کر چکے ہیں؟ پھر اُس کی عقل میں یہ پھیلاؤ کیسے پیدا ہو سکتا ہے کہ وہ ایسی اصلاح تجویز کر دے جو معقول اور فطرتِ انسانی کے مطابق ہو؟ یہ چیز تو ایسی ہے کہ اِس سے اِن اگلی قوموں کے تمام دانشمند اور زبردست حکیم بھی عاجز ہو چکے تھے (دیکھو صفحہ ۱۶۸ــــ ۲۰۰)

۲ــــ قرآن نے حقیقتِ نبوت اور پیغمبروں کے فرائض کی نسبت انسانوں میں جو جہل پھیل گیا تھا، اُسے دور کر دیا۔ ہم اِس ضمن میں کائناتی نشانیوں اور دوسری خوارق عادت باتوں پر مفصل بحث کر چکے اور دکھا آئے ہیں کہ اِس بارے میں مادّہ پرست اور خرافاتی لوگ کس طرح گمراہی کا شکار ہو گئے ہیں (دیکھو صفحہ ۲۰۱ ــــ ۲۶۲)

۳ــــ اِس بات کا بیان کہ اسلام، فطرتِ سلیم کا، عقل و تفکر کا، علم و حکمت کا، دلیل و حجّت کا، ضمیر و وجدان کا، آزادی و خود مختاری کا دین ہے، اِن اصول کے ذریعہ نوعِ انسانی کی ترقی اور اُس کا سنّ شعور تک پہنچنا، آیاتِ قرآن کی شہادتوں سے ہم ثابت کر چکے ہیں۔ آج تک تمام انسانی فلسفے، ایسا ضابطہ قانون پیش کرنے سے عاجز ثابت ہوئے ہیں جو اپنے اندر یہ تمام اصول رکھتا ہو، اور اُن کی اُن

جملہ شروط و متعلقات پر حاوی ہو جو قرآن میں بتا دی گئی ہیں۔
(دیکھو صفحہ ۲۶۲)

۴۔۔۔۔۔اجتماعی و سیاسی اصلاح جو آٹھ وحدتوں سے وجود میں آتی ہے: قوم کی وحدت۔ نسل انسانی کی وحدت۔ دین کی وحدت۔ عدل میں پوری مساوات کے ساتھ قانون سازی کی وحدت۔ روحانی اخوت اور عبادت میں مساوات کی وحدت۔ بین الاقوامی حکمرانی کی سیاسی وحدت۔ عدالت کی وحدت۔ زبان کی وحدت۔ اِن تمام انسانی وحدتوں پر یا اُن میں سے بیشتر وحدتوں پر نہ کسی دین نے زور دیا ہے نہ کسی ضابطۂ قانون نے۔ لیکن صرف قرآن کے دین اور محمد علیہ الصلاۃ والسلام کی ہدایت نے اِن سب وحدتوں کو ضروری ٹھرایا اور اُنہیں استوار کر دیا ہے (دیکھو صفحہ ۲۹۵)

۵۔۔۔۔۔اسلام میں افراد پر جو پابندیاں عائد کی گئی ہیں، اُن کی دس خوبیاں صرف اسی دین میں پائی جاتی ہیں۔ اِن خوبیوں کا لُبِّ لُباب یہ ہے کہ روح اور جسم کے حقوق ایک ساتھ جمع کر دیے گئے ہیں۔ اور اِن پابندیوں کا مقصد یہ رکھا گیا ہے کہ دنیا و آخرت دونوں کی شادکامیاں حاصل ہو جائیں۔ یہ پابندیاں بالکل آسان ہیں۔ نہ اُن میں کوئی سختی ہے نہ تنگی۔ نہایت معقول ہیں۔ افراط و تفریط

سے دور ہیں۔ اِن میں نہ غلو ہے، نہ اسراف ہے۔ زینتیں اور طیّبات مُباح رکھی گئی ہیں۔ تمام پابندیاں معقول ہیں۔ بآسانی سمجھ لی جانے والی ہیں یہ پابندیاں دو قسم کی ہیں: لازمی و اختیاری۔ اور یہ تقسیم اِس لیے کہ سب آدمی، عقل، فہم، قوت، اور کمزوری میں یکساں نہیں ہیں۔ اِس دین میں تمام معاملات کا دار و مدار، ظواہر پر رکھا گیا ہے نہ کہ دل کی باتوں اور نیتوں پر۔ اِس کی تمام عبادتوں کی بنیاد، خود شارع علیہ السلام کی پیروی پر قائم ہے نہ کہ اپنے دل کی ایجاد پر، اور یہ اِس لیے کہ دینی پیشوائی کی گرم بازاری نہ ہو جائے (دیکھو صفحہ ۳۰۸)

۶ ۔۔۔ اسلام کی سیاسی حکمرانی کی بنیاد اِس اصل پر قائم ہے کہ جملہ اختیارات، امت کو حاصل ہیں، اور یہ کہ امت کے اولوالامر کے اجتہاد ہی پر اُس کا دار و مدار ہے، مگر اِس اجتہاد کی بنیاد بھی یہ قرار دی گئی ہے کہ مفاسد کو دور کیا جائے اور مصلحتوں کی رعایت کی جائے۔ ہمیشہ مشورے کی اصل مدنظر رکھی جائے۔ بے قید و شرط انصاف کیا جائے۔ انصاف میں پوری پوری مساوات ملحوظ رہے۔ ظلم کو دور کیا جائے۔ احکام میں نیکی ہی کو بنیاد قرار دیا جائے۔ اور معلوم ہے کہ دنیا میں آج تک کوئی سلطنت و حکومت ایسی نہیں ہوئی جو اِن باتوں میں اسلام کا مقابلہ کر سکے۔ اِس بارے میں متعدد اصول و قواعد ہیں

جنہیں ہم اوپر لکھ آئے ہیں (دیکھو صفحہ ۱۵۳)

۷ ــــ عبادت، اخلاق، شخصی، اجتماعی، اور بین الاقوامی مصالح ہر لحاظ سے مالی اصلاح کی صورتیں پیش کی ہیں۔ اگر دنیا کی حکومتیں اور قومیں، اسلام کی بتائی ہوئی اِس اصلاح کو قبول کرلیں تو لوگوں کو نہ فقر و فاقہ کی شکایت باقی رہے، نہ مالی مشکلات کی، نہ سرکش بالشویکیت کی، نہ بے لگام سرمایہ داری کی، نہ یہودی لالچ کی، نہ عیسائی زُہد کی۔ نہ ہندی تقشّف کی، نہ فرنگی زیادتی کی، نہ کسی عام مصلحت کی بربادی کی، نہ کسی ذاتی نقصان کی، بلکہ تمام انسان اِس اسلامی اصلاح کے بعد معتدل بالشویکیت سے بھی بے نیاز ہوجائیں گے، کیونکہ سچی اشتراکیت، اسلام ہی ہے (دیکھو صفحہ ۳۴۳)

۸ ــــ نظامِ جنگ کی اصلاح کر دی گئی ہے۔ اُس کی تمام خرابیاں دور کر دی گئی ہیں۔ اُسے اُسی حد تک محدود کر دیا گیا ہے جس میں انسانوں کی بھلائی ہے۔ اِس بارے میں متعدد اصول ہیں جن کی دلیلیں قرآن میں موجود ہیں اور ثابت کر رہی ہیں کہ اسلام ہی امن و امان کا دین ہے، اور یہ کہ جنگ کی ہولناکیوں اور اُن سے پیدا ہونیوالی خرابیوں کا ازالہ صرف اِسی طرح ممکن ہے کہ اسلام کے ٹھہرائے ہوئے قواعد پر عمل کر کے جنگ کو صرف مدافعت کے لیے خاص کر دیا جائے۔

خونریزی پر امن کو، لڑائی پر مصالحت کو ترجیح دی جائے۔ معاہدوں میں حق و انصاف کو پیش نظر رکھا جائے۔ اُنہیں غل و غش سے پاک رکھا جائے تاکہ طاقتور اُنہیں کمزوروں پر دست درازی کا ذریعہ نہ بنا سکیں۔ ایک حکومت دوسری حکومت کو اُن کی بنا پر دبا نہ سکے۔ اِس سلسلہ میں ہم نے نصوص و شواہد کے ساتھ کئی تاعلے لکھ دیے ہیں (دیکھو صفحہ ۳۷۳)

۹۔ عورتوں کو تمام انسانی، دینی، شہری حقوق دیے گئے ہیں، زوجیت کے بھی، مالداری وغیرہ کے بھی، اور اُن کی عزت و احترام کو ضروری ٹھہرایا گیا ہے۔ یہ چیز نہ کسی دین میں موجود ہے نہ قانون میں (دیکھو صفحہ ۲۹۶)

۱۰۔ غلامی کو روکا گیا ہے۔ غلاموں کی آزادی پر زور دیا گیا ہے۔ اُن پر ظلم کرنے اور اُنہیں بے آبرو و ذلیل کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ ایسی تدبیریں کی گئی ہیں کہ غلامی میں ترقی نہ ہو سکے۔ غلاموں پر احسان کرنا واجب قرار دیا گیا ہے یہاں تک کہ کوئی غلام باقی نہ رہے اور غلامی کا بالکل خاتمہ ہو جائے (دیکھو صفحہ ۴۱۲)

ساری دنیا کو چیلنج

یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کے عقائد ہیں۔ اُن کی شریعت

کے اصول ہیں۔ اُن کی اجتماعی، مالی، سیاسی اصلاح کی بنیادیں ہیں، جنہیں ہم نے اجمال کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔ قرآنی شہادتوں کو اُن کے ساتھ درج کر دیا ہے، نہ خطابی مبالغوں سے تحریر کو زور دار بنایا ہے، نہ شاعرانہ جذبات سے کام لینے کی کوشش کی ہے۔ بلکہ یہ بالکل سیدھی سادی تحریر ہے۔

ہم مسلمان، تمام قوموں کے فلسفیوں، مؤرخوں، خصوصاً آزاد خیال فرنگی علماء، کو چیلنج دیتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ لائے ہیں، ویسی یا اُس کے لگ بھگ ہی کوئی چیز پیش کر دکھائیں۔ بڑے سے بڑے پیغمبروں، بڑے سے بڑے حکیموں، بڑے سے بڑے اخلاقیوں، بڑے سے بڑے سیاسیوں کی تعلیمات میں سے کوئی ایسی چیز نکال کر دکھائیں، حالانکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم، اُمّی تھے۔ اُمیّوں میں بڑھے پلے تھے، اور یہ سب کچھ چالیس برس کی عمر کو پہنچ جانے کے بعد لائے تھے۔ ہم یہ بھی بیان کر چکے ہیں کہ بنی اسرائیل کے سب سے زیادہ عظیم الشان پیغمبروں موسیٰ و عیسیٰ اور آپ کے مابین کتنا بڑا فرق ہے۔ صَلَوَاتُ اللهِ وَ سَلَامُهُ عَلَيْهِ وَعَلَيْهِمْ اَجْمَعِيْنَ۔

عملی تنقید

انسانی افراد، جماعتوں، اور قوموں کی اصلاح کے طریقوں کا علم

بہت ہی وسیع ہے۔ ذہین آدمیوں میں بھی خال خال لوگ ہی اِس فن کے ماہر ہو سکتے ہیں، اور ان سے بھی کم وہ لوگ ہیں جو قوم کے سردار حکمراں بن جانے کے بعد اپنے علم کو عملاً نافذ کر سکتے ہیں۔ یہ صورت حال معلوم ومشہور ہے، لیکن اُس آدمی کے بارے میں تم کیا کہوگے جو اصلاح کے اِس حد درجہ ہمہ گیر علم، بلکہ اعلیٰ علوم کو بناتا ہے۔ پھر خود ہی اُنہیں عمل میں لاتا ہے، پھر اُن کے ذریعہ ایک بہت بڑی قوم کو سنوار دیتا ہے، اور اِس نہایت مشکل مُہم میں خود اپنی زندگی ہی میں کامیابی بھی حاصل کرلیتا ہے؟ یقیناً یہ بات کسی آدمی کی بھی قدرت میں نہیں ہے۔ پچھلے زمانوں میں اِس کی کوئی مثال موجود نہیں ہے، نہ آیندہ موجود ہونے کی امید ہے۔ اِس محمدی اصلاح کے تمام اصول وفروع آج تک محفوظ ہیں، گو اکثر انسان بگڑ چکے ہیں!

محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تعلیمات، ہجرت کے بعد، جو آزادی کا زمانہ تھا، صرف دس برس کے اندر نافذ کر دی تھیں۔ اِس سے پہلے آپ دس برس تک اجمالی طور پر اِنہی اصول کی دعوت پہلے چھپے چھپے پھر علانیہ دیتے رہے۔ اِس زمانہ میں آپ کو ہر قسم کی تکلیفیں اور پریشانیاں برداشت کرنا پڑیں، حتیٰ کہ قتل کی دھمکیاں بھی دی جاتی تھیں۔ اِنہی مصیبتوں کی وجہ سے مومنوں کو بار بار ہجرت کرنا

پڑی، یہاں تک کہ آپ کی ہجرت کے ساتھ عام ہجرت شروع ہو گئی۔
آپ پر اور تمام مومنوں پر مشرکوں، عیسائیوں اور یہودیوں نے اعلان جنگ کر رکھا تھا۔ مدینہ پہنچ کر آپ نے اہل کتاب کے ساتھ معاہدہ کیا کہ اُن کی جان، مال، دین، کسی چیز کو بھی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا، بشرطیکہ وہ مسلمانوں کے مقابلہ میں بُت پرستوں کی مدد نہ کریں، مگر اُنھوں نے معاہدہ توڑ ڈالا۔ مسلمان چھ برس تک ہر جنگ میں اپنی مدافعت کرتے رہے۔ وہ کمزور تھے، بے بس تھے، مگر خدا اُن کا پشت پناہ تھا۔ اُن کے دشمن زبردست تھے، مگر خدا کی نصرت اُن سے دور ہو چکی تھی۔ ۶ھ کے آخر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مُشرکوں سے حُدیبیہ کا معاہدہ کیا کہ دس سال تک آپس میں لڑائی نہ ہو، مگر ان لوگوں نے بھی عہد شکنی کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پھر حالت جنگ پیدا ہو گئی اور مسلمانوں نے قریش کا دینی و دنیاوی پایۂ تخت اور پورے عرب کا مرکز، مکہ ۸ھ میں فتح کر لیا۔ ۱۰ھ کے آخر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع ادا کیا، اور اسی موقع پر یہ آیت نازل ہوئی:

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ	آج میں نے تمھارے لیے تمھارا دین کامل کر دیا ہے۔ تم پر اپنی نعمت پوری کر دی

لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا۔ | ہے، اور تمھارے لیے اسلام کا دین ہی پسند کر لیا ہے۔

غرضکہ صرف دس سال کی مدت میں عرب قوم کی وحدت مکمّل ہوگئی، حالانکہ دنیا میں کوئی قوم، عربوں سے زیادہ باہمی نااتفاقی اور پھوٹ میں گرفتار نہ تھی۔ یہ حیرت ناک کارنامہ، کتاب الٰہی کی تاثیر اور خداوند تعالیٰ کی تائید سے پیش آیا، جیسا کہ اُس نے اپنے رسول سے خود فرمایا ہے:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ۔

اے پیغمبر! آپ اللہ کی مہربانی سے اِن لوگوں کے لیے نرم ہوگئے ہیں۔ اگر آپ سخت مزاج اور سخت دل ہوتے تو یہ لوگ آپ کے گرد سے منتشر ہوجاتے۔ سو آپ انہیں معاف کیجئے، اِن کے لیے بخشش چاہیے، اِن سے مشورہ لیا کیجئے، لیکن جب آپ عزم کرلیں تو اللہ پر بھروسہ کیا کیجئے۔ اللہ بھروسہ کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

اور یہ اس لیے کہ عرب، فرمانبرداری کرنا اور کسی کے آگے جھکنا گوارا نہ کرتے تھے، کیونکہ ہمیشہ آزاد رہتے تھے۔ نہایت ہی سخت جنگجو تھے۔ جابر و قاہر بادشاہوں اور سرکش دینی پیشواؤں کے ظلم و

استبداد کا کبھی شکار نہیں رہنے تھے۔ معلوم ہے کہ ہی پادشاہ اور پیشوا، قوموں کو ذلیل کرتے اور ہر زبردست کے سامنے جھکنے کا خوگر بنا دیتے ہیں۔

اب آئیں علماء تاریخ اور ہمیں بتائیں کہ وہ کون پیغمبر، حکیم، فاتح، یا قانون ساز یا دشاہ ایسا ہوا ہے جس نے کسی قوم کی تربیت دس برس یا اس سے زیادہ مدت میں مکمّل کر دی ہو، اور اُسے اس قابل بنا دیا ہو کہ ممالک فتح کرے۔ متمدن قوموں پر حکمرانی کرنے لگے۔ انصاف و رحم کو اپنا شعار بنائے۔ اور اپنا ایسا اچھا نمونہ پیش کرے کہ ماتحت قومیں اُس کے دین بلکہ زبان تک کو اختیار کرلیں؟ ہاں یہ ہمارا مطالبہ ہے اور ہم یہ شرط بھی نہیں لگاتے کہ وہ قوم جسے کسی آدمی نے بنایا، سکھایا، اور مہذب کیا ہو، اُسی ناقابل بیان ابتری میں پڑی ہو جس میں عرب قوم پڑی تھی!

علوم و فنون، فلسفہ و قوانین، اور اجتماعی و جنگی نظاموں کے اس زمانہ میں بھی جرمن اور اٹالین وحدتیں، عربی محمدی وحدت کا مقابلہ نہیں کر سکتیں جو اُمیّت و جاہلیت کے زمانہ میں مکمل ہو چکی تھی! بلکہ کہاں وہ اسرائیلی وحدت جو معجزوں اور خارق عادت عجائبات کے زمانہ میں بنی اور کہاں خاص عربی وحدت اور عام اسلامی وحدت

جو قرآنی آیتوں اور الٰہی علوم کے زیر سایہ قائم ہوئی؟

پھر اِس اعلیٰ تشریع اور بے نظیر ہدایت کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خلفاء راشدین اور بہت سے صالح مسلمان پادشاہوں نے اِس طرح نافذ کیا کہ تاریخ گواہی دے رہی ہے اور منصف مزاج مؤرّخ اعتراف کر رہے ہیں کہ اُنھوں نے انصاف کے ساتھ ہمیشہ رحم برتا۔ انسانی تہذیب کی تجدید کر دی۔ اُسے ترقی دی۔ مردہ علوم و فنون زندہ کیے۔ اُنہیں سنوارا۔ بار آور کیا۔ اور تمام دنیا کے استاد بن گیے۔

پھر حق اور نیکی میں اِس دین کی قوت کو دیکھ کر یورپ کی تمام متمدن اور وحشی قوموں نے اپنی جملہ صلیبی قوتوں سے اِس کے ساتھ جنگ کی، اپنے علوم و فنون اور حیرت انگیز نظامات سے اُس کی بیخ کنی کرنی چاہی، آج تک یہ تمام قومیں اپنی جنگ جاری کیے ہوئے ہیں۔ بے شمار دولت اِس غرض سے خرچ کر رہی ہیں کہ کسی طرح اِس دین کے پیرودں کو اُس سے برگشتہ کر دیں، حالانکہ اب اِس دین کی سلطنتیں مٹ چکی ہیں، اُس کی حلقہ بگوش قوموں پر جہل غالب آچکا ہے۔ اِن تمام کمزوریوں کے ساتھ دشمن کے حملے پوری قوت سے جاری ہیں، بہت ہی عالمگیر اور زبردست

پروپیگنڈا، مشنری پادریوں کے ذریعہ پھیلا ہوا ہے مسیحی سلطنتیں اور دینی انجمنیں، ظلم و سرکشی، اور جھوٹ کی اس طرح گرم بازاری کیے ہوئے ہیں کہ بدترین مجرم بھی شرما جائیں، مگر اس سب کے باوجود یہ دشمن آج تک نہ اس دین کی کوئی بنیاد گرا سکے نہ کسی ایک مسلمان کو بھی عیسائی بنا سکے ہیں:

يُرِيدُونَ أَنْ يُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَيَأْبَى اللَّهُ إِلَّا أَنْ يُتِمَّ نُورَهُ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ ۔ هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ (۹ : ۳۲و۳۳)

(ترجمہ) دشمن چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے منھ کی پھونکوں سے بجھا دیں، مگر اللہ کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ اپنے نور کو پورا کر کے رہے گا اگرچہ کافر پسند نہ کریں۔ وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اُسے سب دینوں پر غالب کر دے، گرچہ مشرکوں کو کتنا ہی ناپسند ہو!

یورپ، امریکا اور جاپان کو دعوت اسلام

اگر اس زمانہ کے یورپین اور غیر یورپین حکماء، علماء حیاۃ، ماہرین اجتماع و اخلاق، اور مؤرخین ہمارے سامنے محمدؐ جیسا کوئی آدمی پیش نہیں کر سکتے، وہ محمدؐ جن کی تاریخ معلوم و مشہور ہے، وہ محمدؐ جو اس قرآن جیسی عظیم الشان کتاب لائے جس کی تعلیمات کے بنیادی اصول کا خلاصہ ہم پیش کر چکے ہیں، وہ محمدؐ جو اپنی لائی ہوئی یہ تعلیمات نافذ بھی کر سکے، اور عرب جیسی عظیم الشان قوم پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے جس کا ساری دنیا پر گہرا دینی و تمدنی اثر معلوم و مشہور ہے۔ ہاں اگر یورپین اور غیر یورپین حکماء، وعلماء، محمدؐ جیسا کوئی آدمی پیش نہیں کر سکتے ——— اور

معلوم ہے کہ ہرگز پیش نہیں کر سکتے ——— تو کیا اُن کی یہ بے بسی اِس بات کی دلیل نہیں ہے کہ محمدؐ کا دین محمدؐ کی کتاب، محمدؐ کی روش، عرب قوم کو محمدؐ کی تربیت، خارق عادت معجزوں میں سے ہے؟

اگر یہ سچ ہے ——— اور بغیر کسی شک وشبہ کے یہ سچ ہے ——— تو کیا وجہ ہے کہ محمدؐ کی بتائی ہوئی اِن تعلیمات کو علیم وحکیم خدا کی طرف سے وحی نہ مان لیا جائے؟

وحی کا مطلب اِس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ ایک علم ہے جسے اللہ تعالیٰ نے محمدؐ کی روح وقلب پر ایک ایسے مخفی طریقہ سے طاری کر دیا تھا جو تحصیل علم کے مشہور کسبی طریقوں سے مختلف اور اُن الہاموں سے بھی جدا ہے جو بعض خواص پر نازل ہو جایا کرتے ہیں۔

اِس علم کے معجزہ ہونے کے معنیٰ یہ ہیں کہ وہ ایسے طریقہ پر محمدؐ کو حاصل ہوا تھا جو انسانوں کے کسبی علوم سے مختلف، نفسیات، اجتماعیات، عقلی فلسفہ، تاریخِ اقوام، حکماء، علماء، اور بادشاہوں کے مقرّر دستوروں اور قانونوں سے الگ، بلکہ خود پیغمبروں کے معاملہ سے بھی مختلف تھا، گو اُنہی کے علم کی قسم سے تھا۔ پیغمبروں نے اپنے زمانہ کی بعض غیبیات اور بعض آیندہ باتوں کی پیشین گوئی کی تھی، لیکن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئیاں تمام پیغمبروں کی پیشین گوئیوں سے زیادہ صاف، ظاہر، اور تعداد میں زیادہ ہیں۔ آپ نے اپنے زمانہ سے صدیوں برس پہلے کی غیبیات کی بھی خبر دی۔ پھر آپ نے جس علم، حکمت، قانون کو پیش کیا ویسی چیز کوئی پیغمبر بھی پیش نہ کرسکا۔

اے روشن خیال علماء، ہم اُن تمام شکوک و شبہات و توجیہات کی قلعی کھول چکے ہیں جس کی بنا پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے منکر آپ کے لائے ہوئے اعلیٰ علم الٰہی کو، بلند ترین شہری قوانین کو، برتر اخلاقی حکمتوں کو خود آپ کی ذاتی معلومات و استعداد کا نتیجہ بتاتے ہیں، حالانکہ لطف یہ ہے کہ ان علوم و معارف کو جہل یا تجاہُل کی راہ سے وہ معمولی بھی بتاتے ہیں۔

اے روشن خیال علماء، تمھیں یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ منکروں نے جو کچھ کہا ہے، اُس میں سے بعض خود تاریخ پر تہمت ہے، اور اُن کی گفتگو کا جتنا حصہ صحیح ہے، اُس سے بھی ثابت نہیں ہوتا کہ اُن کا دعویٰ بجا ہے۔ نیز تم یہ بھی جان چکے ہو کہ مجموعی طور پر اُن کا دعویٰ، علم، فلسفہ،

انسانی طبیعت، اصولِ اجتماع، اور واقعاتِ تاریخ کے سراسر خلاف ہے۔

ہم تمھیں چیلنج کرتے ہیں کہ پچھلے صفحوں میں ہم نے اللہ تعالیٰ کی وحی، محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونیوالی کتاب اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی قطعی طور پر ثابت تاریخ کے بارے میں جو کچھ تمھارے سامنے پیش کیا ہے، اُس کی کوئی ایسی دوسری عِلّت پیش کر دکھاؤ جسے عقل کی ترازو یعنی منطق قبول کرے۔

لیکن اگر تم ہمارے سامنے اِس سب کی کوئی ایسی عِلّت پیش نہ کر سکو جسے عقل قبول کرے اور نقل بھی جس کی تائید کرے، تو ایسی صورت میں تم پر فرض ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت پر، اور اُس کتاب

پر ایمان لے آؤ جو اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر انسانی اصلاح کے لیے نازل فرمائی ہے۔ اور تم پر فرض ہے کہ ایمان کی اِس دعوت کی حمایت کرو، اور اِس کے ذریعہ انسانوں کی موجودہ اجتماعی زندگی کی اصلاح کرو، خصوصًا ایسی حالت میں کہ تمہارا وسیع علم، تمہارا دقیق فلسفہ اِس اصلاح سے قطعًا بے بس ثابت ہو چکا ہے۔ اِباحیّت و شہوت پرستی اور قوموں کی ذہنی طوائف الملوکی کو روک نہیں سکا ہے۔

تمہارا علم و فلسفہ تو اِتنا بھی نہ کر سکا کہ مہذّب سلطنتوں کو سرکش جنگوں اور ہولناک بربادیوں کی طیاریوں اور اِس طرح تمام قوموں میں عداوت کی تخم ریزی کرنے سے روک دیتا۔ یہ سلطنتیں مہذّب کہی جاتی ہیں مگر اُن کی نظر میں موجودہ وسیع علوم کا جو کچھ مصرف ہے، وہ انسانوں پر سب سے

بڑی مصیبت ہے۔

اے روشن خیال علماء، یہ سب جاننے کے بعد بھی اگر تم وحی محمدیؐ کی دعوت سے انکار کرو اور روگردانی کر جاؤ گے تو یقین کر دتم پر تمہاری قوموں، حکومتوں، اور تمام آدمیوں کا گناہ پڑے گا!

انسانی علوم کی بے بسی

اے روشن خیال علماء، احساس و مشاہدے سے قطعی طور پر ثابت ہو چکا ہے کہ محض انسانی علم، انسانوں کے نفس کی اصلاح نہیں کر سکتا، کیونکہ انسان اپنی انفرادی اور قومی خواہشوں اور منفعتوں کو صرف اِس بنا پر چھوڑ نہیں سکتے کہ اُنہی میں سے چند آدمیوں کے بنائے ہوئے اصول کے خلاف برتی ہیں۔ انسان اگر جھکتا ہے تو صرف فطری

مُقَنِّن (خدا) ہی کے آگے جھکتا ہے۔ اُسی علم کی عظمت کا سِکّہ اُس کے دل پر بیٹھتا ہے جو اُس کے اپنے علوم و معلومات سے مافوق ہوتا ہے، یعنی وہ علم جو پروردگار عالم کے پاس آتا ہے۔ اور معلوم ہے کہ روئے زمین پر اسلام کے سوا کوئی عالمگیر، صحیح اور ثابت دین موجود نہیں ہے۔

اے روشن خیال علماء، ہم تمھیں بتا چکے ہیں کہ اسلام کے روحانی، سیاسی، اجتماعی قوانین کی بنیادیں کیا ہیں، اور یہ کہ اسلام کس طرح ہر جگہ اور ہر زمانہ کے لیے مناسب ہے، اور یہ کہ اسلام ہی امن، حق، انصاف، مساوات کا دین ہے، ہر قوم اور ہر فرد کو اُس کا حق دیتا ہے۔ اسلام ہی کی مساوات وہ مساوات ہے جس سے تمام مالی، سیاسی، جنگی، اجتماعی بیماریوں کو دور کیا جا سکتا ہے۔ یہودیت، ایک عارضی دین ہے اور کچھ

لوگوں کے لیے خاص ہے۔ مسیحیت، یہودیت کی روحانی اصلاح ہے اور اُس میں کوئی قانون نہیں ہے۔

لیکن اسلام؟

تو اسلام یہ ہے کہ:

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ، وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتَابَ اِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَھُمُ الْعِلْمُ بَغْیًا بَیْنَھُمْ، وَمَنْ یَّکْفُرْ بِاٰیَاتِ اللّٰہِ فَاِنَّ اللّٰہَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ	اللہ کے نزدیک دین، اسلام ہی ہے۔ اہل کتاب میں اُسی وقت سے اختلاف پڑا جب اُن میں علم سرکشی بن کر آیا۔ اللہ کی آیتوں سے جو انکار کرے تو اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔

اگر کوئی منظّم اور طاقتور قوم اس دینِ اسلام کی ہدایت قبول کرلے، تو ایک طرف اس کے ذریعہ تمام قوموں کو ہدایت حاصل ہو جائے گی اور دوسری طرف خود اس قوم کو تمام روئے

زمین پر برتری و سرداری مل جائے گی!

آزاد خیال علماء سے امید

اے روشن خیال علماء، تم میں سے بعض نے تجویز پیش کی تھی کہ تمام قوموں کے بڑے بڑے علماء کی ایک کانفرنس منعقد ہو اور اُن وسائل پر غور کرے جو موجودہ تہذیب کو بربادی سے بچا سکتے ہیں لیکن اگر یہ کانفرنس منعقد ہوتی تو اُن کانفرنسوں سے زیادہ نتیجہ خیز ثابت نہ ہوتی جنہیں موجودہ سلطنتیں "مجلسِ اقوام" میں یا اپنی راج دھانیوں میں منعقد کیا کرتی ہیں، اور جن سے دنیا کو صرف یہ فائدہ پہنچا ہے کہ بیماریاں اور زیادہ سخت و پیچیدہ بن گئی ہیں۔ خطروں میں کہیں زیادہ اضافہ ہوگیا ہے، حالانکہ قوموں کی آنکھوں کے سامنے وہ دوا موجود ہے جو تمام بیماریوں کے لیے اکسیر ہے، مگر قومیں اُسے نہیں دیکھتیں۔ اس دوا کی روشن حجت اُنہیں بلند

آہنگی سے اپنی طرف پکار رہی ہے، مگر وہ اس پکار کو نہیں سنتیں

"ولو علم اللہ فیہم خیراً لاسمعہم، ولو اسمعہم لتولوا وہم معرضون!"

لیکن اے روشن خیال علماء، تم سے امید کی جا سکتی ہے کہ سنو گے اور دیکھو گے۔ سمجھو گے اور عمل کرو گے۔

اچھا سنو، اصلاحِ انسانی کی ضامن، قرآنی دعوت کی حقیقت اگر اب تک تمھیں ایسے طریقہ پر نہیں پہنچی ہے جس سے بحث و نظر کو تحریک ہوتی ہے، اور یہ اس لیے کہ اب تک تم نے اخلاص و غیر جانبداری سے اُس کی جستجو نہیں کی ہے، یا اس لیے کہ اس وقت اسلام کو پھیلانے والی نہ کوئی تنظیم موجود ہے، نہ کوئی ایسی سلطنت ہی باقی ہے جو اُس کے احکام قائم اور اُس کی تہذیب جاری کرے، بلکہ مجموعی طور پر اس وقت کے مسلمان خود ہی اسلام کے خلاف حجت، اور اُس کے نور کے سامنے پردہ بنے ہوئے ہیں۔

اگر بات یہی ہے تو میں امید کرتا ہوں کہ یہ بحث جو اس کتاب میں جمع کی گئی ہے، موجودہ زمانہ کے حالات کے مطابق تمھارے پاس قرآنی دعوت کو پہنچانے میں کافی ثابت ہوگی۔ اسے دیکھنے کے بعد اگر تم پر حق روشن ہو جائے تو تمام انسانیت کی بھلائی کیلئے میری یہی آرزو ہے، لیکن اگر اس میں تمھیں کوئی شبہہ معلوم ہو، تو تمھاری محبتِ علم، اور حق پسندی سے امید کرتا ہوں کہ مجھے اپنے شبہہ سے آگاہ کروگے تاکہ میں اُسے دور کرنے کی کوشش کروں، کیونکہ تم جانتے ہو کہ حقیقت، بحث و گفتگو ہی سے ظاہر ہوا کرتی ہے۔

اے روشن خیال علماء، میں نہیں خیال کرتا کہ اس کتاب میں اسلام کے اصول دیکھ چکنے کے بعد تم صرف اس وجہ سے شک و شبہہ میں پڑجاؤ گے کہ اسلام میں غیب کی خبریں اور ماورائے حواس کی باتیں بھی موجود ہیں۔ تمھارا یہ شبہہ بجا نہیں ہے کیونکہ اس

لی تمہارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔ پھر یہ بھی یاد رہے کہ دین کا سرچشمہ عالمِ غیب ہی ہے۔ اگر اس چیز کو انسان اپنی معلومات سے جان سکتا تو ضرورت ہی نہ پڑتی کہ وحی کے ذریعہ اُسے معلوم کرے۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ قرآن کی تعلیمات نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ عالمِ غیب ہی کی وحی ہے، اور یہ بھی دلیل سے ثابت ہو چکا ہے کہ اللہ موجود ہے، علم و حکمت رکھتا ہے۔ لہذا لازمی ہے کہ اُس کی دی ہوئی خبریں بھی تسلیم کر لی جائیں۔ تمہارے لیے یہ جان لینا کافی ہے کہ قرآن میں کوئی ایک بات بھی ایسی نہیں ہے جو عقل کی رُو سے محال ہو۔ قرآن میں بکثرت ایسی باتیں موجود ہیں جنہیں پہلے سمجھا جاتا تھا کہ ماوراءِ عقل کی باتیں ہیں، مگر بعد میں علم کی ترقیوں نے اُنہیں بالفعل موجود کر دیا ہے، مثلاً قرآن کا یہ کہنا کہ جنتی اور دوزخی آپس میں باتیں کریں گے، حالانکہ اُن کے مابین بہت دوری ہوگی۔ یہ بات اس زمانہ میں ریڈیو کو دیکھ لینے کے بعد

ہر آدمی بآسانی سمجھ سکتا ہے۔

قرآن نے مادّی عالم غیب کی تکوین و تاریخ سے متعلق جو خبریں دی ہیں، اُن میں اُس کا یہ ایجابی معجزہ دیکھو کہ ایسے عجیب لفظوں میں اُس نے یہ خبریں دی ہیں کہ موجودہ زمانہ کے علم و تاریخ کی روشنی میں اُن کے معانی ظاہر ہو گیے ہیں، حالانکہ اُس زمانہ کے لوگوں کو اُن کا وہم بھی نہیں ہوا تھا جب قرآن نازل ہوا تھا۔

اور قرآن کا یہ سلبی معجزہ دیکھو کہ صدیاں گزر گئیں مگر آج تک کسی یقینی دلیل سے اُس کی بتائی ہوئی کسی قطعی خبر کی تردید و تکذیب نہیں ہو سکی ہے، حالانکہ اُس کی لائی ہوئی خبریں، تاریخ کا بیان نہیں بلکہ صرف وعظ و نصیحت، عبرت و تہذیب کے لیے ہیں، اور ایسی خبروں میں اِس قدر کافی ہوتا ہے کہ لوگوں کی معلومات

و مالوفات کے مطابق ہوں۔

اِن خبروں پر یہ اعتراض نہیں ہو سکتا کہ فنی حقائق اور تاریخی واقعات کی تشریح ان میں کیوں نہیں کی گئی؟ تشریح اس لیے نہیں کی گئی کہ پیغمبر ان چیزوں کی شرح و بیان کے لیے نہیں آتے، پھر اِن حقائق و واقعات میں کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں وسیع علم اور آلات کی مدد کے بغیر معلوم نہیں کیا جاسکتا اور یہ آلات، وحی کے مخاطبین اوّلین کے زمانہ میں موجود نہ تھے۔ ظاہر ہے پیغمبروں کے لیے ایسی باتیں بیان کرنا ہرگز مناسب نہیں جنہیں سننے والے اپنی علمی بے بضاعتی کی وجہ سے ناممکن سمجھیں اور انکار کر جائیں، اسی لیے تمام انسانیت کے پیغمبر و رہبر (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرما دیا ہے "انتم اعلم بامور دنیاکم" ـــــ مسلم (تم لوگ اپنے دنیادی معاملات زیادہ جانتے ہو)

اے روشن خیال علماء، قرآن کی لائی ہوئی تکوینی خبروں میں اس دقیق تعبیر کو دیکھو کہ اُس نے کائنات کے مادّے کو دُخَان (دھواں) کہا ہے جو آج کل کی اصطلاح میں بعینہ ایتھر (اسدیم) ہے۔

اور فرمایا کہ آسمان وزمین دونوں "رَتْقًا" تھے، یعنی ایک ہی مادّہ تھے جو باہم پیوستہ ومتصل تھا۔ پھر خدا نے اُنہیں الگ الگ کر کے ہر ایک کو جدا جدا صورت دے دی اور اُن میں جاندار پھیلا دیے۔ اور فرمایا کہ خدا نے ہر زندہ چیز کو پانی سے بنایا ہے۔ اور یہ کہ اُس نے تمام نباتات وحیوانات کو جوڑا جوڑا پیدا کیا ہے اور ہر ایک میں نر اور مادہ بنائے ہیں۔ اور یہ کہ اُس نے ہر نبات کو "موزون" بنایا ہے، یعنی اُس کے عناصر مقرر نسبتوں کی بنا پر موزوں کر دیے ہیں۔ اور یہ کہ وہ جوڑا لگانے والی ہوائیں

چلاتا ہے۔ اور یہ کہ وہ "یُکَوِّرُ اللَّیْلَ عَلَی النَّھَارِ وَیُکَوِّرُ النَّھَارَ عَلَی اللَّیْلِ" (خدا رات کو دن پر لپیٹتا اور دن کو رات پر لپیٹتا ہے) تکویر کے معنی یہ ہیں کہ گول جسم پر کسی چیز کو لپیٹنا۔ اس قسم کی مثالیں قرآن میں بہت ہیں۔

اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ قرآن نے بتایا ہے کہ کائنات، ایسی سنتوں اور قانونوں پر قائم ہے جو بدلتے نہیں۔ اسی قدر نہیں بلکہ اُس نے اِن سنتوں میں سے نیز اجتماعی زندگی کے اٹل قانونوں میں سے بہت سے قانون بیان بھی کر دیے ہیں، جنہیں نزولِ وحی کے صدیوں بعد اب انسانوں نے علمی تحقیق سے معلوم کیا ہے۔ میں نے اِن قوانین کا ذکر اس کتاب میں اِس لیے نہیں کیا کہ ممکن ہے کہا جائے یہ چیز تو عقل سے بھی معلوم کی جا سکتی ہے اور وحی کی اِس کے لیے ضرورت نہیں ہے۔

قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ثُمَّ كَفَرْتُمْ بِهٖ، مَنْ أَضَلُّ مِمَّنْ هُوَ فِي شِقَاقٍ بَعِيدٍ۔ سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ ۗ أَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ أَنَّهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ۔ أَلَا إِنَّهُمْ فِي مِرْيَةٍ مِنْ لِقَاءِ رَبِّهِمْ ۗ أَلَا إِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُحِيطٌ (۴۱-۵۳)

اے پیغمبر، کہہ دیجئے کہ بھلا یہ تو بتاؤ کہ اگر یہ قرآن، اللہ کے پاس سے آیا ہوا ہو اور تم اُس سے انکار کرو، تو اُس شخص سے زیادہ کون گم کردہ راہ ہوگا جو حق سے اتنی لمبی مخالفت میں مبتلا ہے۔ عنقریب ہم اپنی نشانیاں اُنہیں گردونواح میں دکھائیں گے اور اُن کی ذاتوں میں بھی، یہاں تک کہ اُن پر ظاہر ہو جائے کہ قرآن ہی حق ہے۔ کیا آپ کے پروردگار کی یہ بات اس حقیقت کی شہادت کے لیے کافی نہیں کہ وہ ہر چیز کا شاہد ہے۔ یہ لوگ تو اپنے پروردگار کے روبرو جانے کی طرف سے شک میں پڑے ہیں۔ یاد رکھو، خدا ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے!

۴۔ محرم الحرام ۱۳۵۳ھ کو اللہ کے فضل و توفیق سے ترجمہ ختم ہوا۔

مطبوعہ جدید پریس نمبر ۲۰ ۔ اسے جزکل ابو جو کلکتہ

مسلمان بچوں کے واسطے مذہبی اخلاقی اور تاریخی کتابوں کا بہترین

اور آسان سلسلہ

اگر آپ اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت مذہبی طریقہ پر چاہتے ہیں۔ اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ آپکے بچے ابتدائی تعلیم کے ساتھ ضروری مذہبی اخلاقی اور تاریخی واقفیت بھی حاصل کرتے جائیں اگر آپ بچپن ہی سے اپنے بچوں کے دلوں میں اسلام کی سچی محبت پیدا کرانا چاہتے ہیں تو مندرجہ ذیل کتابیں پڑھائیے

۱	اسلام کا قاعدہ موسومہ غنچہ محمدؐیہ	۱/	۱	پھولوں کا ہار	۴/
۲	اسلام کی پہلی کتاب موسومہ گلدستہ محمدیہ	۲/	۲	دین و دنیا کی باتیں	۶/
۳	اسلام کی دوسری کتاب موسومہ گلزار محمدؐیہ	۳/	۳	اسلام کا چاند	۶/
۴	اسلام کی تیسری کتاب موسومہ گلستان محمدؐیہ	۵/	۴	پھولوں کی ڈالی	۶/
۵	اسلام کی چوتھی کتاب موسومہ بوستان محمدؐیہ	۸/	۵	خطوط	۴/

ریاض محمدؐیہ حضور رسول مقبول صلعم کی بڑی سوانح عمری عہ

بوستان اخیار۔ یا تذکرہ مشاہیر اکبرآباد۔ آگرہ کے مشائخین عظام اور علمائے کرام اور دیگر ۳۸ مشاہیر بزرگان باکمال کا تذکرہ عہ

رہنمائے فتحپور سیکری۔ فتحپور سیکری کی تمام شاہی عمارتوں آثارات قدیمہ کا مفصل حال عہ ۸

مرقع اکبرآباد۔ یعنی تاریخ آگرہ جس میں شہر آگرہ اور ضلع آگرہ کی مفصل تاریخ اور جملہ عمارات شاہی و دیگر آثار قدیمہ وغیرہ کا بیان ہے۔ عہ